بعونِ صناعِ مکین و مکان و بفضلِ خلاقِ زمین و زمان

۸۳

کُلّیاتِ مُصحفی

(دیوانِ اوّل)

مرتبہ
ڈاکٹر نور الحسن نقوی

ناشر
مجلسِ ترقیٔ ادب ۲- نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

طبع اول : جون ۱۹٦۸ع

تعداد : ۲۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ، ستارۂ امتیاز
ناظم مجلس ترقیِ ادب ، لاہور

طابع : سید اظہارالحسن رضوی

مطبع : مطبعِ عالیہ ۱۲۰/۵ ٹمپل روڈ ، لاہور

قیمت : [redacted]

فہرست

غزلیات

ردیف الف

غزل نمبر مصرع اول صفحہ

غزل نمبر | مصرع اول | صفحہ

غزل نمبر	مصرع اول	صفحہ
۱۳۲	جس کشتے کا زخموں سے ہو خود چور بدن سارا	۱۱۱
۱۳۳	آپھی دمِ شمشیر ہے یاں ہم پہ دم اپنا	۱۱۲
۱۳۴	شمع پر پروانہ شب جس وقت جل کر رہ گیا	۱۱۳
۱۳۵	ہائے وہ زخمی کہ سنبھلا اور سنبھل کر رہ گیا	۱۱۳
۱۳۶	قدم اس دھج سے کچھ پڑتا ہے اس غارت گرِ جاں کا	۱۱۴
۱۳۷	خدا جانے یہ دل کشتہ ہے کس اندازِ داماں کا	۱۱۵
۱۳۸	ان آہوں سے حجاب اس آسماں کا اٹھ نہیں سکتا	۱۱۷
۱۳۹	یہ خیال اک دن اسی صورت فزوں ہو جائے گا	۱۱۸
۱۴۰	ساقی شراب لایا ، مطرب رباب لایا	۱۱۹
۱۴۱	جی رات لبوں پر آ رہا تھا	۱۲۰
۱۴۲	آساں نہیں ہے تنہا در اس کا باز کرنا	۱۲۱
۱۴۳	یہ چہرۂ بل دار نہ دیکھا تھا سو دیکھا	۱۲۲
۱۴۴	قاصد کبھی ہمارا دل دار تک نہ پہنچا	۱۲۳
۱۴۵	کریں گے خوابِ راحت یا یہی جنجال ہووے گا	۱۲۴
۱۴۶	ہجراں میں بس کہ مجھ پہ عذابِ الیم تھا	۱۲۵
۱۴۷	نام مت لے تو گھر کے جانے کا	۱۲۵
۱۴۸	اٹھائے زخم اتنے کس نے ، میرا سا جگر کس کا	۱۲۶
۱۴۹	پاؤں گر رکھ نہیں سکتا ہے تو در پر اپنا	۱۲۷
۱۵۰	سینہ جلتا ہے تپِ عشق سے اکثر اپنا	۱۲۸

ردیف ب

غزل نمبر	مصرع اول	صفحہ
۱۵۱	نوح کا یہ نہیں طوفاں کہ زمیں جاوے ڈوب	۱۲۹
۱۵۲	شب کیا میں نے جو اک نالۂ زار آخرِ شب	۱۳۰
۱۵۳	مجھ کو صحبت ہے سرِ زلف سے اب آخرِ شب	۱۳۱

غزل نمبر	مصرع اول	صفحہ

ردیف پ

ردیف ت

ردیف ث

ردیف ج

ردیف چ

---

۱ - اس کے بعد ایک نمبر رہ گیا ہے - (ادارہ)

ردیف ح

ردیف خ

ردیف د

غزل نمبر مصرع اول صفحہ

ردیف ذ

ردیف ر

ردیف ز

ردیف س

غزل نمبر	مصرع اول	صفحہ

غزل نمبر	مصرع اول	صفحہ

ردیف ن

ردیف و

ردیف ہ

ردیف ی ، ے

پیش گفتار

مصحفی کا ضخیم کلیات شایع ہونے کی نوبت ایک عرصے تک نہ آئی لیکن خدا کا شکر ہے کہ کلیات کے علاوہ اب کئی یونی ورسٹیوں میں مصحفی کی حیات اور کارناموں پر بھی کام ہو رہا ہے ۔ ممکن ہے اس طرح اُس بے التفاتی کا ازالہ ہوسکے جو اب تک ان کے ساتھ برتی گئی ہے ۔

جناب سید امتیاز علی تاج صاحب کے ارشاد پر میں نے مختلف نسخوں سے مقابلہ کرکے مصحفی کا یہ کلیات مرتب کیا ہے اور اسے مجلس ترقیِ ادب لاہور کی خدمت میں پیش کر دیا ہے ۔

دواوین کے جو نسخے دریافت ہو سکے یا جن تک رسائی ممکن تھی ان سے مقابلہ کر کے اختلافِ نسخ حاشیے میں درج کر دیا گیا ہے ۔ ان اختلافاتِ کو کاتبوں کی اصلاح و اختراع سمجھنا چاہیے ورنہ مصحفی کو اپنے کلام پر نظرثانی اور اصلاح کی فرصت کہاں تھی :

آن فرصتم کجاست کہ اے مصحفی ! دگر
بینم بچشمِ غور غزل‌ہاے گفتہ را

سہوے اگر بود درو ، داں تو ز سہو کاتبش
ورنہ کلامِ مصحفی کزلک و فک و حک نداشت

اختلافِ نسخ کے بعد نامانوس الفاظ کی ایک فرہنگ بھی شامل کر دی گئی ہے ۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے میرے مقالے (مصحفی — زندگی اور فن) کی نگرانی کے علاوہ کلیات کی تدوین میں بھی راہ نمائی فرمائی ۔

محترمی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے کلیات کی بہت سی "گتھیوں" کو سلجھایا ، جناب کلب علی خاں فائق صاحب نے تمام دواوین پر نظرثانی فرمائی ، پروفیسر آل احمد سرور صاحب ، پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب ، پروفیسر نورالحسن ہاشمی صاحب ، جناب عرشی صاحب ، قاضی عبدالودود صاحب ، محترمی مالک رام صاحب اور جناب اکبر علی خاں صاحب کے مشوروں نے بہت سی مشکلیں آسان کیں ۔ میں ان سب حضرات کا شکرگزار ہوں ۔

دوست مکرم جناب حنیف نقوی نے مقابلے میں میری مدد کی ، برادرم عبدالغفار احمد صاحب نے مختصر وقت میں کلیات کی اشاعت کو ممکن بنا دیا جس کے لیے دل سے ان کا ممنون ہوں ۔

شعبۂ اردو ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ — نور نقوی

مقدمہ

کلام مصحفی کے مطالعے سے ان کی جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ بڑی متضاد ہے۔ بلاشبہ اردو شاعری ردیف و قافیہ کی پابند رہی ہے۔ ان جکڑ بندیوں کے سبب اگر کسی شاعر کے یہاں "مربوط خیالات" کے بجائے تضاد نظر آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن مصحفی کے یہاں بات اتنی ہی نہیں؛ نظم کے علاوہ نثر میں بھی یہی صورت ہے۔ گویا دو متضاد شخصیتیں ہیں کہ باہم دست و گریباں ہیں۔ کبھی کچھ نہ پا کر بھی سکون اور تشکر، کبھی سب کچھ پا کر بھی نا آسودگی کا احساس، کہیں حد سے زیادہ عجز و انکسار تو کہیں بےجا غرور و نخوت، کہیں حریفوں سے بھی نباہ کی کوششیں اور کہیں دوستوں سے بھی الجھنے کے ارادے! حد یہ ہے کہ جو بیانات مذہبی عقائد کے متعلق ہیں، ان میں بھی ایسا ہی تضاد موجود ہے۔ کہیں غیرمبہم الفاظ میں اپنی شیعیّت کا اعلان ہے، کہیں اہل تشیع پر لعن طعن ہے! مختصر یہ کہ نجی زندگی سے متعلق ان کے ایک بیان کی کسی دوسرے بیان سے تردید ہو جاتی ہے اور ایسی صورتیں بار بار پیش آتی ہیں۔

ان کی شخصیت کے اس دوہرے پن کا ذمہ دار وہ ماحول تھا جس میں ان کی زندگی کا بیش تر حصہ گزرا۔ مصحفی کی شعرگوئی کا زمانہ بارھویں صدی ہجری کے ربع آخر سے لے کر

تیرھویں صدی کی پہلی چار دہائیوں تک پھیلا ہوا ہے ۔ اس دور کی ابتری ، نا پائدار حکومتیں ، غیر یقینی سیاسی حالات اور معاشی خستہ حالی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہیں ۔ اس عہد نے ایک طرف بادشاہوں کی بے بسی ، شہزادوں اور رئیسوں کی فاقہ مستی اور اہلِ ہنر کی نا قدری دیکھی ، تو دوسری طرف نا اہلوں کا عروج اور بے ہنروں کی قدردانی کا مشاہدہ کیا ۔ معاشرے کو گھن لگ چکا تھا لیکن ظاہری ٹیپ ٹاپ کا وہی عالم تھا ۔ یہ تھے وہ حالات جن میں مصحفی کی ولادت ہوئی اور جن کے درمیان ان کی زندگی گزری ۔

مصحفی ، اردو اور فارسی کے گیارہ دواوین ، کئی نثری رسائل اور شعراے اردو و فارسی کے تین تذکروں کے مصنف ہیں ، لیکن ان کی کسی تصنیف سے ان کے سنہ ولادت کا پتا نہیں چلتا ۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ قدم قدم پر اپنی عمر بتاتے چلتے ہیں ، لیکن "۶۰ سے زیادہ" اور "۸۰ کے لگ بھگ" قسم کے بیانات نے اس مسئلے کو سلجھانے کے بجائے اور الجھا دیا ہے ۔ مصحفی سنوں اور تاریخوں کے سلسلے میں بے حد غیر محتاط ہیں ۔ دیوانِ فارسی (در جوابِ نظیری) کے دیباچے مکتوبہ ۱۲۱۱ھ میں اطلاع دیتے ہیں کہ ۱۵ سال سے لکھنؤ میں مقیم ہوں ، حالانکہ اس میں شبہے کی مطلق گنجائش نہیں کہ اس وقت انھیں مستقل طور پر لکھنؤ میں رہتے ہوئے تیرہ سال گزر چکے تھے ۔ مصحفی جانتے ہیں کہ شاہ حاتم کا تاریخی نام ظہور ہے لیکن وفات (۱۱۹۷ھ) کے وقت ان کی عمر سو کے لگ بھگ بتاتے ہیں[۱] ۔

'مجمع الفوائد' کا ایک حصہ ان کی آپ بیتی پر مشتمل ہے ۔

---

۱ ۔ تذکرۂ ہندی : ۸۰ ۔

خیال ہوتا ہے کہ یہاں تو انھوں نے اپنی ذات سے متعلق اہم معلومات صحت کے ساتھ فراہم کر دی ہوں گی ، لیکن یہاں بھی وہی الجھاؤ موجود ہے ۔ ایک جگہ بتاتے ہیں کہ :

''عرصہ سی سال بلکہ زیادہ می گزرد کہ بہ لکھنؤ قیام دارم[1] ۔''

مصحفی دوسری بار ۱۱۹۸ھ میں لکھنؤ پہنچے تھے ۔ اس طرح مجمع الفوائد کی تصنیف کا زمانہ ۱۲۲۸ھ کے بعد قرار پاتا ہے ۔ آگے چل کر اپنی عمر کے متعلق لکھتے ہیں :

''سنہ عمر از شصت متجاوز است[2] ۔''

لیکن دشواری یہ ہے کہ ''متجاوز'' اور ''بلکہ زیادہ'' کے ہوتے ہوئے ہم کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے ۔ دیوان ششم کا دیباچہ مکتوبہ ۱۲۲۴ ہجری البتہ اس لحاظ سے اہم ہے ۔ اس میں وہ اپنی عمر ساٹھ سے زیادہ بتاتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی ولادت کے متعلق مختصراً یہ اطلاع بھی دیتے ہیں :

''تولد من در احمد شاہی است ۔''

احمد شاہ ۱۱۶۱ھ میں تخت‌نشین ہوا ۔ اس طرح مصحفی کی ولادت کا زمانہ ۱۱۶۱ھ سے قبل قرار نہیں دیا جا سکتا اور ۱۲۲۴ھ میں وہ اپنی عمر ۶۰ سے زیادہ بتاتے ہیں، اس طرح یہ بھی طے ہو جاتا ہے کہ ان کا سنہ ولادت یقیناً ۱۱۶۴ھ سے قبل ہونا چاہیے ۔ مصحفی کے بعض اشعار بھی اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں ۔

دیوان پنجم کی تصنیف کا زمانہ ۱۲۱۸ھ کے بعد کا ہے۔

۱- مجمع الفوائد : ۳۲۷ (مشمولہ کلیات) ۔

۲- مجمع الفوائد : ۳۲۸ (مشمولہ کلیات) ۔

اس میں اپنی عمر ساٹھ سال بتاتے ہیں ۔ ریاض الفصحا کا زمانۂ تصنیف ۱۲۲۱ھ اور ۱۲۳۶ھ کے درمیان ہے ۔ قیاس یہ ہے کہ جب یہ تذکرہ تکمیل کے قریب ہوگا تو انھوں نے اپنے حالات درج کیے ہوں گے ۔ اس میں اپنی عمر کے متعلق لکھتے ہیں :

"سنہ عمرم تا الی الیوم قریب ہشتاد رسیدہ باشد اکنون دل از دنیا برکندہ جز یادِ الٰہی و مصروف بودن بہ نماز و روزہ چیزی دیگر نمی خواہد ۔"

عبارت کے آخری حصے سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ اس وقت تذکرہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا ۔ دیوان ہشتم ان کے تمام دواوین میں مختصر ترین ہے ، اور جیسا کہ اس کے کاتب نے لکھا ہے ، یہ دیوان ان کی وفات کے سبب نا تمام رہا ۔ اس میں انھوں نے اپنی عمر اسّی سال کے قریب بتائی ہے :

ہمیں اے مصحفی ! اسّی برس میں
نہیں اب اعتمادِ عمرِ فانی

مصحفی کے ان تمام بیانات کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ولادت کا زمانہ ۱۱۶۱ھ اور ۱۱۶۴ھ کے درمیان ہے اور اس میں بھی زیادہ امکان یہی ہے کہ ۱۱۶۱ ، ۱۱۶۲ھ کے قریب ہو ۔

مصحفی کے مولد کے متعلق صرف ایک واضح بیان ملتا ہے ؛ عبدالقادر چیف رام پوری اپنے روزنامچے[1] میں بسّلم گڑھ کو ان کا مولد بتاتے ہیں۔ ان کی معلومات کا ذریعہ خود مصحفی ہیں۔ اپنی ملازمت کے دوران میں عبدالقادر کا قیام امروہے میں بھی رہا تھا ، اس لیے کسی غلط فہمی یا التباس کا احتمال کم ہی ہے ۔

۱۔ آزاد لائبریری (حبیب گنج کلکشن) مسلم یونی ورسٹی ، علی گڑھ ۔

اگر مصحفی امروہے کا ذکر کرتے تو عجب نہ تھا کہ یہ
آن سے محلے وغیرہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کرتے ۔ اس
بیان کی کسی ذریعے سے تصدیق نہیں ہوتی ۔ رتن سنگھ زخمی
"انیس العاشقین"[1] میں لکھتے ہیں :

"مولدش دہے است از مضافاتِ دھلی ۔"

اسے چیف رام پوری کے بیان کی تائید میں ایک ہلکا سا اشارہ
کہا جا سکتا ہے ۔ قاسم نے انھیں "از مردم بیرونجات"، ابن
امین اللہ طوفان نے "از اطراف دہلی" اور شاہ کمال نے "متوطن
شاہ جہان آباد" لکھا ہے ۔ لیکن دہلی اور امروہے کا فاصلہ
اتنا کم ہے کہ اسے دہلی کے اطراف میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔
پھر ایک زمانے میں امروہا علاقۂ دہلی کا ایک حصہ بھی
رہا ہے ۔ غلام محی الدین مبتلا میرٹھی اور خیراتی لال بے جگر
مصحفی کو بدایوں کا رہنے والا اور شوق "متوطن شاہدرہ"
بتاتے ہیں ، لیکن بیش تر تذکرہ نگاروں نے ان کا وطن امروہا
بتایا ہے ۔

ذکا : عیار الشعرا ، سرور : عمدۂ منتخبہ/۵۸۹ ، لطف :
گلشن ہند/۱۶۵ ، صفا : شمیم سخن/۲۳ ، نساخ : سخن شعرا/
۴۴۰ ، صفیر : جلوۂ خضر/۱۰۰ ، قدرت اللہ : نتائج الافکار/۲۰۴ ،
شیفتہ : گلشن بےخار/۲۸۵ ، خویشگی : گلشن ہمیشہ بہار
(طبع جدید) ۲۸۳ ، سحر : بہار بے خزاں/۱۲۱ ، قطب الدین
باطن : نغمۂ عندلیب (گلستان بے خزاں)/۲۱۶ ، محسن :
سراپا سخن/۲۴۱ ، نواب صدیق حسن خاں : شمع انجمن/۴۱۶ ؛
نواب سید علی حسن خاں : بزم سخن ، نواب نورالحسن خاں :

---

۱ ۔ قلمی ، مخزونہ لکھنؤ یونی ورسٹی ، ٹیگور لائبریری ، لکھنؤ ۔

طور کلیم/ ۱۹ ، نادر : تذکرۂ نادر/ ۱۴۵ ، شکور : بیاض/ ۴۵ -

میر حسن کے تذکرے میں درج ہے : "مولدش اکبر پور کہ قصبہ ایست متصل دھلی -" لیکن جناب عرشی نے اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا ہے - تذکرۂ میر حسن کا خطی نسخہ جو غالباً مولف کی ملکیت تھا ، رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے ، اس میں اصل عبارت یوں ہے :

"مولدش اکبر پور کہ قصبہ ایست متصل -"

متصل کے بعد "دہلی" کا اضافہ کاتب کی اختراع ہے -

خود مصحفی اکبر پور کو ، جو شیخ پور اور منجھاولی کے درمیان واقع ہے ، اپنا آبائی وطن بتاتے ہیں - یہ اکبر پور آج بھی اسی نام سے آباد ہے اور منجھاولی اور شیخ پور کے قریب ہے - اکبر پور سے مصحفی کا خاندان امروہے (محلہ کالی پگڑی) منتقل ہو گیا - مصحفی کے بیان کے مطابق ان کے خاندان کے اکثر افراد امروہے میں مدفون ہیں[۱] - اور یہاں کی معتبر تاریخوں میں مصحفی کا ذکر موجود ہے - یہیں ان کا بچپن گزرا ، یہیں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی اور یہیں ان کی شعر گوئی کا آغاز ہوا - اس کی تصدیق ان کے اپنے لکھے ہوئے تذکروں سے ہو جاتی ہے -

سالِ ولادت اور مولد کی طرح یہ بات بھی واضح نہیں ہے کہ شاعری میں انھیں کس سے تلمذ تھا - ناصر ، محسن اور نساخ نے انھیں 'تلمیذِ مانی' لکھا ہے لیکن ایسے کسی مانی کا پتا نہیں چلتا جسے مصحفی کا استاد تسلیم کیا جا سکے - آزاد نے انھیں امانی کا شاگرد لکھا ہے - ہو سکتا ہے مانی کے

۱- مجمع الفوائد : ۳۲۷ (مشمولہ کلیات) -

بجائے امانی آزاد کا سہو ہو - لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ذریعے سے ان تک صحیح اطلاع پہنچی ہو - اس قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ امروہے کی قدیم دستاویزوں سے امانی نام کے ایک "مکتبی ملا" کا پتا چلتا ہے - یہ مصحفی کے عہدِ طفولیت میں کسی مکتب سے متعلق تھے - بہت ممکن ہے مصحفی نے ان سے ابتدائی تعلیم حاصل کی ہو اور یہی وہ استاد ہوں جن کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے :

اے مصحفی ! استاد وہی ہووے گا آخر
جو میری طرح خدمتِ استاد کرے گا

لیکن یہ امانی غالباً شاعر نہ تھے ورنہ مصحفی اپنے تذکروں میں ان کا ذکر کرتے ، خواہ تلمذ کا اقرار اس خیال سے نہ کرتے کہ اب استاد ہو کر ایک گمنام شاعر کی شاگردی کا اعتراف کیوں کریں - اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شعر گوئی میں وہ کسی کے شاگرد نہ تھے -

مصحفی نے جہاں اپنے مذہبی عقائد کا ذکر کیا ہے وہاں بھی تضاد موجود ہے - ان کے آبا و اجداد مسلکاً اہل سنت تھے - اس کی تصدیق خود مصحفی کے بیانات سے بھی ہوتی ہے - لیکن انھوں نے اپنے شیعی عقائد کا اعلان ایک سے زیادہ جگہ خود کیا ہے :

مصحفی تھا تو شیعہ مذہب لیک
نعرۂ بوتراب کس دن تھا ؟

(دیوان اول)

تم مصحفیِ خستہ کو ہر غم سے چھڑاؤ
یا ابن علی ! یہ بھی تو اثنا عشری ہے

(دیوان پنجم)

قریب پہنچے جو رحلت کے دن سمجھ کر بات
کیا نبیؐ نے علیؑ کو وصی بہ خمِ غدیر
کہ یعنی بعد مرے ہو یہ جانشیں میرا
کریں متابعت اس کی سبھی صغیر و کبیر
سو تہنیت آسے اس دم تو سب نے دی لیکن
ہوا بطون میں بعضوں کا دل شکست پذیر
بہ ایں خیال کہ شایاں ہیں ہم خلافت کے
کہاں یہ مردِ جواں اور کہاں یہ امرِ خطیر

(قطعۂ تہنیت عید غدیر ، دیوان ہفتم)

عقد ثریا کے دیباچے میں حمد و ثنا کے ساتھ منقبت بھی لکھی ہے ۔ معراج کا واقعہ نظم کرتے ہوئے عقائدِ اثنا عشری کے مطابق لکھا ہے کہ حضرت علیؓ بھی آسمان پر تشریف لے گئے تھے :

علیؑ آں سوے عرش پرواز کرد
درِ گنجِ پوشیدہ را باز کرد

اس کے علاوہ ایک قصیدے میں شیعی عقائد اختیار کرنے کا اعلان ہے ۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انھوں نے بہطورِ اہلِ تشیع متعۂ رضائی کر لیا تھا[۱] ۔ اس طرح ان کا اثنا عشری ہونا ثابت ہوتا ہے ، لیکن خود ان کے مجموعۂ نظم و نثر میں ایسے کتنے ہی بیانات موجود ہیں جن سے ان کے شیعہ ہونے کی صاف تردید ہو جاتی ہے ؛ مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امیرالمومنین لکھتے ہیں اور خلفاے اربعہ کو خلفاے راشدین ۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے نثری رسالوں میں شیعیت ،

۱- مجمع الفوائد : ۳۲۸ (مشمولہ کلیات) ۔

تعزیہ داری اور تبرّے کی مذمت میں بہت کچھ لکھا ہے۔
یہاں صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

"محمدؐ را به این همه کثرت صحابی چهار شخص موافق بہم رسیده بودند و در تقرب ایشان دیگرے نبود ازیں جهت است که نقشِ پیمبری او در چار دانگ عالم نشسته[1]۔"

"شیوع ظلم باغیان که به نسبت امام زمان وقوع یافته ستّرے نمی کنند و از بد گفتن صحابه که علی التواتر آیه در شان ایشان مسطور است زبان به کام نمی کشند و از سب عایشه که زوجهٔ معشوقه محمدؐ است نمی‌ترسند و دلائل ضعیف در حق سبّاب وے قائم کرده اند، مجتهد اینان باوجود مبلغ علم سر از راستی پیچیده راه کج روی اختیار کرده باشند۔ ایں بیچارگاں چه کنند اما آنکه عاقل است حق از دیدهٔ او نہاں نیست[2]۔"

"اهل تشیع چه خوش اعتقاد و خوش نیّات مردم اند که در عشرهٔ محرم‌الحرام شهدائے دشت کربلا را به لباس موتلی محشور می سازند و مرقدها و تربت ها و مقبره‌ها از کواغذ رنگین و چوبهائے سنگین و نے هائے نوآئین برپا می کنند و به زیارت موهوم آں دل شاداں و فرحاں می مانند[3]۔"

۱۔ کلیات مصحفی: (لاہور) ۳۳۳۔
۲۔ کلیات مصحفی: (لاہور) ۳۴۹۔
۳۔ کلیات مصحفی: (لاہور) ۳۴۸، (مجمع الفوائد)۔

ب ایک رباعی اور چند شعر ملاحظہ ہوں :

سمجھیں ہیں درود سے بھی لعنت کو یہ خوب
یہ شیوہ نہیں طبع کے اپنی مرغوب
ہے مجلسِ شیعاں میں ایک سنّی یوں
سو نکٹوں میں جیسے ناک والا معیوب[1]

کیا خون سے اپنے قرآں کو رنگیں
کہ عثماں میں تھی حیائے محمد[2]

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ مصحفی مولانا فخر الدین کے معتقدین میں سے تھے۔ دیوان قصائد میں مولانا کی شان میں ایک قصیدہ بھی موجود ہے جس میں ان سے جدائی پر انتہائی ملال کا اظہار کیا گیا ہے۔ مصلحت کے کچھ نہ کچھ تقاضے ہر دور میں رہے ہیں لیکن مصحفی کا عہد ایسا نازک تھا کہ دل کی بات زبان پر لانی اور بھی مشکل تھی۔ چناں چہ شیعیّت کا اظہار محض شیعہ ممدوحین کی خوشنودی کے لیے ہے۔ جیسا کہ ان کے ایک شعر سے واضح ہوتا ہے :

مذہب کا تو غم کھاتا، کیا جانیے غم یہ ہے
یاں نوکری بھی آ کر ٹھہری ہے رکابی کی[3]

ورنہ مذہبی معاملات میں وہ کافی آزاد خیال اور حدود کی پابندی سے بے نیاز نظر آتے ہیں۔ ان کی نظم :

”نہ شیعہ باش نہ سنی ز خود رہے بتراش“

سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حق و باطل میں تمیز کرنے اور

۱۔ دیوان ہفتم۔
۲۔ دیوان ہفتم۔
۳۔ دیوان چہارم۔

اپنا راستہ خود بنانے کا شعور رکھتے تھے ۔ ان کی آزاد روی اور آزاد خیالی کا اندازہ خداے تعالیٰ اور قضا و قدر سے متعلق ان کے اس نظریے سے کیا جا سکتا ہے :

"او را از عالم تنزیہ خود کجا تنزل است کہ بہ عالم سفلی متوجہ شود و مثل پادشاہاں و کوتوالاں محکمۂ عدالت بیاراید ۔ کارہاے دنیا بہ تدبیرِ بندہ وابستہ است ۔ تقدیر را درو گنجایش نیست[1] ۔"

"کارخانۂ اہرمن کہ خداے دوم است در دنیا جاری و ساری است و دیگر ہمہ امور دنیا امور اتفاقی[2] ۔"

کوئی بائیس تیئیس سال کی عمر ہوگی کہ مصحفی نے امروہے کو خیر باد کہا اور معاش کی فکر میں[3] پہلے آنولہ ضلع بریلی ، پھر ٹانڈا ضلع رام پور پہنچے ۔ ٹانڈے میں محمد یار خان امیر نے چھوٹا سا دربار سجا رکھا تھا ۔ قائم ، فدوی لاہوری ، نعیم ، پروانہ ، عشرت ہزال اور حکیم کبیر اس دربار کے متوسل تھے۔ قائم کے توسط سے مصحفی کی رسائی بھی اس سرکار میں ہو گئی ۔ چین سے بسر ہونے لگی ۔ قائم سے بے حد ربط ضبط تھا ۔ مصحفی کی عمر اس وقت بائیس تیئیس سال کے قریب تھی لیکن قائم کو ان کی صلاحیتوں پر اتنا اعتماد تھا کہ نواب کی غزلیں اصلاح کے لیے انھی کو دے دیا کرتے تھے ۔

۱۱۸۵ھ (۱۷۷۲ع) میں سکرتال میں ضابطہ خاں کی

۱۔ کلیات مصحفی (لاہور) : ۳۲۴ ۔
۲۔ کلیات مصحفی (لاہور) : ۳۳۹ ۔
۳۔ مصحفی : تذکرۂ ہندی ۔ ۱۷۹ ۔

شکست کے بعد ٹانڈے کا دربار اجڑ گیا ۔ یہاں گزارے ہوئے مختصر مگر عیش و آرام کے دن ہمیشہ یاد آتے رہے ۔ آگے چل کر شہرت و نام وری حاصل کی ، اَن گنت شاگردوں کے استاد کہلائے ، مگر ایسا لگتا ہے کہ وہ سکون جو یہاں میسر تھا کہیں نصیب نہ ہوا اور یہاں کی محفلوں کی یاد کبھی بھلائی نہ جا سکی :

''واللہ کہ یاد آں صحبت گزشتہ داغِ ناکامی بر دلِ دردمند می گزارد[۱] ۔''

اور :

"ازانجا کہ فلک حقہ باز از قدیم الایام بازیہاے تازہ بروے کار آرد ، بیک ناگاہ بر شیشۂ انعقاد ایں مجلس بہشت آئیں سنگ تفرقہ انداختہ شراب عیش یاراں را بذائقہ ھلاھل ھجراں مبدل ساخت[۲] ۔"

یہاں سے مصحفی لکھنؤ پہنچے ۔ یہ شجاع الدولہ کا عہد تھا اور فیض آباد پایۂ تخت تھا ۔ مصحفی ایک سال سے زیادہ یہاں نہ ٹھہر سکے ۔ اندازہ یہ ہے کہ نہ یہاں دل لگا ہوگا اور نہ روزگار کی کوئی صورت بنی ہوگی ۔

مصحفی لکھنؤ سے نکل کر دہلی پہنچے ۔ دہلی کی حالت اُس وقت بہت سقیم تھی ۔ بڑے بڑے رئیس اور امیر پریشان حال تھے :

۱۔ تذکرۂ ہندی : ۱۷۹ ۔

۲۔ تذکرۂ ہندی : ۴ ۔ کون جانے یہ شعر بھی اُسی دور کی یاد نے کہلوایا ہو :

فلک نے سنگ پھینکا تفرقے کا
ہوئے دو چار صاحب دل جہاں جمع

حال یہ سرکار کا اب کے امیروں کی ہے
دیگچے بے کار ہیں سرد پڑے ہیں آجاغ
(مصحفی)

شاعروں اور فن کاروں کا تو ذکر ہی کیا ہے، میر جیسے استاد کو اپنا ہنر عیب نظر آتا تھا:

صناع ہیں سب خوار ، ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اُس میں جسے کچھ ہنر آوے (میر)

مصحفی کہتے ہیں:

اِن دنوں بس کہ زمانے میں نہیں قدرِ ہنر
ہم سمجھتے ہیں ہنر ترکِ ہنر کرنے کو

اگر خورشید سے روشن ہوں تو بھی خوار پھرتے ہیں
غرض اس دور میں یہ قدر ہے صاحب کمالوں کی

ایسے پُر آشوب زمانے میں مصحفی کی سرپرستی کون کرتا۔ انھوں نے بارہ سال گوشہ نشینی میں گزار دیے اور کسی کے در پر نہ گئے:

"دوازدہ سال در شاھجہاں آباد بہ دور نواب نجف خاں مرحوم بگوشۂ عزلت گزیدہ . . . . و ھرگز براے تلاش معاش در آں حشر اجساد اموات بر در کس نہ رفتہ[۱]۔"

میر حسن کا بیان ہے کہ وہ دہلی میں تجارت کرتے تھے[۲]۔ لیکن شعر و شاعری کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ خود اپنے مکان پر بھی محفلِ مشاعرہ منعقد کرتے تھے اور درد جیسے باکمالوں کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے رہتے تھے۔ اس زمانے کا کلام

۱۔ تذکرۂ ہندی: ۲۴۸۔
۲۔ میر حسن، تذکرۂ شعرائے اردو: ۱۶۸۔

الگ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دیوان اول میں وہ کلام بھی شامل ہے جو لکھنؤ پہنچنے کے بعد کہا گیا ۔ پھر بھی دیوان اول تمام تر دہلی میں کہے گئے کلام کی نمائندگی کرتا ہے کیوں کہ لکھنؤ پہنچنے کے بعد وہاں کا رنگ قبول کرنے میں کچھ عرصہ تو لگا ہی ہوگا ۔

جب دہلی میں رہنا دشوار ہوگیا اور یہ صورت پیش آئی کہ :

ہر روز نیا قافلہ پورب کو رواں ہے

تو مصحفی بھی ۱۱۹۸ھ میں دوسری بار لکھنؤ پہنچے ۔ امید لے کر آئے ہوں گے کہ یہاں پذیرائی ہوگی ، قدر دانی ہوگی مگر یہاں جرأت کا جادو چل رہا تھا :

"آں وقت دور دور میں جرأت بود و مردم شہر ہمہ مسخرِ طرزِ دل پسند او[1] ۔"

قصیدہ 'تیغ براں' میں اپنے حریفوں کی زیادتی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "بعض نے تیر و کماں ہاتھ میں لی ۔" خطی نسخے میں بعض کے نیچے جرأت کا نام درج ہے ۔ ان دنوں شہزادہ جواں بخت میرزا جہاندار شاہ لکھنؤ میں مقیم تھے ۔ شاعر نواز تھے اور مہینے میں دو بار محفل مشاعرہ منعقد کرتے تھے ۔ مصحفی کے ایک معتقد نواب شمس الدولہ قسمت شہزادے کی سرکار میں مختارِ کل تھے ۔ انھوں نے شہزادے سے سفارش کی ، ملاقات کے لیے عید کا دن مقرر ہوا ۔ مصحفی ایک رباعی اور ایک قصیدہ کہہ کر لے گئے ۔ رباعی یہ ہے :

یارب تری بزم رشکِ گلزار رہے
اور بختِ جواں سدا ترا یار رہے

۱- یکتا : دستور الفصاحت ، ۹۴ ۔

ہے مصحفی غریب کی نت یہ دعا
جب تک کہ جہاں رہے جہاندار رہے[1]

دیوان قصائد میں جہاندار شاہ کی مدح میں دو قصیدے موجود ہیں ۔ ایک قصیدے میں اپنی غریب الوطنی اور بےکسی کا ذکر اور واپسی کا ارادہ ظاہر کیا ہے :

میرے سوا کون ہے بے کس و مسکیں غریب
اب کہ وطن سے نکل آئے ہوا ہوں تباہ
جورِ فلک سے نہیں یاں مجھے کوئی مفر
اس لیے اس در تلک آیا ہوں ہو داد خواہ
یا مجھے رکھ اپنے پاس لیک بہ عز و وقار
یا مجھے کچھ دے صلہ تا میں کروں طے راہ[2]

لیکن یہاں کوئی شنوائی نہ ہوئی ۔ اس کے بعد مصحفی میر محمد نعیم خاں ثابت جنگ کے متوسل ہوگئے ۔ لیکن اس توسل سے ان کی دشواریاں دور نہ ہوئیں ۔ دیوان دوم کی کئی رباعیوں میں میر نعیم کی سرکار سے وقت پر تنخواہ نہ ملنے کی شکایت ہے ۔ لکھنؤ کے شاعروں کی خصومت اور مالی دشواریاں اس پر مستزاد ۔ غرض ان کی زندگی تلخ ہوگئی تھی ۔ ایک قصیدے میں ان مصیبتوں کا ذکر کیا ہے ۔ یہاں زیادہ اقتباسات کی گنجایش تو نہیں لیکن چند شعر اس خیال سے پیش کیے جاتے ہیں کہ ان سے ان نامساعد حالات کو سمجھنے میں مدد ملے گی جن سے مصحفی دو چار تھے :

نہ خال کا ہوں میں قیدی نہ زلف کا ہوں اسیر
پڑا ہے آن کے ششدر میں مہرۂ تدبیر

۱۔ دیوان اول ۔
۲۔ دیوان قصائد : ۶۹ ۔

زمینِ ہند میں تھا میرا زاد بوم ولے[1]
لے آئی واں سے مجھے کھینچ کر یہاں تقدیر

فلک نے مجھ کو کیا لکھنؤ میں زندانی
اگرچہ کچھ مری ثابت نہیں ہوئی تقصیر

برنگ شانہ جو پہلو کوئی مرا دیکھے
تو اس میں دونوں طرف ہیں لگے ہزاروں تیر

پھر اس پہ مدعیوں کا یہ مجھ پہ بلوا ہے
کہ جوں سگانِ شکاری ہوں در پۓ نخچیر

جو بعضے بیٹھیں ہیں آ آ کے دائیں اور بائیں
تو مجھ کو وہ نظر آتے ہیں منکر اور نکیر

ہمیشہ دل میں ارادہ کروں ہوں میں اپنے
کہ جب مدار کی چھڑیوں کی ہو روانہ بھیر

تو مل کے میں بھی اسی قافلے میں ہر صورت
جو زاد و راحلہ پہنچے بہم کروں شب‌گیر

سو زاد و راحلہ میرے تئیں نہیں ملتا
مری نحوستِ طالع نے کی ہے یہ تاثیر

ہمیشہ پیچ پر اک پیچ پڑتا جاتا ہے
کہ جس سے ہوتی ہے مضبوط اور بھی زنجیر

مگر بروز اجل جسم ناتواں کا مرے
بنا ہوا ہے اسی خاکِ کینہ خو سے خمیر

۱- مولد دہلی ؟

اسی قصیدے کے کچھ اور شعر ہیں :

بس اک[1] امیر کے ملنے سے ہو گیا جی سیر
بھلا ہوا جو نہ دیکھے یہاں کے سارے امیر
کرے ہے جلوہ ذہانت انھوں کے بُشرے سے
پھریں ہیں ہاتھیوں پر یاں جو یہ صغیر و کبیر
مثل قدیم ہے "مشتے نمونۂ خروار"
ضرور کیا ہے کہ ہر اک سے ہوجے تجربہ‌گیر
کہ حال یاں کے امیروں کا نوکری پیشہ
بہ لفظہائے شکایت کریں ہیں نت تقریر

مصحفی ۳-۱۲۰۲ھ/۸۸-۱۷۸۷ع تک نعیم خاں سے متوسل رہے ۔ اس کے بعد کچھ زمانہ بے روزگاری میں گزرا ۔

"چون چند سال بریں بگزشت و روزگار فقیر برہم خورد و وحشتِ مزاج بر آں زیادہ‌گردید مطلقاً بہ شعر و شاعری سروکار نماند بلکہ نفرت کلی دارد[2] (روداد) ۔"

یہ نفرت یہاں تک بڑھی کہ شاگردوں کو اصلاح تک دینے سے انکار کر دیا[3] ۔ دیوان دوم کی تصنیف کے وقت مصحفی اپنی عمر چالیس سال بتاتے ہیں ۔ اس طرح اس دیوان کی تصنیف کا زمانہ ۱۲۰۱ھ کے بعد کا ہے ۔ اس دیوان میں مرزا زین العابدین عرف مرزا مینڈو سرسبز کو ان کے غسلِ صحت پر مبارک باد دی ہے ۔ تذکرۂ ہندی میں لکھا ہے :

۱۔ میر نعیم ؟ ممکن ہے وہ امیر جن سے گلہ تھا کہ :
"اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے"
بھی میر نعیم ہی ہوں ۔

۲۔ ہندی : ۲۵ ۔

۳۔ ایضاً ۔

''فقیر پیش ازیں مدت چار سال بصیغۂ شاعری ملازم و رفیق ایشاں ماندہ[1] ۔''

۱۲۰۳ھ/۸۹-۱۷۸۸ع میں شہزادہ سلیمان شکوہ لکھنؤ پہنچے ۔ آصف الدولہ نے پذیرائی کی ۔ ایک چھوٹا سا دربار آراستہ ہوگیا ۔ انشا ، مصحفی ، جرأت اور سوز بھی اس دربار سے وابستہ ہوگئے ۔ یہاں انشا اور مصحفی میں وہ زبردست معرکہ آرائی ہوئی جو اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی ۔ انشا اور مصحفی کے تعلقات خوش گوار تھے لیکن انشا کے معاصرین نے ان کی شوخیوں ، شرارتوں اور ہنگامہ آرائیوں کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے ۔ انشا اور مصحفی دونوں کا مزاج ایک دوسرے کی ضد تھا[2] ۔ چھیڑ چھاڑ انشا کا محبوب مشغلہ تھا ۔ مصحفی کبھی داؤں پر چڑھتے ہوں گے تو انشا انھیں بھی کب معاف کرتے ہوں گے ۔ ان سطور میں اس معرکے کی تفصیل کی گنجائش نہیں ۔ سعادت[3] خاں ناصر نے ''خوش معرکۂ زیبا'' ، میں مولانا محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں سارے واقعات بیان کر دیے ہیں ۔ ظاہر ہے ناصر کے بیانات

۱- تذکرۂ ہندی : ۱۱۸ ۔

۲- ''میں ہوں ہنسوڑ اور تو ہے متقطع میرا تیرا میل نہیں۔''
یہ مصرع مصحفی اور انشا کے متضاد مزاجوں کی یاد دلاتا ہے حالانکہ اس میں مصحفی کی طرف اشارہ نہیں ۔

۳- وقائع ، ۱۲۰۳ : دریں سال شاہد شاہزادہ سلیمان شکوہ کہ بالفعل درلکھنؤاست وارد گشتہ ۔ صفحہ ۱۱۰ ، تفضیح الغافلین ، تالیف مرزا ابوطالب لندنی ، ترتیب ڈاکٹر عابد رضا بیدار ۔

آزاد سے زیادہ معتبر ہیں کیوں کہ آن دنوں ناصر لکھنؤ میں تھے، گو بہت کم عمر رہے ہوں گے - "خوش معرکۂ زیبا" مصحفی کے انتقال کے بائیس سال بعد ۱۲۶۲ھ میں تکمیل کو پہنچا - مصحفی کی غزل : "سر مشک کا ہے تیرا ، تو کافور کی گردن" کے جواب میں انشا نے غزل کہی : "توڑوں گا خم بادۂ انگور کی گردن" تو معرکے کا آغاز ہوا[1] - اس کے سوا ایک قطعے میں انشا نے مصحفی کی اس غزل پر اعتراضات کیے - سلیمان شکوہ نے بھی انشا کی طرف داری میں غزل کہی - مصحفی کے شاگرد بھی کب چوکنے والے تھے - مصحفی نے ایک قطعے (اے آنکہ معارض ہو مری تیغ زباں سے) میں اعتراضات کے جوابات دیے - ناصر کا بیان ہے کہ اس کے بعد کچھ دنوں ظاہر میں صلح اور باطن میں عداوت رہی - پھر مصحفی نے یہ غزل پڑھی: "زہرہ کی جب آئی کف ہاروت میں انگلی" تو ظاہر ہے اس زمین کو دیکھ کر انشا بے قابو ہوگئے ہوں گے - انھوں نے اس کے مقطع کو الٹا اور پھر جواب میں ایک پوری غزل کہی - دونوں طرف سے خوب لے دے ہوئی - شاگردوں نے بھی حصہ لیا - فریقین نے جی کھول کر ہجویں کہیں - اس کے بعد سوانگ کا ہنگامہ ہوا اور بات کشت و خون تک پہنچتے پہنچتے رہی -

مصحفی کے ساتھ شاگردوں کا پورا لشکر تھا لیکن پلہ انشا ہی کا بھاری رہا - ایک تو ہنگامہ آرائی اور شوخی ان کی فطرت تھی ، پھر انھیں شہزادے اور شہر کے رؤسا کی حمایت حاصل تھی - مصحفی کے لیے گوشہ گیر ہوجانے کے سوا چارہ ہی کیا تھا :

---

۱ - انشا کی اس غزل کی تلخی سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جھگڑا بہت پہلے شروع ہو چکا تھا اور بات بہت آگے بڑھ چکی تھی -

جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں
کچھ اس کے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں
کوچے سے نکل کر میں ترے نالہ کروں گا
معلوم ہوا اب مجھے، تاثیر نہیں یاں
اے مصحفی! بےلطف ہے اس شہر میں رہنا
سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

انشا نے شہزادے کو مصحفی سے برگشتہ کر دیا تھا۔ انھوں نے لاکھ صفائیاں پیش کیں، اپنی بے گناہی کا یقین دلایا' لیکن بات نہ بنی۔ آخر مجبور ہو کر آصف الدولہ سے فریاد کی:

کروں بہ شعر غزل میں نہ ہجو حاسد کی
وہ میری ہجو کرے اس طرح سرِ بازار
وگر جواب دے کا ادھر سے ساماں ہو
تو یہ ڈرائے کہ ہے شاہزادے کا دربار
غرض کہ میں ہی ترا ہر طرح سے ملزم ہوں
مرا ہی تجھ کو خوش آیا ہے ان دنوں آزار

۱۔ قسم بذات خدائے کہ ہے سمیع و بصیر
کہ مجھ سے حضرت شہ میں ہوئی نہیں تقصیر
یہ افترا ہے بنایا ہوا سب انشا کا
کہ بزم و رزم میں ہے پائے تخت کا وہ مشیر
مزاج شاہ ہو یوں منحرف تو مجھ کو بھی
یہ چاہیے کہ کروں شکوہ اس کا پیش وزیر

خطائے خصم نہیں کچھ یہ بخت کا ہے قصور
کہ مجھ سے طور نخستیں نہیں مزاج حضور

خوشی ہے یوں ہی جو تیری تو لے خموش رہا
بطورِ شکوہ بھی لیکن نہ کچھ کروں اظہار

اور ایک مخمس (اول تو مدح گوے پیمبر ہے مصحفی) میں آصف الدولہ سے عدل و انصاف کی درخواست کی ۔ نواب نے انشا کو قصور وار ٹھہرایا اور لکھنؤ چھوڑنے کا حکم دیا[1] ۔ لیکن جب یہ واقعہ رفت و گزشت ہوگیا تو مصحفی کا دل صاف ہوگیا ۔ انشا کی موت پر کس طرح اظہار افسوس کیا ہے :

مصحفی! کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں
یاد ہے مرگِ قتیل و مُردنِ انشا مجھے

انشا کے ہاتھوں رسوا ہونے کے بعد مصحفی پھر کچھ دنوں کے لیے گوشہ نشین ہوگئے ۔ "ریاض الفصحا" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ چند سال پہلے دوستوں کی بے ادائی کے سبب شعر گوئی ترک کر کے گوشہ نشیں ہو گئے تھے اور گمنام وار زندگی بسر کرتے تھے ، شاعروں اور امیروں کی ملاقات سے گریز کرتے تھے ، مگر محمد عیسیٰ تنہا کی فرمائش پر شعر و شاعری کی محفل پھر گرم ہونے لگی ۔ منتظر اور گرم بھی شریک بزم ہوتے تھے ۔ اس کے بعد گرم ، حیدر آباد چلے گئے اور منتظر کا انتقال ہو گیا[2] تو یہ محفلیں پھر برہم ہوگئیں ۔ اسی اثنا میں

---

۱ ۔ خازن الشعرا : بحوالہ اردوے معلیٰ ، جون ۱۹۱۲ع ۔
۲ ۔ ۱۲۱۷ھ : ناگہاں ہاتف بگوش ایں از سر افسوس گفت
شاعر جادو بیان و قایل رنگین کلام
تاریخ وفاتش از سر درد
گفتند سخن ز اوج افتاد (مصحفی)
۱۲۱۷

ایک دن مرزا محمد تقی خاں ہوس سے سر راہ ملاقات ہو گئی ۔ پرسشِ احوال کے بعد انہوں نے ملاقات کا وعدہ لے لیا ۔ جب دوبارہ ملاقات ہوئی تو اس مہربانی سے پیش آئے کہ مصحفی اسی دن سے آن سے وابستہ ہو گئے ۔ چنانچہ ریاض الفصحا کے نقش اول کی تکمیل (۱۲۳۱ھ) کے وقت انہیں سے توسل تھا[1]۔ اس کے بعد نواب کاب علی خاں[2] اور مہدی علی خاں سے توسل رہا لیکن زندگی کے یہ آخری دن بھی آرام سے نہ گزرے ۔ مہدی علی خاں کی سرکار سے بھی تنخواہ کئی کئی مہینے تک نہ ملتی تھی :

باره سے دو غایب ہوئے ده ماه کی ٹھہری
فاقوں سے لگے مرنے تو تنخواہ کی ٹھہری
اب دیوے ہے یاں کون مہینے کے مہینے
تقسیم یہی بس گہ و بےگاہ کی ٹھہری
جس دن سے ہوئے مہدی علی خاں کے حوالے
اس دن سے سدا نالۂ جاں کاہ کی ٹھہری

اسی تنگ دستی کے عالم میں ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ع) میں وفات پائی اور لکھنؤ میں کسی جگہ دفن ہوئے ۔ مدفن کا صحیح پتا اب تک نہ چل سکا ۔

یہاں مصحفی کی شاعرانہ خصوصیات کا جائزہ لینا تو مقصود نہیں لیکن اتنا اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دہلی سے لکھنؤ کی طرف ہجرت مصحفی کی شاعری میں ایک موڑ کی

---

۱ ۔ دیباچۂ ریاض الفصحا ۔

۲ ۔ حکیم شفائی خاں ارشد کا انتقال ۱۲۳۰ھ میں ہوا ۔ نواب کاب علی خاں کے ایما پر مصحفی نے تاریخ کہی ۔ خیال ہے نواب کاب علی خاں سے توسل کا زمانہ یہی ہے ۔ ریاض : ۱۶ ۔

حیثیت رکھتی ہے ۔ ایک داخلی قسم کی خارجیت اور رنگوں اور خوشبوؤں کا احساس ، جو اردو شاعری کو مصحفی کی دین سمجھا جاتا ہے ، لکھنؤ پہنچنے سے پہلے بھی ان کے یہاں موجود تھا ، لیکن لکھنؤ پہنچ کر یہ رنگ اور گہرا ہوگیا ۔ جیسا کہ اوپر یکتا کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے ، مصحفی لکھنؤ پہنچے تو وہاں جرأت کا رنگ مقبول تھا اور انھیں مات دینے کی صرف یہی صورت تھی کہ ان کے رنگ میں شاعری کی جائے ۔ یہ کوشش شعوری ہو یا غیر شعوری لیکن جرأت کا رنگ دھیرے دھیرے چڑھتا چلا جاتا ہے ۔ وہ معاملہ بندی کی شاعری کو لاکھ "چھنالے کی شاعری" اور "رزالے کی شاعری" کہیں لیکن رفتہ رفتہ اسی رنگ میں رنگتے چلے جاتے ہیں ۔ تیسرے دیوان سے جرأت کا رنگ نمایاں ہونے لگتا ہے اور آخری دیوان تک تو وہ اس قدر غالب آجاتا ہے کہ اس میں دو تین اچھے شعر ڈھونڈ نکالنا بھی مشکل کام ہے ۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری بھی بے جان ہوتی جاتی ہے ۔

مصحفی کا اردو کلام

دیوان اول :

غزلیات : ۲۰۸ ، رباعیات : ۳۰ ، مسدس : ۱ ، مخمس : ۲ ۔

مثنوی در بیانِ ہجوِ پسرِ حجام ، در بیانِ ہجوِ چارپائی ، در صفتِ اجوائن ۔

زمانۂ تصنیف :

اس دیوان میں قیامِ دہلی کے زمانے اور لکھنؤ پہنچنے کے بعد کے دو ایک سال کا کلام شامل ہے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۲۰۰ھ کے قریب یہ دیوان مکمل ہوا ۔

خطی نسخے :

۱ ۔ کتاب خانۂ رضائیہ ، رام پور ، مکتوبہ ۲۹ رجب ۱۲۱۱ھ - ۲۸ جنوری ۱۷۹۷ع ۔ ایک عبارت کے مطابق یہ نسخہ مصحفی نے "سلطان اودھ" کو نذر کیا تھا ۔ متن کی اساس اسی نسخے کو قرار دیا گیا ۔

۲ ۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ، پٹنہ ، مکتوبہ ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ع[1] ۔

۳ ۔ کتب خانۂ دارالعلوم دیوبند ، مکتوبہ ۲ ربیع الاول ۱۲۴۹ھ - ۲۰ جولائی ۱۸۳۳ع ۔

۴ ۔ لکھنؤ یونی ورسٹی ٹیگور لائبریری ، مکتوبہ ۱۲ صفر ۱۲۷۹ھ - ۱۰ اگست ۱۸۶۲ع ۔

۵ ۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ۔ مشمولہ کلیات مصحفی ، ۱۲۶۴ھ - ۴۸-۱۸۴۷ع ۔ نسخۂ دوم ، اغلاط سے پُر ۔

۶ ۔ ہندو یونیورسٹی لائبریری بنارس (سری رام کلکشن) مکتوبہ نہم ذی الحجہ ۱۲۲۵ھ (تاریخ مشکوک) شروع میں ایک ورق (بعد میں لکھ کر) شامل کیا گیا ہے ۔ اس پر دیوان دوم

---

۱ ۔ اس نسخے پر سنہ کتابت وغیرہ درج نہیں لیکن نسخۂ دیوان چہارم کے ترقیمے سے پتا چلتا ہے کہ پورا سیٹ مصحفی کی وفات کے تین سال بعد احمد علی (کاتب) نے فراہم کرکے نقل کیا ۔

کی ایک غزل اور تین اشعار ہیں ۔ ورق ۲ الف سے دیوان اول شروع ہوتا ہے ۔

۷ ۔ مولانا آزاد کالج لائبریری کلکتہ (مجموعۂ غزلیات) ۔

۸ ۔ بیاض انڈیا آفس ۔

دیوان دوم :

غزلیات : ۴۸۴ ، قطعہ : ۱ (رباعیات کے ساتھ)، رباعیات : ۵۰ ، مسدس : ۳ ، مثمن : ۱ ۔ مثنوی در افراط سرما ، در افراط گرما ، در افراط آتش ، پسر تنبولی ، در ہجو مکان ، در ہجو کھٹمل ۔

زمانۂ تصنیف :

اس دیوان میں اپنی عمر چالیس سال بتاتے ہیں :

سب خاک میں مل گئی جوانی کی بہار
بیٹھا سرو رو پہ آکے پیری کا غبار
چالیس برس تو خواب غفلت میں کٹے
اے مصحفی ! اب تو ٹک کہیں ہو بیدار

اس طرح اس کا زمانۂ تصنیف ۱۲۰۱ھ کے بعد ہے ۔

خطی نسخے :

۱ ۔ رضا لائبریری رام پور ، ۳۳۶۶/م ۹۴۶ (ج ۲)
ترقیمہ ندارد ۔

۲ ۔ رضا لائبریری رام پور ، ۳۳۶۵/م ۹۴۷ (ج ۲)
مکتوبہ غرۂ ماہ ربیع الثانی ۱۲۴۷ھ پنجشنبہ ، ۸ دسمبر ۱۸۳۱ع (شاہجہان آباد) معہ اصلاحات اسیر و امیر ۔

۳ ۔ رضا لائبریری رام پور ، ۵۱۴۸/م ۹۵۰ (ج ۲)

دیوان دوم کی نقل -

۴ - خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ، مکتوبہ ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ع -

۵ - سنٹرل اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد (کتب خانۂ آصفیہ) ترقیمہ موجود نہیں -

٦ - پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ، مکتوبہ ۱۲٦۴ھ ، ۱۸۴۷-۴۸ع -

۷ - ہندو یونیورسٹی لائبریری بنارس ، ترقیمہ موجود نہیں -

دیوان سوم :

غزلیات : ۵۱۵ ، رباعیات : ۲۰ ، قطع تاریخ فتح نواب رام پور -

زمانۂ تصنیف :

اس دیوان میں نواب رام پور کی فتح کے موقع پر کہا گیا ایک قطعۂ تاریخ ہے جس سے ۱۲۰۹ برآمد ہوتے ہیں (فتح آصف کی ہوئی دشمن بے دیں بھاگا) - اس سے ظاہر ہے کہ یہ دیوان ۱۲۰۹ھ کے قریب مکمل ہوا - تذکرۂ ہندی ۱۲۰۹ھ میں مکمل ہوا ، اس میں پہلے تین دواوین کا انتخاب ہے -

خطی نسخے :

۱ - رضالائبریری رام‌پور ۹۴۳ ، ۹۲۴ ، مکتوبہ ۱۲۱۱ھ - ترتیب غلط -

۲ - رضا لائبریری رام پور ۹۴۵ ، مکتوبہ ۱۲۴۲ھ - بخط غلام مہدی در لکھنؤ -

۳ - رضا لائبریری رام پور ۱۵۹ - غلط نسخے کی نقل -

۴ - خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، مکتوبہ ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ع -

۴ - پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ، مکتوبہ ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۷-۴۸ع (مشمولہ کلیات) -

دیوان چہارم :

غزلیات : ۵۳۲ ، رباعیات : ۲۵ ، مثلث : ۲ ، مخمس : ۴ ، مسدس : ۴ ، (ایک مسدس بطور استغاثہ آصف الدولہ کی خدمت میں پیش کیا تھا) ، مثنویات : ۴ ، قطعات : ۵ -

زمانۂ تصنیف :

یہ دیوان ۱۲۱۱ھ کے کچھ بعد مرتب ہوا - مصحفی نے اپنی خادمہ بی بولن کی دختر کی تاریخ وفات کہی ہے :

"داغ کیسا یہ دے گئی کلو -"

اس مصرع سے ۱۲۱۱ برآمد ہوتے ہیں -

خطی نسخے :

۱ - خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ، ۱۲۴۳ھ -

۲ - مولانا آزاد لائبریری ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ، تاریخ کتابت نا معلوم -

۳ - اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانۂ آصفیہ) حیدر آباد دکن - ترقیمہ موجود نہیں - یہ دیوان کا مکمل نسخہ نہیں ، مختصر انتخاب ہے - دیوان دوم کے ایک رام پوری نسخے پر جس طرح امیر و اسیر کی اصلاحیں ہیں ، اسی نوعیت کی اصلاحیں کی گئی ہیں -

بعض اشعار بالکل بدل دیے گئے ہیں ۔ کہیں متروک الفاظ کو خارج کیا گیا ہے ، کہیں تعقید کو دور کیا گیا ہے ۔ یہ اصلاحیں بہت بعد کی معلوم ہوتی ہیں ۔

دیوان پنجم :

غزلیات : ۳۳۲ ، رباعیات : ۲۴ ، سلام و ترویج : ۱۲ ، مثنوی گلزار شہادت ، مثنوی مرغ نامہ ، مثنوی بحرالمحبت ، مثنوی جذبۂ عشق ، مثنوی ہجو قوم شیخ ، مرثیہ (مربع) ۔

زمانۂ تصنیف :

۱۲۱۸ ہجری کے بعد ۔
اس دیوان میں ایک قطعۂ تاریخ شامل ہے :

کہ اس مصرعے میں ہیں تاریخ دو
''مظفر علی خاں کے بیٹا ہوا''

دوچنداں عدد ہیں تو ہے اور خوب
دو چنداں ہے اس ماہ کا مرتبا

دوسرے مصرع کے اعداد ۲۴۳۶ ہیں جنھیں دو سے تقسیم کرنے کے بعد ۱۲۱۸ حاصل ہوتے ہیں ۔
اس دیوان میں دو جگہ اپنی عمر ساٹھ سال بتاتے ہیں :

ہوئی بہ رنج و محن میری شصت سال کی عمر
لگے نہ تیر سی کیوں دل میں اس کماں کی عمر

کھایا ہے جوش شہد بلاغت میں شصت سال
معجون عقل آئی ہے تب کچھ قوام پر

خطی نسخے :

۱ - خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ، ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ع -

۲ - کتاب خانۂ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ - ترقیمہ موجود نہیں ہے -

دیوان ششم :

غزلیات : ۵۶۹ ، رباعیات : ۷ ، مخمس : ۱ ، مرثیہ : ۱ ، (دوبارہ) قطعات : ۶ -

زمانۂ تصنیف :

۱۲۲۴ ہجری (اس دیوان پر دیباچہ موجود ہے) -

اس کے علاوہ اسی میں جرأت کی تاریخ وفات : "ہوگئی کیا بلبل نالاں خموش" شامل ہے - اس سے ۱۲۲۴ اس طرح برآمد ہوتے ہیں کہ "ہوگئی" میں دوبار "ی" کے عدد شامل کیے جائیں - میر کی وفات کا قطعۂ تاریخ بھی اس دیوان میں موجود ہے :

از سر درد مصحفیؔ نے کہا
حق میں اس کے "موا نظیری آج"
۱۲۲۱ + ۴

یہ تاریخ غالباً دیوان کی ترتیب کے بعد کہہ کر شامل کی گئی ہے -

اس دیوان میں بھی اپنی عمر ساٹھ سال بتاتی ہے :

مصحفی ساٹھ برس تک یہی پاپڑ بیلے
ہم نے بھی دیکھے زمانے کے چلن کیا کیا کچھ

خطی نسخے :

اس دیوان کے بہت سے نسخے ملتے ہیں ۔ اکثر پر تاریخ کتابت درج نہیں ۔

١ ۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری مکتوبہ ١٢٤٣ھ ۔
٢ ۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری مکتوبہ ١٢٤٣ھ ۔
٣ ۔ رضا لائبریری رام پور ، ترقیمہ نہیں ہے ۔
٤ ۔ لکھنؤ یونی ورسٹی ٹیگور لائبریری ، ترقیمہ نہیں ہے ۔
٥ ۔ ہندو یونی ورسٹی لائبریری بنارس ، ترقیمہ نہیں ہے ۔
٦ ۔ ادارۂ ادبیات اردو ، حیدر آباد دکن ۔

دیوان ہفتم :

غزلیات : ٥٤٨ ، رباعیات : ٨ ، قطعۂ تہنیت عید غدیر بخدمت نواب کلب علی خاں (لکھنؤی) ، قطعہ غسل صحت میر فضل علی داروغۂ سرکار بادشاہ بیگم صاحب : ٢ ، مخمس : ٢ ، مثنوی : ١ ، سلام : ٤ ۔

زمانۂ تصنیف :

اس دیوان میں کوئی قطعۂ تاریخ موجود نہیں ۔ مندرجہ بالا قطعوں کی مدد سے زمانہ متعین کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے ۔

ایک بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ آخری دیوان ، جو وفات کے سبب نا مکمل رہا ، بہت مختصر ہے اور اس میں مشکل سے دو تین سال کا کلام ہوگا ، اس لیے یہ دیوان وفات (١٢٤٠ھ) سے بہت پہلے مکمل نہیں ہوا ۔

خطی نسخے :

۱ - خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ، ۱۲۴۳ھ -
۲ - پنجاب یونی ورسٹی لائبریری لاہور ، مشمولہ کلیات -

دیوان ہشتم :

غزلیات : ۱۴۴ ، رباعیات : ۲ سلام : ۱ -
زمانۂ تصنیف ۱۲۴۰ھ -

خطی نسخے :

صرف ایک نسخہ ملتا ہے -
خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ، ۱۲۴۳ھ -

دیوان قصائد :

حمد باری : ۱ ، نعت سید المرسلینؐ : ۴ ، منقبت حضرت امیرؑ : ۱۰ ، مدح امام حسینؑ : ۲ ، مدح زین العابدینؑ : ۱ ، مدح علی اکبر : ۱ ، مدح پیر فخر الدین : ۱ ، مدح جہاندار شاہ : ۲ ، مدح آصف الدولہ : ۶ ، مدح سیف علی : ۱ ، مدح نعیم خاں : ۲ ، نواب حسن رضا خاں : ۱ - محمد رضا خاں پسر حسن رضا خاں : ۱ ، بارگاہ قلی خاں : ۱ ، نواب محمد خاں : ۱ ، زین العابدین : ۱ ، آمد از دہلی : ۱ ، سیدی مہدی : ۱ ، مرزا جعفر : ۱ ، شہر آشوب دہلی : ۱ ، سلیمان شکوہ : ۹ ، مدح اسپ : ۱ ، انشاءاللہ خاں (کے متعلق) : ۲ ، صاحب عالم : ۱ ، خیالی رام : ۵ ، مرزا علی حسن : ۱ ، لالہ ٹیکا رام ۱ ، نسبت چند شخص : ۱ ، صفدر علی خاں : ۱ ، محمد تقی ہوس : ۳ ، بیان سردی : ۱ ، جواب انشا : ۱ ، جلال الدولہ ۱ ، جواب سودا : ۱ ،

کلب علی خاں : ۴ ، حیدر علی خاں : ۱ ، معتمد الدولہ : ۲ ، روشن الدولہ : ۳ ، ہادی علی خاں : ۱ ، فضل علی : ۴ -

زمانۂ تصنیف :

شروع سے آخر تک کہے گئے تمام قصائد یکجا کر دیے ہیں - دیگر دواوین میں قصیدے شامل نہیں ، سوائے دیوان چہارم کے ایک نسخے کے -

خطی نسخے :

۱ - نسخۂ عاصم امروہوی ، مکتوبہ ۱۲۳۹ھ (اس نسخے کے پٹنہ پہنچنے کی امید تھی) -

۲ - نسخۂ رام پور -

۳ - نسخۂ پٹنہ (نقل رام پور) -

۴ - نسخۂ حکومت بنگال -

۵ - پنجاب یونی ورسٹی لائبریری لاہور (مشمولۂ کلیات) -

نور نقوی

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

۱

لگے گر ہاتھ میرے تار اس زلفِ معنبر کا
تو ہووے باعثِ شیرازہ ، ان اجزائے ابتر کا

یہ دورِ مے کشی جب سے تری آنکھوں کو دیکھا ہے
ستارہ تب سے جوں خورشید گردش[1] میں ہے ساغر کا

وہ صیدِ سخت جاں ہوں میں کہ جس کی سخت جانی سے
ہوا جاتا ہے دم برگشتہ وقتِ ذبح خنجر کا

اڑے ہے بس کہ دل اندر ہوائے نامہ پردازی
ہر اک نالہ ہمارا بال ہے جیسے کبوتر کا

وہ خاکستر نشیں ہوں میں کہ مثلِ اخگرِ آتش
نہ مجھ کو فکر بالاپوش کا ہے اور نہ بستر کا

کلیجا چھن گیا ہے آہ و نالے سے مرا یاں تک
کہ اب جو دم نکلتا ہے تو جیسے دود مجمر کا

نہ ہوگی جاں کنی کے وقت ہرگز تشنگی غالب
کہ تو اے مصحفی مداح ہے ساقیِ کوثر کا

---

۱ - ہے گردش میں : ل ۱ -

۲

خداوندا ! نہیں مشتاق میں سرو و صنوبر کا
بہ روزِ حشر ہو سر پر مرے سایہ پیمبر[1] کا

گیا ہوں جان سے تو بھی تڑپ اک مجھ میں باقی ہے
خدا جانے کہ میں مذبوح ہوں کس دست و خنجر کا

پڑا رہتا ہوں اکثر راہ میں دامن درازوں کی
یہ سر مشتاق ہے کیا جانے کن پاؤں کی ٹھوکر کا

جوابِ نامہ تو معلوم اُس کے پاس سے آنا
کوئی پر اُڑتے اُڑتے شاید آ پہنچے کبوتر کا

غرض ہر وقت روتے ہی رہے ہم دل کے ماتم میں
نہ سوکھا ایک دم رومال اپنے دیدۂ تر کا

مری آنکھوں سے گر پڑتے ہیں آنسو بیچ مجلس کے
چھلکنا جب کہ ساقی مجھ کو یاد آتا ہے ساغر کا

کئی دن مصحفی ہمسائے ٹک سکھ نیند سوئے تھے
کیا نالوں نے تیرے[2] پھر بپا ہنگامہ محشر کا

۳

روز رومال نیا دیدۂ تر پر رکھّا
ایک پھاہا نہ میں ناسورِ جگر پر رکھّا

میں اسی رشک سے مرتا ہوں کہ کل غیر نے ہائے
ہاتھ ہنگامِ قسم کیوں ترے سر پر رکھّا

---

۱ - سمن بر : ل ۲ ، لیث ، فرحت -
۲ - میرے : ل ۲ -

جھڑ پڑا داغ ، چمن میں جو کوئی لالے کا
ہم نے وہ داغ اٹھا اپنے جگر پر رکّھا
کیوں نہ دل دبکھا اسے ہاتھ سے جاوے یک بار
ایسے ہی ناز سے جب[1] اُن نے کمر پر رکّھا
کیا برا ہے[2] جو رہے **مصحفی** نت یاں بیٹھا
تم یہی جانیو دربان ہے در پر رکّھا

۴

جب سرِ انگشت کو میں دیدۂ تر پر رکّھا
نام آنسو نے مری سلک گہر پر رکّھا
مارے بے تابی کے آیا مرے منہ تک ہرچند
دستِ تسکیں میں بہت اپنے جگر پر رکّھا
اُس کی آنکھوں کو نہ دیکھا کبھی دیں داروں[3] نے
جرمِ نظّارہ عبث میری نظر پر رکّھا
تو بھی بےحد ہے دغاباز کہ کل وعدہ کر
غیر سے شام ملا ، ہم کو سحر پر رکّھا
کیا بچوں گا میں کہ دل کے مرے خمیازوں نے
ایک ٹانکا نہ مرے زخمِ جگر پر رکّھا
کیا کروں شکر ادا آپ کے آنے کا ، کہ رات
جو قدم تم نے کہ رکّھا مرے سر پر رکّھا

---

۱ - ہاتھ : ل ۲ -
۲ - کیا برائی جو رہے : ل۲ ، لیث -
۳ - غم خواروں : جواہرسخن ، ص ۵۷۸ -

مصحفی چاہیے کیا پھر آسے اٹھ چلنے کو
جس مسافر نے کہ دل اپنا سفر پر رکھا

۵

شب جو اس نے قدم اپنا مرے سر پر رکھا
میں نے سر پر سے اٹھا دیدۂ تر پر رکھا

تیرے بیٹھے جو ہمیں یاد بھی آیا کوئی کام
ہم نے موقوف اسے وقت دگر پر رکھا

چونک اٹھا وہ کہ تمھیں خیر ہے صاحب! اے واہ
شب جو میں دست خیال اس کی کمر پر رکھا

شوقِ نظارۂ دیدار نے تیرے شبِ دوش
تا سحر دیدۂ وا (؟) روزنِ در پر رکھا

چار ٹکڑے ہو مرے داغ کا آترا جو[1] کھرنڈ
نے کے لالے نے اسے اپنے جگر پر رکھا

کچھ ادا دیکھی کہ کل کھینچ کے اس کافر نے
نیمچہ مصحفیِ خستہ کے سر پر رکھا

٦

سو سو طرح کا حادثہ تجھ پر گزر چکا
پر اے دل! ایک روز کبھی تو نہ مر چکا

اتنا بھی خال و خط کا بنانا ہے کیا میاں
بس رکھیو آئنہ کہ[2] یہ مکھڑا سنور چکا

---

۱ - تھا : ل ۲ -
۲ - کہیں : ل ۲ -

قیمہ کرے گا کیا کہیں اب مجھ سے ہاتھ اٹھا
تا قبضہ نیمچہ تو ترا خوں سے بھر چکا
اس ہاتھ سے یہ دل نہ تسلی ہوا دریغ
سو مرتبہ میں دل کے اوپر ہاتھ دھر چکا

ق

اے یار! وقتِ چہرہ خراشی و مُو کنی[1]
کیا کیا نہ تیرے ہاتھوں سے مجھ پر گزر چکا
اک سر پہ خاک ڈالنی باقی رہی ہے سو
دیکھو گے شام و صبح کہ میں وہ بھی کر چکا
کتنا ہی میں بِساروں[2] اسے لیک **مصحفی**
نقشہ اگر یہی ہے تو جی سے بِسر[3] چکا

۷

آج کچھ سینے میں دل ہے خود بخود بیتاب سا
کر رہا ہے بے قراری پارۂ سیماب سا
جوں گلِ تر کیا ہی اس سے جھلکے ہے اس کا بدن
وہ جو پیراہن گلے میں اُس کے ہے اک آب سا

---

۱ - مے کشی : ل ۲ -
۲ - بسارنا (ہ) : بھلانا -
۳ - بسرنا (ہ) : گزرنا :

ماہ گزشتہ کا حال انشا کہوں سو کیونکر
مر مر بسر کیے ہیں دن اور رات تیسوں

انشا

یاد میں کس فندق[1] پا کی میں روتا ہوں[2] کہ آج
جو سرشک آنکھوں سے گرتا ہے سو ہے عناب سا

میں ہوں اور خلوت ہے اور پیشِ نظر معشوق ہے
ہے تو بیداری ولے کچھ دیکھتا ہوں خواب سا

کوزۂ دولاب[3] وش زیر و زبر ہیں آن میں[4]
جب تلک یہ آسماں گردش میں ہے دولاب سا

کل شبِ تاریک میں جوں ہی ہوا وہ بے نقاب
جلوہ گر روے زمیں پر ہوگیا مہتاب سا

کیا کہوں حسن و لطافت جامۂ شبنم سے ہاے
نکلا ہی پڑتا ہے وہ گورا بدن مہتاب سا

مصحفی کیوں لخت دل رونے کی کھاتا ہے قسم
ہے نمایاں کچھ تو آنکھوں میں تری خوں ناب سا

٨

جی جائے گا رائگاں کسی کا
یوں کرتے ہیں امتحاں کسی کا ؟

مکھڑے سے نقاب مت اٹھاؤ
کیا فائدہ ، ہو زیاں کسی کا

جز آہ وہاں کوئی کرے کیا
کچھ بس نہ چلے جہاں کسی کا

---

۱ - فندق (ع) : بیر کی برابر ایک سرخ پھل - (انگلیوں کی پوروں سے استعارہ)
۲ - میں رویا خون دل : ل ۲ -
۳ - دولاب (ف): رہٹ -
۴ - آدمی : پ ، ل ۲ -

ہو دیکھے فرشتہ اُس پہ عاشق
ہوتا ہے وہ بدگماں کسی کا ؟

آزردہ کرے ہیں اس طرح واہ
دل مفت میں او میاں ! کسی کا

اے مرغ چمن نہیں[1] ، نہ کر شور
میراث ہے گلستاں کسی کا

تا فصلِ دگر رہا نہ ہرگز
اس باغ میں آشیاں کسی کا

دیتے نہیں **مصحفی** پھر اس کو
دل لیویں جو یہ بتاں کسی کا

۹

شب کہ دل درد و الم سے سر بہ سر لب‌ریز تھا
شورِ محشر کی طرح ہر نالہ شورانگیز تھا

ان اداؤں کا کوئی ہمارا جیے کس طرح ہائے
یا ہے اب یہ گرم‌جوشی یا کہ وہ پرہیز تھا

ایک ہی تیشے میں سر فرہاد کا دو ہو گیا
کیا کرے فرہاد بےچارہ کہ تیشہ تیز تھا

نوبہاراں میں جو کرتے ہم بھی دعوائے جنوں
مثلِ گل چاکِ گریباں ہم کو دست‌آویز تھا

کی ٹک اک آبِ دمِ شمشیرِ قاتل نے کمی
ورنہ پیمانہ ہماری عمر کا لب‌ریز تھا

---

۱ - یہیں : ل۲ -

اولیاؤں کو بھی کھینچا اس نے آخر زیر تیغ
تو کہے وہ قاتلوں میں عصر کا چنگیز تھا
بے تہوں[1] کو **مصحفی** مطلق[2] نہ سوجھا ورنہ یاں
رنگِ خونِ دل مرا ہر اشک میں آمیز تھا

۱۰

عاشقِ بے دل تو مشتاقِ نگاہِ تیز تھا
ہاتھ میں گو اس کے یارو! نیمچہ رنگریز[3] تھا
اک نگہ کے بیچ جیسے نیم بسمل کر گیا
قہر تھا ، آفت تھا ، لڑکا تھا ، کوئی خوں‌ریز تھا
ہم نے بھی کچھ اپنی دانائی سے کی یہ راہ طے
ورنہ جو کانٹا تھا اس وادی کا سو سر تیز تھا
ایک دم میں کر دیا یوں اس کو شیریں سے جدا
خنجر شیرویہ کب کا دشمنِ پرویز تھا
وہ جو خط بھیجا تھا تو نے چاک کر میرے تئیں
میں جو دکھلاتا تو مجھ کو وہ ہی دستاویز تھا
گھر میں ہمسائے نہ سوئے ایک شب آرام سے
حسن اس رشکِ پری کا بس کہ عشق انگیز تھا
کہتے ہیں دیکھ اس کی صورت **مصحفی** کل مر گیا
کیا عجب اس کا کہ تھا بیمار و بدپرہیز تھا

---

۱ - بے تہ : بے اصل ، بے حوصلہ ، معمولی لیاقت والا ۔
۲ - مر کر (ہرگز ؟) : ل[۲] ، لیٹ ؛ ۔
۳ - خوں ریز : پ ، ل ۲ ۔

۱۱

کچھ اعتماد اُن کے نہیں ارتباط کا
ہرجائیوں سے فائدہ کیا اختلاط کا

کا ہے کو جا کے بیٹھوں میں واں کام کیا مرا
جس بزم میں کہ ذکر ہو عیش و نشاط کا

واشِد کی آسماں سے کچھ امید ہی نہیں
روزِ ازل سے بند ہے در اس رباط کا

مستی سے گو کہ میں دمِ شمشیر پر گروں
کب ہے خیال اُس کو مری احتیاط کا

گردوں پہ یہ شفق نہیں ، دیکھا تو **مصحفی**
خونِ شہاں سے سرخ ہے رنگ اس بساط کا

۱۲

جب سرِ زلفِ صنم خم کھا گیا
کام اک عالم کا برہم کھا گیا

کان میں پھونکی[1] جو میں اس کے وہ بات
آج تو سنتے ہی کچھ دم کھا گیا

میں ہوں کس گنتی میں از یک تا ہزار
گالیاں اُس کی تو عالم کھا گیا

تیغ سے اس کی کئے گھائل بہت
زخم ایسے پر کوئی کم کھا گیا

---

۱ - میں اس کے جب وہ بات : پ ، ل ۲-

مصحفی ایسا تھا کب زار و نزار
اس کے تئیں[1] پیارے ترا غم کھا گیا

۱۳

کام دل اپنا تو ہرگز نہ بتاں سے نکلا
کبھی نکلا بھی تو ہاں آہ و فغاں سے نکلا

تم تو کہتے تھے میاں ! دل ترا ہم پاس نہیں
سچ کہو کیوں جی بھلا اب یہ کہاں سے نکلا

یوں تہ برقع سے نمایاں جھلک اس عارض[2] کی
نور مہ پھوٹ کے جیسے کہ کتاں سے نکلا

دل میں کہتے تھے ملے یار تو کچھ اس سے کہیں
مل گیا وہ تو نہ اک حرف زباں سے نکلا

دوستاں ! مصحفیِ خستہ کی ٹک لیجو خبر
یہ دمِ سرد سا کیا اس کے دہاں سے نکلا

۱۴

جو دل اس کے کوچے سے آتا رہے گا
تو البتہ وہ تلملاتا رہے گا

پس از مرگ کیجو مری خاک تودہ[3]
کوئی تیر اس پر لگاتا رہے گا

---

۱ - بر وزن فاع -
۲ - کافر : پ -
۳ - تودہ (ف) : نشانہ بازی کے لیے مٹی کا ٹیلہ -

لگا تارِ جاں پر جو ناخن اجل کا
نہ[1] رشتہ رہے گا ، نہ ناتا رہے گا

نہ جاگیں گے خوابیدہ خواب عدم سے
اگر ایک عالم جگاتا رہے گا

گر اس فصلِ گل میں جیے گا دوانا
تو ہر سال دھومیں مچاتا رہے گا

یہ شرط مروت ہے اے بے مروت !
کہاں تک تو مجھ کو کڑھاتا رہے گا

جو ملنا ہے تجھ کو تو آ جلد مل لے
کہ پھر ہاتھ سے وقت جاتا رہے گا

نہ ہو مصحفی خصمیِ دل سے ایمن
رہے گا یہ جب تک ستاتا رہے گا

۱۵

ناگہ چمن میں جب وہ گل‌اندام آ گیا
گل کو شکستِ رنگ کا پیغام آ گیا

اٹھا جو صبح خواب سے وہ مست پُر خمار
خورشید کف کے بیچ لیے جام آ گیا

سوچے تھا اہلِ جرم سے کس کو کروں میں قتل
اتنے میں اس کو یاد مرا نام آ گیا

افسوس ہے کہ ہم تو رہے مستِ خوابِ صبح
اور آفتابِ عمر لبِ بام آ گیا

---

۱ - تو : ل ۲ -

ہے جائے رحم حال پہ یاں اس اسیر کے
جو گرتے ہی ہوا سے تہِ دام آ گیا

گو میں تڑپ تڑپ کے دی حسرت میں اپنی جاں
بارے ٹک ایک دم کو تو آرام آ گیا

سمجھو خدا کے واسطے پیارے! برا نہیں
دو دن اگر کسی کے کوئی کام آ گیا

در قطع کب کیا ترے کوچے سے مصحفی
گر صبح کو گیا وہیں پھر شام آ گیا

۱۶

دل تجھ کو دیا ، لے مرا غم خوار یہی تھا
پاس اپنے تو اے شوخ ستم گار! یہی تھا

دے داد مری ورنہ میں اٹھ بولوں گا قاتل
کل حشر کے دن بھی، مرا خوں دار[1] یہی تھا

بے رونقیِ سینہ میں اب کس کو دکھاؤں
داغوں سے بتاں کے کبھی گلزار یہی تھا

اب جس دلِ خوابیدہ کی[2] کھلتی نہیں آنکھیں
راتوں کو سرہانے مرے بیدار یہی تھا

دامن کو کیا رشک چمن خوب ہی ، شاباش
رونے کا حق اے دیدۂ خوں بار! یہی تھا

---

۱ - خوں دار (ف) : قاتل خوں‌دار کشتگان وفا غیر یار نیست
خونم حنائے پائے تو شد ، پائمال شد (تاثیر)

۲ - بیدار : پ ، ل ۲ -

لے چٹکی میں دل کھینچ لیا سینے سے اس نے
انصاف کرو تیر کا سوفار یہی تھا

بوسے کے عوض تم تو لگے گالیاں دینے
کل تم سے ہمارا میاں ! اقرار یہی تھا ؟

ابرو نے تری دل ہی پہ تلوار چلائی
یعنی صفِ مرداں میں نمودار یہی تھا

یوسف کو ترے حسن پہ دوں کیوں کہ بڑائی
اس کے بھی تو خال و خط و رخسار یہی تھا

اس کو میں جو دیکھا، مجھے شب اس نے تو بولا
لاؤ اسے ، کل بھی پسِ دیوار یہی تھا

بیزاری کے عالم میں کبھی آگے سے میرے
جاتا ہے تو کہتا ہوں ، مرا یار یہی تھا

میرا دلِ پُر داغ پسند اس کی نہ آیا
ہر چند متاعِ سرِ بازار یہی تھا

دیکھی جو مری نعش تو کر اس کو اشارہ
بولا کہ مری چشم کا بیمار یہی تھا

کیوں[1] مصحفیِ خستہ کے تئیں تو نے کیا قتل
کیا سیکڑوں عاشق میں گنہگار یہی تھا ؟

---

۱ - کیوں قتل کیا مصحفیِ خستہ کو تو نے : پ ، ل ۲ -

۱۷

گر اُس منھ سے برقع کبھی کھل گیا
تو دیکھو گے ، مہ خاک میں رل[1] گیا

رہے اس کے وابستہ عمرِ دراز
نہ ہم سے یہ سودائے کاکل گیا

گیا جان سے ایک عالم میاں !
و لیکن نہ تیرا تغافل گیا

رہا ہے کہاں ہم میں آرام و صبر
وہ طاقت گئی ، وہ تحمل گیا

ہمیں دے گیا داغ جاتے ہوئے
غرض اس گلستاں سے جو گل گیا

وہی رنگ گل ہے وہی چہچہے
چمن سے کہاں شورِ بلبل گیا

لگی چوٹ دل پر مرے ، باغ میں
سحر نالہ کرتا جو بلبل گیا

میں کہتا تھا عاشق نہ ہو **مصحفی**
'تو ایسی ہی باتوں میں تو گھل گیا

---

۱ - 'رل جانا (ہ) : مل جانا - آزاد نے اس محاورے پر مقامی (امروہہ کا) ہونے کا اعتراض کیا ہے ، لیکن یہ محاورہ مستند لغات مثلاً پلیٹس میں موجود ہے - میر نے کہا ہے :
ہر ذرہ خاک تیری گلی کی ہے **بےقرار**
یاں کون سا ستم زدہ ماٹی میں رل گیا

۱۸

اب تو پھر کوچے میں اس کے شور و شر رہنے لگا
روز اک بے چارہ یاں[1] آ کر کے مر رہنے لگا

یا تو آگے دیکھتے آئینہ شرماتے تھے تم
یا وہ اب تصویر سا پیش نظر رہنے لگا

یہ صباحت ، یہ لطافت ، یہ نزاکت ، تس پہ ہائے
آگے ہر اک کے کھڑا تو پیشِ در رہنے لگا

اس قدر پرچا[2] کہ گھر خوش ہی نہیں آتا اسے
دل اسی کوچے میں اب آٹھوں پہر رہنے لگا

چاکِ در سے جھانکنے کی تا اسے رخصت نہ تھی
یا سر اس کا اب سرِ دیوار پر رہنے لگا

ہائے کیا سر ماروں اے یارو! کہ اس سر کے تئیں
ساری ساری رات اب تو دردِ سر رہنے لگا

خشک ہونے کے قریب آیا تو تھا ٹک داغ دل
پھر نئے سر سے یہ کچھ ان روزوں تر رہنے لگا

مصحفی کو آگے یارو یوں کب آتی تھی غشی
اب تو کچھ دو دو پہر یہ بے خبر رہنے لگا

---

۱ - واں : ل ۲ -

۲ - پرچا لینا ، پرچانا : (ف) متعدی - مانوس کرنا - رام کر لینا - راضی کر لینا - [صفحہ ۷۵ ، حصہ ۲ ، نوراللغات]

۱۹

کیا جانے کیا کرے گا یہ دیدار ، دیکھنا
اک دن میں آئنہ اسے سو بار دیکھنا

کیسی ہے اس کی[1] ابروے خم‌دار دیکھنا
لینی ہے ، مول اس کی یہ تلوار دیکھنا

تنہا ہی جا بھڑا صفِ مژگانِ یار سے
کیا زور ہے یہ دل بھی جگردار[2] دیکھنا

یاں[3] حسن کو ہے عشق سے آفت لگی ہوئی
ظالم کوئی نہ ہو جو طرح دار دیکھنا

کھینچے ہیں اپنی اپنی طرف زلف و خال و خط
کتنے ہیں ایک دل کے خریدار دیکھنا

عالم کو اک نگہ سے[4] کیا تو نے قتلِ عام
ظالم ٹک اس طرف بھی تو یک بار دیکھنا

شاکی ہیں اس کے جان و دل و دیدہ سب بہم
کس کس کے ہے وہ درپے آزار دیکھنا

کچھ پھر تو لگ چلی ہے صبا اس کی زلف سے
مت ہو جو اس بلا میں گرفتار دیکھنا

کر زلف و خط یہی ہیں تو اک دن تو میری جان
عالم کو اس بلا میں گرفتار دبکھنا

---

۱ - کو : ل ۱ -
۲ - جگردار (ف) : بہادر۔
۳ - یاں جن کو ہے یہ عشق کی آفت لگی ہوئی : ل ۲ -
۴ - میں ل ۲ -

خواہی میں آب ، خواہ ہوں آئینہ ، ہر طرح
منظور ہے مجھے ترا دیدار دیکھنا

پھینٹا[1] رکھے ہے سر پہ تو وہ بھی ہے مک پلک
خوباں کی کج کلاہیِ دستار دیکھنا

جب دیکھا ہم نے اس کو تو مرہم کے ہم بچے
یعنی ہمیں نہیں ہے سزاوار دیکھنا

جاتی ہے ان کے ساتھ چلی جانِ عاشقاں
ان خوش‌قدوں کی خوبیِ رفتار دیکھنا

بہر خدا تم اس بتِ آشفتہ زلف کے
ٹک ڈھیلے پیچ و لٹ پٹی[2] دستار دیکھنا

اے مصحفی میں تجھ سے کہوں طرفہ ماجرا
سنتا ہے اس طرف کو ٹک اے یار دیکھنا

ق

لیکن بشرطِ آں کہ تجھے[3] ہے مری قسم
کیجو کسی سے اس کو نہ اظہار دیکھنا

کچھ ان دنوں میں آگو کی نسبت ترا رفیق
بےطرح ہو چلا ہے بد اطوار دیکھنا

باور نہیں ہے تجھ کو اگر میرا یہ سخن
تو آپ جا کے توبہ شبِ تار دیکھنا

---

۱ - پھینٹا (ہ) : دستار -
۲ - لٹ پٹی (ہ) : ٹیڑھی بانکی ، بے قرینہ -
۳ - میری ہی قسم : انتخاب حسرت -

دیوار و در پہ اس کے ٹک اک رکھ کے گوش و چشم
سنتا یہ حرف اور یہی اسرار دیکھنا
چھیڑے ہے اس کو غیر تو کہتا ہے اس سے یوں
کوئی کھڑا نہ ہو پسِ دیوار ، دیکھنا
پس اس طرح ہی یک دگر اس شمع رو کے تئیں
ہے ہر کسی سے گرمیِ بازار دیکھنا
اپنی طرف سے ہم تو میاں ! تجھ کو کہہ چکے
ٹک تُو بھی اپنے دل میں تو یک بار دیکھنا
یہ بات ہے مناسبِ غیرت کہ روز و شب
اس کو نشستہ در برِ اغیار دیکھنا
یا تو تُو اپنے دام میں لا اس کو صبح شام[1]
یا جا کے اور کوئی طرح دار دیکھنا

۲۰

ٹک دیکھتا تو جا ، ترا بسمل کدھر چلا
کر ذبح اس کو ہائے تو قاتل کدھر چلا
شرطِ وفا یہی تھی بھلا ، کوے عشق میں
تنہا تو مجھ کو چھوڑ کے اے دل ! کدھر چلا
مانندِ گردباد ہے کچھ رو بہ آسماں
آوارگانِ شوق کا محمل کدھر چلا
آنکھوں سے بحرِ اشک کو ہونے دے موج زن
ہم تجھ سے تب کہیں گے کہ ساحل کدھر چلا

---

۱ - آج کل : پ ، ل ۱ ، ۲ - صبح و شام : انتخاب حسرت ۔

دل تک پہنچ کے تُو نے کہا سوے کعبہ رو
اے مصحفی ! تو چھوڑ کے منزل کدھر چلا

۲۱

صحبت میں غیر کی نہ مرے یار ! بیٹھنا
بیٹھے بھی گاہے جا کے تو ہشیار بیٹھنا

یہ طرفہ اختلاط نکالا ہے تم نے واہ
آتے ہی پاس ، چٹ سے وہیں مار بیٹھنا

اٹھ جاویں ، گر تم ایسے ہی ہوتے ہو بد دماغ
لازم ہے تم کو ہم سے ہو بیزار بیٹھنا ؟

ہوجاویں گے اک آن میں رستے کے رستے بند
جا کر کہیں نہ تُو سرِ بازار بیٹھنا

وقتے کہ در کے آگے سے آن نے اٹھا دیا
کیا فائدہ دلا ! پسِ دیوار بیٹھنا

خواہی بر آب ، خواہ بر آتش ، ہمیں میاں !
جس جاگہ تو بٹھاوے گا ناچار بیٹھنا

بیٹھوں میں کیونکہ چین سے یارو ! کہ ان دنوں
خاطر سے لے گئی ہے وہ رفتار بیٹھنا

ہوں گرچہ بے گنہ پہ مجھے تیرے روبرو
سر کو جھکائے مثلِ گنہگار بیٹھنا

کیا یہ بھی چڑ نکالی ہے یوں میرے سامنے
آئینہ لے کے ہاتھ میں ہر بار بیٹھنا

اے مصحفی ! وہ دوست ہی دشمن ہے جان کا
تو اس کے پاس جا کے نہ زنہار بیٹھنا

۲۲

رونے سے سوزِ داغِ جگر دور ہو گیا
اس حق میں اشک مرہمِ کافور ہو گیا

کیا جانے ماہ تھا کہ کوئی آفتاب تھا
سارا گھر اُس کے آتے ہی پُر نور ہو گیا

اب در تک اس کے، اپنی رسائی ہو کس طرح
سب کوچہ دادخواہوں سے معمور ہو گیا

دینے لگا وہ جامِ تہی جب کہ غیر کو
پیمانہ کیوں نہ عمر کا معمور ہو گیا

آتے ہی اس نے مکھڑے پہ زلفیں جو کھول دیں
روزِ وصال بھی شبِ دیجور ہو گیا

شبنم کو کیا میں روؤں کہ اس گلستاں کے بیچ
جو گل کھلا سو کھلتے ہی کافور ہو گیا

واں اس کی چشم سے نہ بہا ایک قطرہ آب
یاں سینہ داغِ عشق سے ناسور ہو گیا

تھا شب کی مے کشی کا مجھے تا سحر صداع[1]
دیکھ آنکھیں اس کی اور بھی مخمور ہو گیا

تو بھی فرو ہوئی نہ ترش روئی شیخ کی
بھڑوا اگرچہ سوکھ کے اچور ہو گیا

اے مصحفی! چھپائے ہے کیا تُو[2] بھی عشق کو
یہ قصہ اک جہان میں مشہور ہو گیا

---

۱ - صداع (ع) : درد سر -
۲ - اب تو : ل ۱ ، ۲ -

۲۳

پاسِ وفا بتاں سے زبس دور ہو گیا
فریاد کرتے کرتے میں رنجور ہو گیا

جب آئنے سے اس نے منہ اپنا پھرالیا
آئینہ جیسے دیدۂ بے نور ہو گیا

پیرانِ مُوسپید سے گرمی نہ ڈھونڈیے
یعنی ہوا جو پیر ، سو کافور ہوگیا

خوش قسمتی تو دیکھ کہ سینے کے داغ پر
رکھا جو میں نے مشک تو کافور ہو گیا

اول تو تھا ہی اس کے تئیں اک غرورِ حسن
دیکھ آئنے کو اور بھی مغرور ہوگیا

ساقی خبر لے جلد کہ کل آئنے میں شوخ
آنکھوں کو اپنی دیکھ کے مخمور ہو گیا

تجھ کو بھی کتنا دعویٰ طاقت تھا مصحفی !
بس تُو تو اک ہی زخم میں سب چور ہو گیا

۲۴

دل و دماغ تھا کب ہم کو ایسی ذلت کا
خدا کرے کہ برا ہووے اس محبت کا

نہ بوسہ لینے کی کر مجھ پہ او میاں ! تہمت
وہ ہوگا اور کوئی شخص میری صورت کا

شب وصال گزر ہی گئی اک آن کے بیچ
پھر آیا دکھ مجھے دینے کو روز فرقت کا

جفائے یار سے گزری سو دل ہی پر گزری
زباں پہ حرف نہ آیا کبھو شکایت کا

نہ آفتاب چھپے ہے، نہ شام ہوتی ہے
یہ روزِ ہجر ہے یا رب! کہ دن قیامت کا

مرے جنوں پہ نپٹ تنگ ہے فضائے جہاں
مکان چاہیے اس کو بڑی فراغت کا

نہ دلبری، نہ ترحم، نہ لطف و نے اشفاق
ہو آشنا کوئی کیا ایسے بے مروت کا

نہیں ہے اور کوئی، اب تو آ، گلے لگ جا
ملے گا پھر نہ کبھی ایسا وقت فرصت کا

نہ جان اس کو تو اور[1] عاشقوں سا برجائی
ہے مصحفی تو گرو ایک تیری الفت کا

۲۵

مرا زخمِ جگر کاری ہے اس مرہم سے کیا ہوگا
موا اب میں تو، مت روؤ[2] کوئی، ماتم سے کیا ہوگا

اس اشک و آہ سے گر دل نہیں کھلتا[3] تو کشن میں
نسیمِ بوئے گل اور قطرۂ شبنم سے کیا ہوگا

رہا ہے کون عالم میں سدا، عالم یہ فانی ہے
گر اٹھ جاویں گے ہم بھی ایک دن عالم سے، کیا ہوگا

---

۱ - ہر بوالہوس سا برجائی : پ -
۲ - تو روؤ مت : ل ۲ -
۳ - لگتا : ل ۲ -

یہی تا ، روتے روتے جی ہمارا ڈوب جائے گا
اگر ہنس کر نہ بولو گے میاں ! تم ہم سے ،کیا ہوگا

ہمیں آگو ہی اپنا حوصلہ معلوم ہے ، سچ ہے
بغیر از نالہ و فریاد و زاری ہم سے کیا ہوگا

ڈبویا خانماں مردم کا ان راتوں کے رونے نے
خدا جانے اب آگے دیدۂ پرنم سے کیا ہوگا

ترا بیمار بچنے کا نہیں ، اتنا سمجھ لینا
کوئی دم اس میں گر آتا ہے تو اس دم سے کیا ہوگا

دلِ مرحوم پر اب صبر کرنا ہی مناسب ہے
نہ دھاڑیں[1] مار رو اے مصحفی ! اس غم سے کیا ہوگا

۲۶

خواب تھا یا خیال تھا ، کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا ، کیا تھا

میرے پہلو میں رات جا کردہ
ماہ تھا یا ہلال تھا ، کیا تھا

چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم
حسن تھا یا جمال تھا ، کیا تھا

شب جو دل دو دو ہاتھ اچھلتا تھا
وجد تھا یا وہ حال تھا ، کیا تھا

جس کو ہم روزِ ہجر سمجھے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا ، کیا تھا

---

۱ ۔ دھاڑیں مار کر رونا : زار زار رونا (نور اللغات) ۔

مصحفی ! شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا ، کیا تھا

۲۷

میں نے کس چشم کے افسانے کو آغاز کیا
جس کو سنتے ہی مری خواب نے پرواز کیا

شب وصل ایسے سے ڈھونڈے کوئی کیوں در واند
جن نے سو ناز سے اک بند قبا باز کیا

میں اس انداز کے صدقے کہ جو کی مجھ پہ نظر
دیکھتے ہی مجھے ان نے نظر انداز کیا

گر کرے ناز تو اس حسن پہ اپنے ، ہے بجا
کہ خدا نے بھی بنا تجھ کو بہت ناز کیا

مصحفی ! آفریں اس تیرے لب و لہجے پر
کہ فصاحت نے تری ہند کو شیراز کیا

۲۸

ملنے کا اس کے جب کبھی کچھ ہم نے ڈھب کیا
سو ناتوانیوں نے ہمیں جاں بہ لب کیا

کب وقتِ بوسہ آگے وہ دیتا تھا گالیاں
ہم نے ہی منہ لگا کے اسے بے ادب کیا

ہوں بس کہ صرف یاد میں میں اس کی ان دنوں
جو کچھ پڑھا تھا میں نے فراموش سب کیا

ضبطِ عشق نہ کیجو نظر اس مریض کی
مرنے بھی وقت جس نے نہ پانی طلب کیا

پیماں شکن تم اتنے تو آگے نہ تھے میاں !
جھوٹوں میں لیک نام کو مشہور اب کیا

دن عہد کر گئے تو نہ پھر رات کو ملے
آئے نہ دن کو چل کے ، جو اقرارِ شب[1] کیا

اے مصحفی ! وہ دم میں نہیں اپنا آشنا
تو نے جو اس کو راہ میں ٹوکا ، غضب کیا

۲۹

گو زخمی ہیں ہم ، پر اسے کیا غم ہے ہمارا
اب تک بنی نہ پٹی ہے نہ مرہم ہے ہمارا

جوں شمع سراپا ہیں زبس مائلِ گریہ
جو بال ہے ، مژگاں کی طرح نم ہے ہمارا

ٹک دیدۂ انصاف سے دیکھو تو عزیزاں !
معشوق بھلا اوروں سے کیا کم ہے ہمارا

دل جس کے تئیں دیجیے ایسا نہیں کوئی
یوں یار اگر پوچھو تو عالم ہے ہمارا

روتے ہیں کھڑے لاش پہ سب دیکھنے والے
یعنی کہ ترے کوچے میں ماتم ہے ہمارا

اٹھ جائیں گے رہنے کے نہیں کوے بتاں میں
عزمِ سفر اب یاں سے مصمم ہے ہمارا

---

۱ ـ اگر وعدہ شب کیا : ل ۲ ـ

اے مصحفی ! اب کوچے میں اس صبح[1] جبیں کے
نئیں[2] اور تو کوئی ، مگر اک دم ہے ہمارا

۳۰

ہر بات کے کہنے میں جو جاں کن ہے ہمارا
دم جانے ہیں ، یہ دل نہیں ، دشمن ہے ہمارا

پوشیدہ نہیں شمع صفت سوزِ دلِ زار
احوال غرض آپ پہ روشن ہے ہمارا

کیا جامۂ صد چاک کا ناصح ! تو سیے گا
ثابت نہ تو چولی ہے ، نہ دامن ہے ہمارا

زلف و خط و کاکل نے چرایا نہیں دل کو
وہ اور ہی ہے جس کے اوپر[3] ظن ہے ہمارا

انداز محبت کے کوئی سیکھ لے ہم سے
کہتے ہیں جسے عشق ، سو وہ فن ہے ہمارا

تکلیف نہ دے ہم کو تو گل گشتِ چمن کی
خود سینہ ترے داغوں سے گلشن ہے ہمارا

پھرتا ہوا آ جائے جو ایدھر سے تو ملنا
اے مصحفی ! اس کوچے میں مسکن ہے ہمارا

---

۱ - ماہ جبیں کے : ل ۱ -
۲ - زندہ نہیں کوئی ، مگر اک دم ہے ہمارا : ب -
ل ۱ میں شعر متن کے مطابق ہے مگر شروع میں 'زندہ' کا اضافہ ہے -
۳ - بروزن 'فعل' -

۳۱

تجھ[1] سے گو وہ ملا ! نہیں ملتا
زہر بھی تجھ کو کیا نہیں ملتا

جس کو وہ زلف مار ڈالے ہے
سر مو خوں‌بہا نہیں ملتا

اور سب کچھ ملے ہے دنیا میں
لیکن اک آشنا نہیں ملتا

دلِ دیوانہ رات سے گم ہے
کہیں اس کا پتا نہیں ملتا

شیخ کاہے سے اٹھ نکل باہر
گھر میں بیٹھے خدا نہیں ملتا

درد و غم کو بھی ہے نصیبہ شرط
یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا

ق

اک نے پوچھا کہ مصحفی سے بھلا
کیوں تو اے بے وفا ! نہیں ملتا

ہنس کے بولا کہ او میاں ! اس سے
کیا کروں ، دل مرا نہیں ملتا

---

۱ ۔ نسخۂ رامپور میں مصرعوں کی ترتیب غلط ہو گئی ہے ۔

۳۲

یوں تو دنیا میں کیا نہیں ملتا
پر دلِ با صفا نہیں ملتا

کشتۂ خنجرِ تغافل کو
جز نگہ خوں بہا نہیں ملتا

بت پرستی سے باز آ، اے دل!
بت کے پوجے خدا نہیں ملتا

دیکھے بت خانے سیکڑوں، کوئی
بتِ کافر ادا نہیں ملتا

جان میری! مجھے غنیمت جان
عاشقِ با وفا نہیں ملتا

جب[1] زمیں پر قدم رکھے ہے وہ شوخ
خاک میں دل مرا نہیں ملتا

ق

میں جو اس سے کہا، تو مجھ سے میاں!
عید کے دن بھی کیا نہیں ملتا؟

ہو کے رو کہنا وہ یوں لگا کہنے
کیا کرے کوئی، جا نہیں ملتا

بن نمک چھڑکے زخم سینے کے[2]
مصحفی کچھ مزا نہیں ملتا

---

۱ - یہ شعر پ و ل ۱، ۲ میں نہیں ہے۔
۲ - پر: ل ۲ -

۳۳

جامے کے بند جب وہ گلشن میں وا کرے گا
گل چاک اپنی جیبِ قبا کرے گا

تو آ کے پاس میرے اے شوخ ! کیا کرے گا
سچ ہے کہ غیر ہی سے مہر و وفا کرے گا

اے باغباں ! خوشی سے رہنے دے مرغِ دل کو
یہ بھی چمن میں گاہے نالہ کیا کرے گا

خورشید رو ہمارا جس سے ملے گا ہر صبح
دانستہ وہ نمازیں اپنی قضا کرے گا

دیکھے ہے کیا ، ہمیں بھی دے ڈال ایک بوسہ
حق ، اے سخی خدا کے ! تیرا بھلا کرے گا

غم خواریاں تمھاری یارو ! یہ سب مسلم
ہوتا وہی ہے لیکن جو کچھ خدا کرے گا

رو مصحفی کو بھی دے اے دلبر تمازی !
ہے شخص مستحق وہ تجھ کو دعا کرے گا

۳۴

اس کو منظور یاں نہ آنا تھا
تپ کا آنا بھی اک بہانا تھا

چشمِ بیمار یار ! سن تو بھلا
کیا مجھی کو یہ دن دکھانا تھا

یادِ ایامِ بےقراریِ دل
وہ بھی یا رب ! عجب زمانا تھا

اب کہاں ہم ، کدھر وہ کنجِ قفس
کوئی دن واں بھی آب و دانا تھا

ایسے بھولے قفس میں سیرِ چمن
کہ گویا[1] یاں ہی آشیانا تھا

دلِ صد چاک پر نہ کر تہمت
رات زلفوں میں تیری شانا تھا

مفت میں اس کی گالیاں کھائیں
مصحفی! تجھ کو غم ہی کھانا تھا

۳۵

ان آنکھوں سے آب کچھ نہ نکلا
غیر از خوں‌ناب کچھ نہ نکلا

بوسے کا کیا سوال ، لیکن
اس منہ سے جواب کچھ نہ نکلا

ہوئی[2] آنکھ سے دید وادید
پر دل کا حجاب کچھ نہ نکلا

جز تیری ہوا کے ، اپنے سر میں
مانندِ حباب کچھ نہ نکلا

کرتا تھا بہت سا مجھ پہ دعویٰ
پر وقتِ حساب کچھ نہ نکلا

---

۱ - بروزن علا ۔
۲ - باہم ہوئی یوں تو دید وادید : ل ۱ ۔

سینے میں جو دل کی کی تفحص[1]
جز دود کباب کچھ نہ نکلا

ہم سمجھے تھے جس کو مصحفی یار
وہ خانہ خراب کچھ نہ نکلا

۳۶

کشورِ دل کو خدایا ! ہے یہ کس نے لوٹا
اس میں جو گھر نظر آتا ہے سو ٹوٹا پھوٹا

اس گرفتار کے صدقے میں کہ اڑ کر ووں ہی
پھر گیا دام کی جانب جو قفس سے چھوٹا

دیدنی ہیں یہ غرض صانع قدرت کے رنگ
کیا ہی موقع پہ لگایا ہے ہر اک گل بوٹا

چرخ پر دیکھ کے نالے کو مرے کہتی ہے خلق
بان چھوٹا ہے کہیں یا کہ ہے تارا ٹوٹا

مصحفی! مر ہی گیا میں تو ادا دیکھ اس کی
جب ہتھیلی سے کل اس شوخ نے ماتھا کوٹا

۳۷

جس طرح ہاتھ سے اس بت کے مرا دل ٹوٹا
یوں کسی سنگ پہ زنہار نہ شیشہ پھوٹا

داغ اور آہ سے رہتی ہے سدا اس میں بہار
ہے ہمارے چمنِ دل کا یہی گل بوٹا

---

۱ - تفحص : تلاش و جستجو -

ہائے یہ زلف ہے ، یا دامِ بلا ہے یا رب !
جو پھنسا اس میں سو زنہار نہ جیتا چھوٹا

ترکِ چشم اُس بتِ کافر کی عجب رہزن ہے
سیکڑوں کے تئیں اک آن میں جس نے لوٹا

مصحفی! جس نے مرا حالِ دلِ زار سنا
رو دیا ، نالہ کیا ، سنگ سے سینہ کوٹا

۳۸

مجھے کر قتلِ ناحق ، دل‌ربا کے ہاتھ کیا آیا
گیا میں جان سے اُس بے وفا کے ہاتھ کیا آیا

ہمارے قتل کو وہ پنجہ خود دستِ حنائی تھا
ہمیں خوں میں ملا ، رنگِ حنا کے ہاتھ کیا آیا

کیا میرے تئیں برباد اُس نے کوہ و صحرا میں
اُڑا کر خاک کو میری ، صبا کے ہاتھ کیا آیا

خدا جانے ہے اے یارو! ہم اپنے درد سے خوش تھے
ہمارے درد کو کھو کر دوا کے ہاتھ کیا آیا

دعا ہر چند کی اے مصحفی ! ہم نے ولے آخر
تہی دستی سوا ، دستِ دعا کے ہاتھ کیا آیا

۳۹

نقاب افگندہ از رخ جس طرف شب کو وہ جا نکلا
سرِ رہ ہوگیا روشن ، زمیں پر چاند سا نکلا

شکارِ دل کو ناحق ذبح کر کے ہاتھ سے کھویا
بھلا اس ناتواں میں ، کہہ تو اے صیاد ! کیا نکلا

ہوئی اک عمر مجھ کو اس سے کرتے نامہ پردازی
عبارت کا مری لیکن نہ اب تک مدعا نکلا

جو شیخ شہر آیا ہم سے اوباشوں کی مجلس میں
اگر دھولیں نہیں تو گالیاں دو چار کھا نکلا

دلِ گم گشتہ کی کل ہم نے اپنے فال دیکھی تھی
کریں اب کس پہ تہمت ، نام اُس میں آپ کا نکلا

میں ہوں اپنی شناسائی کا دیوانہ کہ مدت سے
سمجھتا تھا جسے بیگانہ ، سو وہ آشنا نکلا

نہ جانے مصحفی کو کیا کہا اے بد زباں ! تو نے
کہ تیری بزم سے شب سخت وہ ہو کر خفا نکلا

۴۰

شرمندہ نہ تھا نالۂ شبگیر اثر کا
طالع نے کیا ہے اسے نخچیر اثر کا

جاتی ہے فلک پر جو مری آہِ مسلسل
در جا کے ہلاتی ہے یہ زنجیرِ اثر کا

اک بٹ[1] سی ہے نالے میں مرے خونِ جگر کی
کچھ رنگ تو رکھتی ہے یہ شمشیر اثر کا

---

۱ - پٹ (ہ) : محلل - ٹھنڈک کو انکھڑیوں کی وہ تربھلا لگ دو
جس میں کہ آنولے (کی) پٹ ہو نہ ہو بھیڑا -- انشا
بُٹ (ہ) : مؤنث - شائبہ، بو ، آمیزش، چاشنی ، خمیر ، رشک -
اتنی پٹ ایمان کی رکھتا نہیں میں بد قماش
جتنا کالے کپڑے میں رہ جاتا ہے دھبا سفید
(نوراللغات جلد ۲ ، صفحہ ۵۴) ادارہ

مت پھیرؔ ہو رستے میں مرے پیکِ دعا سے
منھ پھیر دے ایدھر کو جو تاثیر، اثر کا

نالہ مرا کرتا تو ہے تسخیر اثر کو
پر آپ ہی ہو جائے ہے تسخیر اثر کا

شب مرغ سحر خواں کی جو آواز سنی میں
سنتے ہی لگا دل میں مرے تیر اثر کا

نالہ ترے بیمار کا جاوے گا فلک تک
منہ اس کو دکھاوے گی جو تقدیر اثر کا

اے مصحفی کرتا تھا رقم جب یہ غزل میں
جنبش میں قلم تھا دمِ تحریر اثر کا

۴۱

تم بانکپن یہ اپنا دکھاتے ہو ہم کو کیا
قبضے پہ ہاتھ رکھ کے ڈراتے ہو ہم کو کیا

آنکھیں تمھاری جھپکے ہیں ایدھر کو بیش تر
تم ان اشارتوں سے بلاتے ہو ہم کو کیا

آویں ہماری گور میں گر منکر و نکیر
اتنا[1] کہیں، ابھی سے اٹھاتے ہو ہم کو کیا

لا کر کبھی دیا ہے کوئی پھول پھل ہمیں
تم سیر گلستاں کو[2] جو جاتے ہو، ہم کو کیا

کہتے ہو ایک آدھ کی ہے میرے ہاتھوں موت
ہم بھی سمجھتے ہیں، یہ سناتے ہو ہم کو کیا

---

۱ - جاؤ : ل ۲ -
۲ - میں : پ، ل ۱، ۲ -

۳۵

ہم سے تو اب تلک وہی شرم و حجاب ہے
گر ہر کسی کے سامنے آتے ہو ہم کو کیا

کہتے ہو روز ہم سے یہی ، کل کو آئیو
کیا خو نکالی ہے یہ ستاتے ہو ہم کو کیا

دینا ہے کوئی بوسہ تو دے ڈالیے میاں
کیوں پاؤں توڑتے ہو پھراتے ہو ہم کو کیا

لے لے کے نام اس کی جفاؤں کا مصحفی
ہم آپ جل رہے ہیں ، جلاتے ہو ہم کو کیا

۴۲

یہ چاک گریباں تو داماں سے گزرا
میں شوریدہ ایسے گریباں سے گزرا

اگر درد دل میں یہ لذت ہے یارو !
تو میں ان طبیبوں کے درماں سے گزرا

کسی اپنے دشمن پہ ہرگز نہ گزرے
جو مجھ پر جدائی یاراں سے گزرا

وہیں جی اٹھے وہ جو مردے پڑے تھے
تماشا کناں جب وہ زنداں سے گزرا

نہ دشت محبت کو سرسبز دیکھا
کئی بار خضر اس بیاباں سے گزرا

لگا تیر ایسا مرے دل میں اس کا
کہ دل تا بہ سوفار ، پیکاں سے گزرا

ہوئے فرش ، گل اس کے ہر ہر قدم پر
جو دامن کشاں وہ گلستاں سے گزرا

یہ شکوہ رہا مجھ کو تجھ سے تو قاصد
نہ ہو کر کبھی کوے جاناں سے گزرا

میں اک نالہ ایسا کیا کل چمن میں
کہ شعلہ سا برگِ درختاں سے گزرا

صد احسنت اس کشتۂ بے اجل پر
جو الفت میں تیری ، دل و جاں سے گزرا

ہوئی مصحفی پر عجب رقت اس دم
وہ مسکیں جو گورِ غریباں سے گزرا

۴۳

احوال پریشاں ہے گلستاں میں صبا کا
کیوں ہاتھ گیا گل کے گریباں میں صبا کا

یارو یہ جو آتی ہے ہوا پانی سے لگ کر
مشتاق ہے دل موسمِ باراں میں صبا کا

ہم تک بھی کوئی[1] لاتی ہی وہ برگِ گل افسوس
روزن سے گزارا نہیں زنداں میں صبا کا

ایسا نہ ہو شانے سے کہیں ہووے لڑائی
الجھا ہے دل اس زلفِ پریشاں میں صبا کا

شاید کہ مرا غنچۂ دل آ کے کھلا دے
میں چشم بہرہ ہوں شب ہجراں میں صبا کا

اس طفل کو لکھ بھیجنے ہم بھی کوئی پرزہ
ہوتا جو گزر اس کے دبستاں میں صبا کا

---

۱ - صبا : ل ۱ -

اے مصحفی! جب خاک مری اس نے اُڑا دی
کیا کام ہے پھر کوچۂ جاناں میں صبا کا

۴۴

زلفوں سے اُس کی میں نے جس دن نہ ہاتھ دھویا
ابرِ سیاہ آ کر تربت پہ میری رویا
اس کے مزار پر تو آنا روا ہے اک شب
حسرت کو اپنے دل کی جو ساتھ لے کے سویا
شوخی تو دیکھ اُس کی کل چٹکی لیتے لیتے
چٹکی کے ساتھ، دل میں ناخن مرے گڑویا
تا بات کھل نہ جاوے لوگوں کے ڈر کے مارے
جو خط لکھا سو میں نے پانی ہی میں ڈبویا
تیرے شہیدوں کے ہم از بس مزاج داں تھے
تربت پہ ہم نے اُن کی یک لخت لالہ بویا
جن گلیوں میں ملک کا ہوتا نہیں گزارا
اُن گلیوں میں پھرے ہیں ہم چشمکوں کے جویا
اے مصحفی! میں بیٹھ اب کیوں نہ خاک چھانوں
دل سا عقیق میں نے اُس کی گلی میں کھویا

۴۵

اے عشق! تو کامِ دل ناکام نہ دینا
اس دل کے تئیں ایک دم آرام نہ دینا
کام اس کا ہے عاشق کے تئیں کام نہ دینا
تڑپانا جدائی میں اور آرام نہ دینا

اس چپ کا میں دیوانہ ہوں کیا قہر ہے اے وائے
اس لطف پہ میرے تئیں دشنام نہ دینا

ملزم تری باتوں سے ہمیں آپ ہی ہونا
اور تجھ کو کسی بات میں الزام نہ دینا

شیوہ ہے یہی اس کا کہ خورشید کے مانند
رو صبح جو دینا ، تو ہمیں شام نہ دینا

ٹک کنج قفس میں بھی سکوں کیجیو بلبل
جی اپنا تڑپ کر کے تہِ دام نہ دینا

جانے کا جو دل قصد کرے اس کی گلی میں
فرصت اسے اے گردشِ ایام نہ دینا

کچھ یہ بھی عداوت ہے کہ جب ہو مری نوبت
ساقی سے یہ کہتے ہو ، اسے جام نہ دینا

قاصد یہ غضب ہے کہ جب اس کُو میں پہنچنا
سب اپنی ہی کہنی ، مرا پیغام نہ دینا

اے **مصحفی**! یار آوے تو تو رویا ہی کیجو
بہتے ہوئے آنسو کو کہیں تھام نہ دینا

۴۶

کل ہمیں اس کی طرف دو شوق رہبر ہو گیا
دیکھنا اس کا جو مشکل تھا میسر ہو گیا

یا کوئی بالوں کی بو سے اس کی واقف ہی نہ تھا
یا کھلی جب زلف تو عالم معطر ہو گیا

خط سبزا نے ترے چہرے کا نکلا اور ہی رنگ
وون بھی بہتر تھا پر اب بہتر سے بہتر ہو گیا

لکھ کے نامہ ، نامہ بر کو جب لکھے ہم ڈھونڈنے
رنگ چہرے کا ہمارے خود کبوتر ہو گیا

قطرۂ خوں بھی نہ اپنا حلق میں اپنے گیا
ہم رہے لب تشنہ اور سیراب خنجر ہو گیا

عارض افروختہ کی اس کے لالی کیا کہوں
جس پہ ہر قطرہ عرق کا جیسے اخگر ہو گیا

کم ہے کچھ کندن سے کیا چہرے کا اس کے رنگ زرد
عشق کر کے مصحفی ! تو کیمیاگر ہو گیا

۴۷

جانشیں رخ پر ترے خط معنبر ہو گیا
اس برس کچھ جلد روز و شب برابر ہو گیا

اس قدر ہم سے خلش کی اس کی مژگاں نے کہ ہائے
ہر سر مو تن پہ اپنا نوک نشتر ہو گیا

رشتہ شیرازۂ اجزائے دل تھی اس کی زلف
وہ جو واں بکھری تو یاں یہ دل بھی ابتر ہو گیا

اشک کا قطرہ مری آنکھوں کی سرخی کے سبب
تھا اگر الماس تو یاقوت احمر ہو گیا

تھا اگر روز قیامت تو بھی ہم شاداں رہے
وہ جو اک دن اس کے ملنے کا مقرر ہو گیا

گر ہوس کی مے کی میں نے، اشک خونی سے مرے
آستیں کا حلقہ میری ، خوں کا ساغر ہو گیا

مصحفی کیوں ڈر چھٹے اب اس میں سوز داغ دل
چشمن کے ان پلکوں سے سینہ جیسے مجمر ہو گیا

۴۸

جب اس گل نازک کا دیدار نظر آیا
آنکھوں میں مری ہر گل جوں خار نظر آیا

یوسف کی خریداری آسان نہ تھی از بس
جب مصر میں پہنچے تب بازار نظر آیا

مے ٹپکی ہی پڑتی ہے آنکھوں سے تری کافر
تو آج بہت ہم کو سرشار نظر آیا

اس مست سلائیں[1] نے جب بھر کے نظر دیکھا
مجلس میں نہ پھر کوئی ہشیار نظر آیا

جھوٹے نہیں سچے ہو اس کوچے میں ہاں یارو
مجھ کو بھی چھلاوا سا اک بار نظر آیا

آنکھوں سے ہوئے جا کر ہم حلقہ بہ گوش اس کے
جب زلف کے حلقوں سے رخسار نظر آیا

یک بار وہ مجھ پر ہی خنجر کو چلا بیٹھا
اے دل! مجھے اب اس کا کچھ پیار نظر آیا

یارو کہیں دیکھی ہے ایسی بھی صفائے شست[2]
جو تیر لگا دل کے سو پار نظر آیا

کیا وصل میں پوچھے ہے رونے کا مرے باعث
دن مجھ کو جدائی کا اے یار! نظر آیا

جب رخنۂ دل سے میں سینے کی طرف جھانکا
داغوں سے مجھے سینہ گل زار نظر آیا

---

۱ - سرابی : پ - نہ لڑئیں : [illegible]
۲ - - ست : [illegible]

اے مصحفی ! آنکھوں کا کس کی ہے نظر کردہ
تو اب کے بہت مجھ کو بیمار نظر آیا

۲۹

کنجِ قفس میں جو کوئی مر گیا
ظلم بہ یارانِ دگر کر گیا

بھیجنے سے خط کے کچھ آیا نہ ہاتھ
ہاتھ سے برباد کبوتر گیا

قصہ کہوں کیا دلِ بیمار کا
عشق کی تپ تھی، نہ بچا، مر گیا

فتنے کا بھی پڑ نہ سکا واں تو پاؤں
وہ بھی ترے کوچے سے بچ کر گیا

اس نے نہ پوچھا مجھے تو کون ہے
جس کی اداؤں پہ میں مر مر گیا

نالہ مرے دل سے جو نکلا سحر
وہ بھی تو افلاک پہ مضطر گیا

روکھی سناتے ہو مجھے، واہ واہ
آپ کی باتوں سے میں کیا ڈر گیا

چلتی تھی تلوار، درِ عشق پر
پاؤں کے رکھتے ہی وہاں سر گیا

ساقی نے شیشے سے جو الٹی شراب
دیکھتے ہی جام کے دل بھر گیا

مصحفی کو دیکھتے تھے ہم بھی رات،
جب وہ تیری بزم میں چھپ کر گیا

۵۰

موسمِ گل کوچ مکر کر گیا
رنگِ بہاراں جو سفر کر گیا

سن کے مجھے کشتہ وہ آیا نہ پاس[1]
دور سے اک آ کے نظر کر گیا

بیٹھوں ہوں سر اپنا کہ مجھ کو وہ شوخ
جاتے ہوئے کیوں نہ خبر کر گیا

تعزیہ داروں کی یہ مجلس ہے ، یاں
جو کوئی آیا مژہ تر کر گیا

ماجرا لیلی کا سنا ہووے گا
عشق بلا ہے جب اثر کر گیا

خون میں لوٹوں ہوں کہ مجھ کو وہ شوخ
قتل بہ اندازِ دگر کر گیا

روز طرب گاہ وہ لایا بہ شام
گاہ شبِ غم کو سحر کر گیا

شمع صفت مصحفی اس بزم میں
جوں بنی ،ووں عمر بسر کر گیا

۵۱

عشق مجھے اہلِ بصر کر گیا
اشک کے قطرے کو گہر کر گیا

رہ گئے ہم سوتے ہی افسوس ہے
قافلۂ صبح ، سفر کر گیا

---

۱ - نہ آیا وہ پاس : ل ۱ ، ۲ -

لاشوں کے ستھراؤ[1] وہاں پڑ گئے
اک نظر آ کے وہ جدھر کر گیا

آ گیا میں سامنے اس کے تو وہ
دیکھ مجھے ، نیچی نظر کر ، گیا

کیوں کہ نکالوں ترے پیکاں کو
اب تو میرے دل میں وہ گھر کر گیا

آ کے مری خاک پر کل گردباد
دیر تلک خاک بہ سر کر گیا

دل نہ لگا اس کا کہیں ایک بار
جو ترے کوچے سے گزر کر گیا

یہ شب ہجراں ہے ، اسے آفریں
جو کوئی اس شب کو سحر کر گیا

یار مرے سر سے[2] نہ گزرا تو کیا
یار کا خنجر تو گزر کر گیا

صور اسرافیل ہے نالہ مرا
گور کے سوتوں کو خبر کر گیا

پیار تو آیا تھا مرے دل میں رات
پر میں تری وضع سے ڈر کر گیا

لشکر خط لے کے جو آیا وہ شوخ
کشور دل زیر و زبر کر گیا

---

۱ - ستھراؤ (ہ): فرش ، مقتولوں کے تودے -
۲ - ہی : ل ۲ -

چشم نے دکھلائی صفا شست[1] کی
تیرِ نگہ اپنا ہنر کر گیا

ہے وہ جہنم دلِ سوزاں مرا
جس سے جہنم بھی حذر کر گیا

خنجرِ مژگاں پہ گرا ٹوٹ کر
دل بھی مرا زورِ جگر کر گیا

دیکھیے اب زیست مری کیوں کہ ہو
زہرِ جدائی تو اثر کر گیا

رونے پہ آیا جو میں کل **مصحفی**
سیکڑوں رومال کو تر کر گیا

۵۲

دن رات نپٹ غم سے ترے نالہ کناں تھا
سچ کہہ تو مری جان کے دشمن! تو کہاں تھا

سوجھا نہ ہمیں خاک بھی کچھ بے بصری سے
یاں ورنہ ہر اک ذرے میں خورشید عیاں تھا

اس چال سے گزرا کہ کیا کتنوں کو پامال
معشوق نہ تھا یہ تو کوئی آفتِ جاں تھا

---

۱ - سبب (؟) ل ۲ -

جن روزوں کہ کھنچے تھا وہ بے تیر کبادا[1]
میرا دلِ خوں گشتہ تبھی اس کا نشاں تھا

معذور مجھے رکھیو تم اے قافلہ باشاں !
مانندِ جرس دل مرا لبریز فغاں تھا

ایسا ہی گیا جلد کہ پھر منھ نہ دکھایا
وہ سروِ رواں اپنی مگر عمرِ رواں تھا

جی دینے میں صرفہ نہ کیا ہم نے کسی سے
ہر چند کہ اس بات میں اپنا ہی زیاں تھا

میں جام بلوریں میں شراب اس کو پلائی
پیمانۂ گل جس کی نزاکت پہ گراں تھا

ہم سے خبرِ مصحفیِ خستہ نہ پوچھو
تم آپ ہی سوچو نہ میاں دل میں، کہاں تھا

۵۳

غیر ہی کو نت فلک نے اس کا ہم پہلو کیا
دوش کو میرے کب اس نے تکیۂ پہلو کیا

جب مصور نے لکھا گردہ[2] تری تصویر کا
لالہ و گل کرکے حل صرف اس میں رنگ و بو کیا

---

۱ - کبادہ : بہت نرم کمان - مشق کرنے کی کمان - رشک :
یاد مژگاں سے غم ابرو زیادہ ہو گیا
تیر تھا اب قدِ خم گشتہ کبادہ ہو گیا
(نوراللغات ، ج ۳ ، صفحہ ۱۲۷)

۲ - گردہ (ف) : نقاش کا خاکہ -

اب خیال اس کا نہیں چت[1] سے اترتا ایک دم
رفتہ رفتہ اس نے بھی[2] دل پر مرے قابو کیا

گوہرِ غلطاں کی شیخی خاک میں مل جائے گی
گر رواں ہم نے بھی پلکوں پر کوئی آنسو کیا

دل سے جو سوج اٹھی میرے اس کو نازِ عشق نے
چینِ پیشانی بنایا یا خمِ ابرو کیا

حلقۂ در سے رہیں آنکھیں لگی دو دو پہر
ہم نے جب اس کو تصور حلقۂ گیسو کیا

اس چمن سے ہم نہیں شرمندہ اک گل کے نسیم[3]
گو کہ اوروں نے دماغِ آرزو خوش بو کیا

چین سا جاتا رہا ہے دل سے میں حیران ہوں
اس نے کل آنکھیں لڑائیں مجھ سے یا جادو کیا

سوز دس صف کی صفیں اک آن میں اے **مصحفی**!
اس صفِ مژگاں نے اپنا جس طرف کو رو کیا

۵۲

جس کے[4] نہ لگا زخم تری کج نظری کا
کیا ہوئے الم اس کو خراشِ جگری کا

یہ کس کی ہے رفتار کہ صفحے پہ زمیں کے
ہر نقشِ قدم خاکہ ہے تصویرِ پری کا

---

۱ - جی: ل ۱، ۲ -　　۲ - ہے: ل ۲ -
۳ - کو: ل ۲ -　　۴ - ہوئے: ل ۲ -

کل قافلۂ نکہتِ گل ہوگ روانہ
مت چھوڑیو تو ساتھ نسیمِ سحری کا

کہتے ہیں جسے اہلِ جہاں شورِ قیامت
سو پیش قدم ہے وہ تری جلوہ گری کا

ہے جی میں کہ یک چند خبر اپنی نہ لیجے
کہتے ہیں کہ عالم ہے عجب بے خبری کا

از بس کہ عزیزوں نے مجھے دل سے بھلایا
خط مجھ کو نہ آیا کبھی یارِ سفری کا

پامال ہوا جائے ہے خورشیدِ درخشاں
ہے کفش پہ از بس کہ تری کام زری کا

نت[1] فرش زری بچھتے تھے دروازوں پہ جن کے
سو ان کو فلک نے کیا محتاج دری کا

اے مصحفی! میں خط تو لکھوں لیک وہاں تک
ہر مرغ کو ہے حوصلہ کب نامہ بری کا

۵۵

پونچھ کر آنکھوں کا کاجل یوں نہ بالوں سے لگ
اس سیاہی کو صنم ٹک اپنے گالوں سے لگ

آگہی کب تھی مجھے اس کی کمر ہے جیسے مو
ہاتھ یہ مضموں مرے نازک خیالوں سے لگ

---

۱ - فرش گلیم : ل ۲ -

رشک ہے جو اس کی سرخی پر لبِ سوفار کو
کس کا لوہو ہے ترے تیروں کے بھالوں سے لگا
شعلۂ جوالہ ہو جیسے بنہٹی[1] پر کہیں
آہ کا شعلہ پھرے ہے میرے نالوں سے لگا
اس قدر بھی راحت و آرام کا دشمن نہ ہو
مصحفیؔ! مت دل کو ان ترکیب والوں سے لگا

۵۶

کب میں نے کہا، تُو مجھے دیدار دکھا جا
ٹک آ کے پسِ پردہ سے[2] آواز سنا جا
ہے منزلِ مقصود ابھی دور، دوانے!
کیا دیکھے ہے سایے کو مغیلاں کے، چلا جا
مجروحِ تغافل نہ کر اے شوخ! تُو ہم کو
یوں جی میں جو آوے تو کوئی زخم لگا جا[3]
کر اپنے تئیں گم تو ذرا دشتِ جنوں میں
شاید کہ کوئی آ کے تجھے راہ بتا جا
ناصح سے یہ کہہ دو کہ گریباں کو میرے
پھر فصلِ بہار آئی ہے ٹک آ کے سلا جا

---

۱ - بنہٹی (ہ) : بنوٹ ۔
۲ - ہی : پ ، ل۱ ، ۲ -
۳ - ل ۲ میں یہ شعر زائد ہے :
کیا وضع تری ہے کہ میں جب آؤں ہوں تجھ پاس
منھ سے ترے سنتا ہوں یہی بات کہ جا جا
(انتخاب حسرت ، صفحہ ۹)

اے مصحفی! گردن کشی اس شوخ سے مت کر
جب کھینچے وہ تلوار تو گردن کو جھکا جا

۵۷

کوئی ہمیشہ گرفتار غم نہیں ہوتا
ستم تو ہووے ، ولے یہ ستم نہیں ہوتا

کرے ہیں عشق تو سب لیک نارسیدہ بہ کام
مری طرح سے کوئی متہم نہیں ہوتا

ہمارے قتل کو کھینچے ہے جب وہ تیغِ دو دم
غرض کہ ہم میں تو اس وقت دم نہیں ہوتا

ہے رت بہار کی اور باغباں کی مہلت ہے
گلاب باغ میں اب تک قلم نہیں ہوتا

حرم تلک جو پہنچتے بھی ہیں بہ صد محنت
تو ہائے ہم سے طوافِ حرم نہیں ہوتا

مرے مزار پہ دامن کشاں کب[1] آوے ہے
کہ میرے سینے سے شعلہ علم نہیں ہوتا

عدم وجود کی لازم ہے پر جو سچ پوچھو
وجودِ عاشقِ صادق عدم نہیں ہوتا

قدم دھرے ہے تو کب راہ میں کہ تیرا قد
قدم قدم پہ مری جان! خم نہیں ہوتا

طبیب نسخے بدلتے ہیں سیکڑوں لیکن
ہنوز دردِ دلِ خستہ کم نہیں ہوتا

---

۱ - کب آئے ہے یار : ل ۱ -

بارے قتل کی تدبیر میں رقیب اس سے
وہ شب ہے کون سی جب ہم قسم نہیں ہوتا
خدا کے واسطے اے مصحفی! تو کچھ لکھ دے
کہ میرے ہاتھ سے نامہ رقم نہیں ہوتا

۵۸

نظر آتا ہے یہ لونڈا مجھے ہرجائی سا
دیکھ اسے ہر کوئی ہو جائے ہے سودائی سا
کمیِ آب یہاں تک ہے جگر میں کہ اب اشک
نوک مژگاں سے گرے ہے تو کبھو رائی سا
دل جدھر جائے ہے میرا ، تری صورت کا خیال
ساتھ پھرتا ہے لگا اس کے ، تقاضائی سا
پھر بھی اے تیغ چمک جا کبھی بجلی سی کہ ہے
وا ہر اک زخم مرا چشمِ تماشائی سا
مصحفی سے تو میں واقف نہیں لیکن کوئی شخص
صبح سے[1] در پہ کھڑا ہے ترے ، مجرائی سا

۵۹

جن روزوں کہ رنگ آنکھوں کا اپنی جگری تھا
ہر لختِ جگر روکشِ گل برگِ تری تھا
یوں جاتے ہوئے کر گیا پامال جو مجھ کو
ہاں تھا تو وہ لڑکا ہی ، پہ تصویرِ پری تھا

---

۱ - کا : ب ، ل ۱ ، ۲ -

میں کر کے چلا باتیں، اور اس شوخ سے واں بھی
پوچھا جو کسی نے تو کہا، رہ گزری تھا

گل رشک سے جلتے تھے پڑے عود کے مانند
جن روزوں کہ جامہ ترے بر میں اگری تھا

وہ چھوڑ گیا مجھ کو بسِ قافلہ تنہا
جس ساتھ مجھے داعیۂ ہم‌سفری تھا

شب جس سے رہا دل میں مرے دغدغہ[1] افسوس
وہ صبح تلک مستِ مئے بے خبری تھا

پایا نہ تجھے **مصحفی** میں صبح کے ہوتے
اے سوختہ جاں! کیا تو چراغِ سحری تھا

۶۰

جدھر دیکھو ادھر چرچا ہے ان ہنگامہ سازوں کا
چلے فتنے کی یاں کیا، دور ہے دامن درازوں کا

قدیمی نازبردار آپ کو اب کب خوش آتے ہیں
پسند آتا ہے صاحب تم کو ملنا تونیازوں کا

وہ کب محوِ تماشائے مرقع ہووے، اے مانی!
نظر میں جس کی نقشہ کھب گیا جادو طرازوں کا

رواں ہو اشک جب پلکوں پہ میری تب ذرا دیکھے
نہ دیکھا ہو تماشا گر کسی نے شیشہ بازوں کا

---

۱ - دغدغہ (ع) : کھٹکا، ڈر -

وہ اوگھٹ[1] راہ ہے اے **مصحفی** ! دشتِ محبت کی
کہ سم[2] لیتا ہے مرکب جس زمیں پر یکہ تازوں کا

٦١

آگے مرے کسی نے ترا نام اگر لیا
اتنا میں مارے رشک کے تڑپا کہ جی دیا

پیارے یہ رنگِ پاں ہے لبِ لعل پر ترے
یا تو نے ذبح کرکے کسی کا لہو پیا

اس پیرہن سے مجھ کو تو آتی ہے بوے رشک
اے گل ! بتا تو کس نے ترا پیرہن سیا

تو بھی کبھی عیادتِ بیمارِ عشق کر
کہتے ہیں تیرے واسطے مر مر کے وہ جیا

اے **مصحفی**! تو جائے گا کیا اس کے رو بہ رو
تو نے تو اس کے کوچے میں آتے ہی غش کیا

٦٢

بنے کیا کیجیے اس جامۂ عریانی کا
شوق دل ہی میں رہا چاک گریبانی کا

چاہ سے آج زلیخا کو یہ مژدہ پہنچے
یعنی اب دلو[3] مکاں ہے مہِ کنعانی کا

---

۱ ۔ اوگھٹ (ہ) : ناہموار ، اونچی نیچی ۔
۲ ۔ سم لینا : ٹھوکر کھانا ۔
۳ ۔ دلو (ع) : ڈول ۔

شانہ زلفوں میں جو ہر دم تو کیا کرتا ہے
یہی باعث ہے مرے دل کی پریشانی کا

بارہا اشک کا دریا مرے سر سے گزرا
لیک ہرگز نہ مٹا خط مری پیشانی کا

کج کلاہی نہ گئی تا سر مژگاں اس کی
اشک ہے یا ہے یہ لڑکا کسی دُرّانی کا

ذبح کر رہتا ہے اک آدھ کو ہر صبح مدام
کس قدر شوق ہے اس بت کو بھی قربانی کا

کر سکے کیا کوئی اب جمع میاں مجھ کو کہ میں
ہوں پریشاں تری زلفوں کی پریشانی کا

اشک نے مجھ کو ڈبویا اسے تب چین آیا
تھا یہ اک عمر سے خواہاں مری ویرانی کا

ہم اسیروں کو قفس تنگ تر از بیضہ ملا
شوق جی ہی میں رہا بال و پر افشانی کا

چمن ہند میں بلبل ہیں ہزاروں لیکن
مصحفی شور ہے اب میری غزل خوانی کا[1]

٦٣

زیادہ قصد نہ کر عاشق آزمائی کا
کیا ہے کس نے بھلا امتحاں خدائی کا

یہ کیا ادا ہے کہ ہر دم کمر سے بندھتا ہے
کبھو دوپٹے کا پٹکا کبھو[2] دولائی کا

---

۱ - مصحفی شور ہے اب تیری زباں دانی کا - ل ۱ -
۲ - کبھی : پ ، ل ۱ -

خدا کے واسطے اب منہ پہ چھوڑ دے برقع
کہ بیش ازیں نہیں مقدور پارسائی کا

غرض کہ خوب‌رو سب بے‌وفا ہی گزرے ہیں
میں تذکرہ کروں کس کس کی بے وفائی کا

بہت رکھا مجھے زنداں میں عشق نے لیکن
علاج ہو نہ سکا اس سرِ ہوائی کا

رکھے ہے حکم خذف گوہر اس زمانے میں
زبس کہ گرم ہے بازار ناروائی کا

مرے مزار پہ رکھ دیجیو گلِ مہندی
کہ میں شہید ہوں اس پنجۂ حنائی کا

رہے ہے گل‌خس و خارِ چمن سے[1] چیں بہ جبیں
دماغ ہے اسے از بس کہ میرزائی کا

ہزار حیف کہ یہ وہ زمانہ آیا ہے
نہ آشنا کو نہیں پاس آشنائی کا

کسی سے مصحفی رکھتا نہیں میں دل میں غبار
کہ مثلِ آئنہ عالم ہے یاں صفائی کا

٦٢

چھپایا تم نے منہ ایسا کہ بس جی ہی[2] جلا ڈالا
تغافل نے تمہارے خاک میں ہم کو ملا ڈالا

کہے تو کھیل لڑکوں کا ہے یہ، یعنی مصور نے
جو نقش اس صفحۂ ہستی پہ کھینچا سو مٹا ڈالا

---

۱ - میں : ل ۲ -
۲ - کہ جی ہی کو جلا ڈالا : ل ۲ -

حجابِ عشق ہے ملنے سے[1] مانع ورنہ عاشق کو
رہی پھر شرم کس کی دل سے جب خطرہ اٹھا ڈالا

نہ اٹھّا حشر کو بھی اس کی تیغِ ناز کا مارا
کیا خوں اس نے اک عالم کا اور ووں ہی چھپا ڈالا

مرض تھا مصحفی کو صعب تر ، یہ خوب وہ سمجھا
کہ جوں توں آپ کو اس نے ترے کوچے میں لا ڈالا

٦۵

قاصد جب اس کے پاس مرا نامہ لے گیا
پوشیدہ کرکے سب سے وہ علامہ لے گیا

پایا نہ اس چمن سے[2] کسی نے لباس[3] عیش
جو گل گیا سو خوں میں ڈوبا[4] جامہ لے گیا

مطرب پسر کی دست‌درازی کو عشق ہے[5]
باتوں میں شیخ شہر کا عمامہ لے گیا

جو نالہ میرے دل سے اٹھا شورکرکے رات
وہ چرخ پر بھی حشر کا ہنگامہ لے گیا

ہر چند مصحفی میں جواہر رقم نہیں
پر موتیوں کی آب ، مرا خامہ لے گیا

---

۱ - میں : ل ۱ -

۲ - میں : ل ۱ -

۳ - لباس عشق (؟) : ل ۱ -

۴ - بر وزن فعل -

۵ - مطرب پسر کو دست درازی کی مشق ہے - حسرت
مطرب پسر کی دست درازی کو دیکھیے — ل ۲ -

٦٦

جوں سایہ اس کے پیچھے ہی[1] برسوں لگا پھرا
لیکن نہ اس کا رخ کبھی سوئے قفا پھرا
رویا چمن میں رات میں اتنا کہ جوں حباب
پانی میں آشیانۂ بلبل بہا پھرا
گردوں تمام جیسے کہ غربال ہو گیا
جب سے رخ اس کی پلکوں کا سوئے ہوا پھرا
زورآوری نہ کر کہ جو آیا غرور میں
مارا زمیں پہ اس کو فلک نے پھرا پھرا
مجنوں کو عشق لیلٰی نے آرام کب دیا
اک عمر کوہ و دشت میں روتا ہوا پھرا
مشتِ غبار اپنا تری جستجو کے بیچ
آوارہ ہو کے ہمرہِ بادِ صبا پھرا
میں جس کی راہِ شوق میں پامال ہو گیا
وہ بھول کر بھی خاک پہ میری نہ آ پھرا
مارا گیا گلی میں تری مصحفی دریغ
اس کشتنی کے سر سے نہ حکمِ قضا پھرا

٦٧

تو جس شب کہ جا غیر کے پاس سویا
میں تکیے سے تیرے، گلے لگ کے رویا
کروں کیسے شکوہ کہ دریائے خوں میں
مجھے دیدۂ تر نے میرے ڈبویا

---

۱ - میں : انتخاب حسرت ، صفحہ ۸ -

اٹھا کون سی صبح رنجور و خستہ
کہ میں آنسوؤں سے منہ اپنا نہ دھویا

نہ ہر اک کو پیارے دکھا وضع اپنی
کہ اس وضع کا ایک عالم ہے جویا

ترے ہاتھ دیکھے حنا سے بھی سادے
دل اپنے کو میں ہاتھ سے مفت کھویا

نہ سبزہ ہوا واں سے زنہار پیدا
میں جس خاک میں[1] اشک کا دانہ بویا

گیا **مصحفی** تیرا شور فصاحت
فلک تک تو ظالم فغانی ہے گویا

٦٨

مرا دل گیا جب سے زلفوں میں کھویا
میں کیا ایک عالم ہے اس دل کا جویا

مجھے خواب آرام اس رات آئی
کہ خنجر ترا میرے پہلو میں سویا

تجھے[2] جب کہ ہمزانوے غیر دیکھا
سر اپنا میں زانو پہ رکھ خوب رویا

نہ ہرگز ہوا سبز حرماں کے مارے
میں اس مزرعِ دل میں جو تخم بویا

کہیں **مصحفی** گریہ موقوف کر اب
کہ اس گریے نے ایک عالم ڈبویا

---

۱ - یہ: پ ، ل ۱ -
۲ - تجھے جب کہ ہمراہِ اغیار دیکھا : ل ۲ -

۶۹

منہ دیکھ کے یار آرسی کا
دشمن تو ہوا ہمارے جی کا

مشاطہ! سمجھ کے شانہ کیجو
اس زلف کا ہو نہ بال بیکا

سمجھے نہ وہ مومن اور نہ کافر
دل چاہیے اس کو ہو کسی کا

جی سے نہیں بھولتا ہے اب تک
کہنا ترا ہنس کے وہ[1] ''اجی'' کا

تھا آئنہ ہاتھ میں کہ ناگاہ
مغرور ہو اپنی نیکوی کا

شب ماہ کو دیکھ کر وہ بولا
ہے اس کا بھی کتنا حسن پھیکا

ظاہر میں ہے گو درست احوال
سی پارہ ہے دل تو مصحفی کا

۷۰

زلفوں کی درہمی نے برہم جہان مارا
پلکوں کی کاوشوں نے سینوں کو چھان مارا

ہرگز وہ دست و بازو ہلتے کبھی نہ دیکھے
جو تیر اس نے مارا سو بے کمان[2] مارا

---

۱ - وہ واہ جی کا : پ ، ل ۲ -
۲ - بے تکان : ل ۲-

سچا تو ہو گیا میں ٹک بارے عاشقوں میں
صد شکر مجھ کو تو نے کر امتحان مارا

کوئی کہاں تلک اب ان کی سنے نصیحت
بک بک کے دوستوں نے اپنا تو جان مارا

تھی وصل کی شب اور میں بے‌خود پڑا ہوا تھا
اتنے میں فوجِ غم نے تھانا سا آن مارا

جوں مرغ صبح بولا صدمہ یہ دل کو پہنچا
جیسے کسو نے میری چھاتی پہ بان مارا

تم کو بھی کچھ خبر ہے جب رات ہم نے آ کر
سر سنگِ آستاں سے اے میری جان! مارا

جو جامہ زیب گزرا مثلِ صبا ادھر سے
آتش پر اس نے دامن میری ندان مارا

ہر[1] یک نگاہ تو نے تیغ جفا علم کر
جس دن سے **مصحفی** کو اے بدگمان! مارا

لاشے پر اس کے ہر دم کہتے ہیں لوگ آ کر
کیا مفت میں گیا ہے یہ نوجوان مارا

۷۱

ذرا ہم سے بھی ملتے جائیے گا
کبھو تو اس طرف بھی آئیے گا

ہمارا دل ہے قابو میں تمھارے
بھلا جی کیوں نہ اب ترسائیے گا

---

۱ - پھر ؟ (فائق)

جو ہم رونے پہ آویں گے تو اے ابر
بجائے آب خوں برسائیے گا

بہار آئی تو اب کے ناصحوں کو
گریباں پرزے کر دکھلائیے گا

ق

کہا اے مصحفی میں اس سے اک دن
کہ بوسہ آج تو دلوائیے گا

جواب اس نے دیا مجھ کو کہ صاحب
کوئی یہ وقت ہے ؟ پھر آئیے گا

۷۲

نہ قطرہ[1] اشک نے مژگاں سے تار باندھ دیا
کٹھوت[2] میں گہرِ آب دار باندھ دیا

دھوئیں نے آہ کے میری کبھی جو سر کھینچا
زمیں سے تا بہ فلک اک غبار باندھ دیا

نہیں یہ آبلہ کام جرس میں آویزاں
کسی نے اپنا دلِ بے قرار باندھ دیا

نکلتے گھر سے کیا خون ایک عالم کا
کمر سے اس کی یہ کن[3] نے کٹار باندھ دیا

---

۱ - نہ اشک چشم نے : پ -

۲ - کٹھوت (ہ) : چوبی ظرف — کٹھوتی (ہ) : کاٹھ کا بڑا ظرف -
(نور اللغات)

۳ - کس : پ ، ل ۲،۱ -

فغاں کہ مرہم کافور کی جگہ ہم نے
نمک بہ روئے دلِ داغ دار باندھ دیا

ہر اشک کو مری مژگاں سے یوں علاقہ ہے
کہ جوں ستار کی کھونٹی سے تار باندھ دیا

در اس کا مجھ سے چھپا ہی رہا، کبھی تو نے
اٹھا کے پردہ نہ اے پردہ دار! باندھ دیا

ترے تماشے کو خلق آئی اتنی عید کے دن
کہ اک پرا سا سرِ رہ گزار باندھ دیا

فلک کو دیکھ تو اے **مصحفی** کہ صانع نے
عجب طرح کا یہ نقش و نگار باندھ دیا

۷۳

بس کہ ہر دم چاک تازہ، میں گریباں میں دیا
مجھ کو سودائی سمجھ یاروں نے زنداں میں دیا

موسمِ گل سچ ہے مر جانے کی جا تھی صحن باغ
اس لیے بلبل نے اپنا جی گلستاں میں دیا

ایک عالم مجھ کو پیارے زیرِ تیغ آیا نظر
سرمہ جس دم تو نے اپنی چشمِ فتاں میں دیا

کچھ بھی جمعیت ہوئی حاصل نہ ہم کو ہم نے ہائے
رائگاں دل خواہش زلفِ پریشاں میں دیا

اس کی طاقت تھی نہ ہرگز، بن کے شعلے کا حریف
مفت پروانے نے جی اپنا چراغاں میں دیا

جوں سرِ منصور یہ سر خود سزاے دار تھا
ہم نے اپنے سر کو ناحق عشق خوباں میں دیا

خاک گلیوں کی رہا بھر عمر سر پر چھانتا
ہاتھ سے دل جس نے بازی گاہ طفلاں میں دیا

عشق کی وادی سے کوئی[1] سالم نہ آیا **مصحفی**
ہم نے سب اسباب اپنا اس بیاباں میں دیا

۷۴

درمیاں میں نقاب کس دن تھا
میرے اس کے حجاب کس دن تھا

لطف کرتے تھے مجھ پہ تم ہر دم
جانِ من ! یہ عتاب کس دن تھا

آہ جاتی تھی سعی سے لب تک
نالہ پا در رکاب کس دن تھا

حادثے ہوتے تھے زمانے میں
اس قدر انقلاب کس دن تھا

کشور بخت تیرہ روزاں میں
جلوہ گر آفتاب کس دن تھا

کون رویا ہے ، گل کے چہرے پر
اس قدر آب و تاب کس دن تھا

مصحفی ! آج تو قیامت ہے
دل کو یہ اضطراب کس دن تھا

---

۱ - بر وزن فِع -

۷۵

دل چرانا یہ کام ہے تیرا
لے گیا ہے تو نام ہے تیرا

ہے قیامت بپا کہ جلوے میں
قامتِ خوش خرام ہے تیرا

جس نے عالم کیا ہے زیر و زبر
یہ خطِ مشک فام ہے تیرا

دید کرنے کو چاہئیں آنکھیں
ہر طرف جلوہ عام ہے تیرا

کس کا یہ خوں کہے تو آتا ہے
دامن افشاں تمام ہے تیرا

ہو نہ ہو تو ہماری مجلس میں
تذکرہ صبح و شام ہے تیرا

تیغِ ابرو ہمیں بھی دے اک زخم
سر پہ عالم کے وام ہے تیرا

تو جو کہتا ہے **مصحفی** ! ادھر آ
مصحفی کیا غلام ہے تیرا

۷۶

خط ترا مشکتاب[1] کس دن تھا
ابر میں آفتاب کس دن تھا

چاندنی تھی تمام شب گھر میں
ماہ زیرِ نقاب کس دن تھا

---

۱ - مشک : ب (ن) -

رات دن اپنے خوش گزرتے تھے
عشقِ خانہ خراب کس دن تھا

یوں تو تم مجھ سے منہ چھپاتے تھے
یہ کشش یہ حجاب کس دن تھا

تو ہی انصاف کر بھلا اے عشق
ہم پہ اتنا عذاب کس دن تھا

اس کو ہم مستِ حسن پاتے تھے
مستِ جامِ شراب کس دن تھا

زلف کی طرح اینٹھتے ہو کیوں
تم میں یہ پیچ و تاب کس دن تھا

موجد اس کام کا ہے تو ورنہ
قتلِ عاشق ثواب کس دن تھا

جس طرح تو نے منہ چھپایا یوں
لبِ بام آفتاب کس دن تھا

مصحفی تھا تو شیعہ مذہب لیک
نعرۂ بوتراب کس دن تھا

۷۷

میرا زانو دبا کے اٹھ جانا
صدقے ہے[1] اس ادا سے[2] گرمانا

اب نہ فرہاد ہے نہ مجنوں ہے
رہ گیا عاشقوں کا افسانا

---

۱ - میں (؟)—فائق -
۲ - کے : ل ۲-

رات کیا کیا صنم کی سیر ہوئی
نظر آتا تھا ایک بت خانا

نگہ آشنا نے اس کی کیا
ایک عالم سے مجھ کو بیگانا

قہر ہے اک تو ان کڑوں کی صدا
تس پہ پھر پاؤں کا بھی ٹھمکانا[1]

مل گیا کل تو اس نے دست بخیر
میرے اک پیش قبض[2] گزرانا

مصحفی ہوں ، یہ کام ہے میرا
تیری اک اک ادا پہ مر جانا

۷۸

ہے لالہ گوں شفق سے دامن جو آسماں کا
سب ماجرا ہے اپنی یہ چشمِ خوں فشاں کا

سرخی میں اس کے رخ کی زردی سی مارتی ہے
اس سال کچھ سنہرا ہے رنگ گلستاں کا[1]

کہتے ہیں آتشِ گل بھڑکے ہے پھر چمن میں
کیا جانے رنگ کیا ہو بلبل کے آشیاں کا

گہ دل میں گہ جگر میں وہ پیرتی رہے ہے
ہے سیرگاہ میرا سینہ تری سناں کا

---

۱ - دھمکانا : ل ۲ -
۲ - پیش قبض (ف) : مؤنث ، دہلی میں مذکر بھی ہے - کٹار -
اسلحہ کی ایک قسم - (نوراللغات ، ج ۲ ، صفحہ ۱۹۰)

بانگِ رسیدگاں سے گوشِ زمانہ کر ہے
منزل پہ شور دونا ہوتا ہے کارواں کا

جو تیر پھینکے ہے تو جاتا ہے دائیں بائیں
رخ پھر گیا ہے ہم سے ازبس تری کہاں کا

اِک[1] دار پر چڑھا ہے اک[2] تیغ تک رہا ہے
ہے گرم اس گلی میں بازار امتحاں کا

صیاد سے کہو ٹک ظالم ذرا خبر لے
احوال اب بتر ہے اس صیدِ نیم جاں کا

زردی کو میرے رخ کی جو دیکھے ہے کہے ہے
دیکھا نہیں ہے ہم نے یہ رنگ زعفراں کا

پاتا ہوں **مصحفی** کو میں ان دنوں مشوش
کیا جانے آ گیا ہے دل کس پہ اس جواں کا

۷۹

عالم ہمیں خوش آیا از بس کہ اس جہاں کا
آ کر عدم سے بھولے نقشہ بھی ہم تو واں[2] کا

کس کس کے سر بہ دیکھیں آتی ہے اب قیامت
نکلا ہے پاؤں باہر اس فتنۂ زماں کا

قبضے کی اوجھڑیں[3] تو میں کھائیں سیکڑوں پر
دیکھا نہ ہاتھ اٹھتا اس نازنیں جواں کا

---

۱ ، ۲ - کوئی : ل ۲ -
۲ - ہم وہاں کا : ل ۲ -
۳ - اوجھڑ (ہ) : ضرب ، چوٹ۔

پردے میں منہ چھپانا[1] چتون بھی پھر دکھانا[2]
قربان ہوں میں تیرے اس عشوۂ نہاں کا

گر دستِ تیغِ خوباں بے صرف کے بر آوے
آمادہ ہے یہ سینہ صد زخمِ خوں چکاں کا

کس زندگی کے اوپر فکرِ معاش کیجے
پڑتا نہیں بھروسا اس چشمِ ناتواں کا

چاروں طرف سے آتش دے دے تو مجھ کو اے عشق
کیا کام ہے جلانا اک مشتِ استخواں کا

البتہ **مصحفی** کو ہے ریختے میں دعویٰ
یعنی کہ ہے زباں داں اردو کی وہ زباں کا

۸۰

مشتاق ہی[3] دل برسوں اس غنچہ دہن کا تھا
یارو مرے اور اس کے کب ربط سخن کا تھا

واں بالوں میں وہ مکھڑا جاتا تھا چھپا کم کم
یاں حشر مرے دل پر اک چاند گہن کا تھا

تھے خط شکستہ کی رخسار ترے تعلیم
از بس کہ ہجوم ان پر زلفوں کی شکن کا تھا

پروانے کی ہمت کے صدقے میں کہ دی شب وہ
اس بے پر و بالی پر قربان لگن کا تھا

---

۱ - چھپایا : ل ۱ -
۲ - دکھایا : ل ۱ -
۳ - یہ : ل ۲ -

آخر کو ہمیں ظالم پامال کیا تو نے
اندیشہ ہمیں دل میں تیرے ہی چلن کا تھا

میں اس قد و عارض کو کر یاد بہت رویا
مذکور گلستاں میں کچھ سرو و سمن کا تھا

جوں اشک سر مژگاں ہم پھر نہ نظر آئے
از بس کہ یہاں وقفہ اک چشم زدن کا تھا

دو پھول کوئی رکھ کر گزرا تھا جو کل یاں سے
تربت پہ مری بلوا مرغانِ چمن کا تھا

جس مرغ چمن کو میں دیکھا تو چمن میں بھی
حسرت کشِ نظارہ اس رشکِ چمن کا تھا

شب دیکھ مہِ تاباں تھا مصحفی تو حیراں
کیا اس میں بھی کچھ نقشہ اُس سیم بدن کا تھا

۸۱

بھٹکا پھرے ہے تیری/دل/ اک ادا کا مارا
کہہ کس طرف کو جاوے اب یہ خدا کا مارا

زلفوں سے اُس کی اے دل ہے مجھ کو کیا سروکار
پھرتا ہوں میں تو آپہی اپنی بلا کا مارا

ہم حال دل کی اپنے تقریر کر رہے ہیں
وہ بولتا نہیں کچھ ہرگز حیا کا مارا

وہ صیدِ خوں گرفتہ جیتا بچا نہ ہرگز
جو صیدگہ میں آیا تیرِ قضا کا مارا

دیکھا جو خوں میں غلطاں مجھ کو تو لوگ بولے
یہ کشتہ ہے کسی کے رنگِ حنا کا مارا

پھٹکار سی کسی کی اس دل کو لگ گئی ہے
کیا جانے یہ پھرے ہے کس کی دعا کا مارا
کل مصحفیؔ کو میں نے کوچے میں اس کے دیکھا
ٹکڑے پڑا ہوا تھا تیغ جفا کا مارا

۸۲

عارض نہ تری زلفِ پریشان میں دیکھا
یوسف کو زلیخا کے میں زندان میں دیکھا
سر کھینچے تھا شعلہ سا مرے دل سے فلک تک
میں طرفہ تماشا شبِ ہجران میں دیکھا
ہرگز نہ رہا ہاتھ مرا جامہ دری سے
اک چاک نیا روز گریبان میں دیکھا
میں کوئی پسِ مرگ بھی آسودہ نہ پایا
عالم کے تئیں خوابِ پریشان میں دیکھا
گر تو بھی کرے سیر بیاباں کی تو سمجھے[1]
اک جذب عجب میں نے بیابان میں دیکھا
عارض پہ ترے صل علیٰ کیوں کہ نہ کہیے
اس رنگ کا اک گل نہ گلستان میں دیکھا
کاہے کو تعب کھینچے ہے اس دل کی صفا پر
آئینے نے کیا دیدۂ حیران میں دیکھا
جس کشتے کا دنیا میں کہیں کھوج نہ پایا
وہ کشتہ ترے چاہِ زنخدان میں دیکھا

---

۱ - دیکھے : ل ۲

باراں کی ہوا ، آب رواں ، لالے کا کھلنا
یہ رنگ ، شب اس دیدۂ گریاں میں دیکھا

ہو اشک ، ان آنکھوں سے گرے صبح کے تارے
موتی کے تئیں جب سے ترے کان میں دیکھا

کس رنگ کا تھا کشتہ کہ ایام بہاراں
بلبل کو تڑپتا میں خیاباں میں دیکھا

اے **مصحفی** ! افسوس کہاں تھا تو دوانے
کل اس کے تئیں ہم نے عجب آن میں دیکھا

۸۳

آویزۂ لعل اس کے جو میں کان میں دیکھا[۱]
صد لختِ جگر دیدۂ گریاں میں دیکھا

اللہ رے ترے حسن کے شعلے کی تجلی
یہ جلوہ نہ خورشیدِ درخشاں میں دیکھا

پھر جائے دل اس بت سے مرا پڑھتے ہی جس کے
ایسا تو کوئی سورہ نہ قرآں میں دیکھا

چھوٹا نہ تری قید سے جیتا کوئی ، ظالم!
لاکھوں کو سسکتا ترے زنداں میں دیکھا

مجنوں نے کیا آپ کو گم مارے خوشی کے
جب ناقۂ لیلٰی کو بیاباں میں دیکھا

مارے گئے اتنے کہ ہوئے لاشوں کے تودے
گھمسان بڑا عشق کے میداں میں دیکھا

---

۱ - نسخۂ پٹنہ میں یہ غزل نہیں ہے -

دل قطرۂ خوں ہو کے بہا چشم سے میری
جب تکمۂ لعل اس کے گریبان میں دیکھا

جس گل سے کہ دیتا میں ترے حسن کو تشبیہ
ایسا تو کوئی گل نہ گلستان میں دیکھا

دل لڑکوں کے پتھروں سے جو پاوے تھا ہمیشہ
وہ ذوق ترے تیروں کے پیکان میں دیکھا

جز سبز خطا کی نہ نظر اور کے اوپر
جب سبزے کو میں نے مہِ شعبان میں دیکھا

تجھ سا تو کوئی کج کلہ اے کافر ہندی!
شیراز میں دیکھا، نہ صفاہان میں دیکھا

اے مصحفی کہتا تھا میں تو اس سے نہ لک چن
دل لے ہی[1] گیا تیرا نہ اک آن میں دیکھا

۸۴

آتا ہے یاد مجھ کو خوں خوار کا لپٹنا
اور اس گلے سے اس کی تلوار کا لپٹنا

تم نازنیں جواں ہو مت چھیڑو دل جلوں کو
بگڑے تو پھر ستم ہے دو چار کا لپٹنا

رکھتا ہے میرے دل کو نت پیچ و تاب ہی میں
زنار سی کمر سے زنار کا لپٹنا

اس سادگی کے اوپر اک قہر ہے بلا ہے
برقع میں اس پری کے رخسار کا لپٹنا

---

۱ - دل لے کے گیا : پ -

مشاطہ ! دیدنی ہے موے کمر سے جا کر
اس زلف عنبریں کے ہر تار کا لپٹنا

مانند زلف خوباں از بس دراز ہے وہ
مشکل ہے عاشقوں کے طومار کا لپٹنا

لیے نو ہے تو مجھ سے اے زلف لیک اک دن
جی لے رہا ہے تیرا یہ پیار کا لپٹنا

زلف سیہ سے اس کی تو ہر حذر ہی رہیو
اے مصحفی ! بلا ہے اس مار کا لپٹنا

۸۵

ہجوم گریہ زبس رات چشمِ تر میں رہا
سحر کے ہوتے نہ اک قطرہ خوں جگر میں رہا

کبھی جو یار نے دزدیدہ مجھ کو دیکھا تو میں
امیدواریِ نظارۂ دگر میں رہا

دل و جگر ترے پیکانِ تیر کا گھر تھا
کبھو وہ دل میں رہا اور کبھو جگر میں رہا

خلش گئی نہ پس از مرگ بھی الم کی ترے
موے بھی ہم تو وہی نیشتر جگر میں رہا

نہ دیکھا مجھ کو کبھی اس نے آنکھ اٹھا اور میں[1]
تمام عمر تمناے یک نظر میں رہا

قلم سے کھینچ کے مانی ! مجھے دکھا دیں کے
کسی کے حسن کا نقشہ اگر نظر میں رہا

---

۱ - نہ دیکھا اس نے کبھی مجھ کو : پ۔

زبس کہ نالے کو شب اضطراب تھا تجھ بن
تمام رات دعاے اثر ، اثر میں رہا

ادھر سے میری نظر سیر ہی رہی کرتی
ادھر سے گرچہ ترا ہاتھ چاک در میں رہا

رہے گا تا بہ کمر خوں تری گلی میں میاں
اسی ادا سے جو خنجر تری کمر میں رہا

کِرا جو شمع پہ ، پروانہ جل کے یوں بولا
اُڑوں میں کاہے سے کیا خاک بال و پر میں رہا

تم اٹھ گئے جو میاں **مصحفی** کی بالیں سے
تمام رات پڑا ماتم اس کے گھر میں رہا

۸۶

وہ حسن جاتا رہا اس کا ، وہ گلو نہ رہا
وہ رنگ و بو نہ رہا اور وہ رو و مو نہ رہا

بہت کہا میں کہ اس شب تو وہ ُتو میرے پاس
مرے کہے کو نہ سمجھا وہ تند خو ، نہ رہا

پھر آفتاب بھلا روبرو ہو کس منہ سے
کہ آفتاب کا حسن اس کے روبرو نہ رہا

دماغ نے ہمیں سیرِ چمن کی رخصت دی
گلوں کے چہرے پہ وقتے کہ رنگ و بو نہ رہا

دیا فشار مرے دل کو عشق نے یاں تک
کہ اس میں خون۱ تو کیا رنگِ آرزو نہ رہا

---

۱ - عشق : ل۲-

نہ روے خوب پہ پھول اس قدر کہ دنیا میں
کوئی ہمیشہ مری جان ! خوب رو نہ رہا
مری اور اس کی یہ صحبت رہی کہ جب آیا
کبھو رہا وہ مرے پاس اور کبھو نہ رہا
وہ زخم کون سا آیا مرے کہ[1] سو سو بار
میان کشمکشِ مرہم و رفو نہ رہا
میں مصحفی تجھے پاس اُس کے چھوڑ آیا تھا
کچھ اس نے تجھ کو کہا کیا میاں جو تو نہ رہا

۸۷

وہ عشق و ولولہ و شورِ ہاے و ہُو نہ رہا
ہوے ضعیف ادھر ہم اُدھر وہ تُو نہ رہا
ہزار بار ہوا آئنہ مقابلِ یار
پہ تا بہ دیر کبھی اس کے روبرو نہ رہا
گیا جو باغ میں تو سیر گل کو ، دیکھ تجھے
چمن میں گل نہ رہا ، گل میں رنگ و بو نہ رہا
ہزار جا سے ہوا بس کہ یہ گریباں چاک
کہ جیبِ گل کی طرح قابلِ رفو نہ رہا
میں بس کہ گریے سے کل مشق آب پاشی کی
کہ لوحِ دل پہ کوئی حرفِ آرزو نہ رہا
میں تیرے روے مخطط پہ سخت حیراں ہوں
خط آئے پر کوئی اتنا تو خوب رو نہ رہا

---

۱ - کہ رات اور دن : پ

بہار عمر میں اے مصحفی! تو پی لے شراب
کہ کوکنار کے کاندھے پہ نت سبو نہ رہا

۸۸

ہو کیوں نہ تشنۂ خوں وہ ہم سے بے بسوں کا
ہے تیغ کا سا جوہر سبزہ ترے مسوں کا
ناخن بہ دل زن ازبس تھیں انگلیاں صنم کی
سینے پہ میرے نقشہ ہے اب تلک دسوں کا
زلفوں نے اس کی ہم کو زنجیر کر رکھا ہے
بس کیا چلے ہے ان سے ہم جیسے بے بسوں کا
ہے تختہ بند انساں ہیکل میں استخواں کی
کم از رسن نہیں کچھ یہ جال سا نسوں کا
جیتا تری گلی میں پہنچا نہ مصحفی ہائے
آخر ہوا وہ طعمہ صحرا میں کرگسوں کا

۸۹

دیدۂ بے دید دشمن ہو گیا
مجھ کو اک نظارہ رہزن ہو گیا
ہم جہاں روئے ذرا خوں بیٹھ کر
اس زمیں کا تختہ گلشن ہو گیا
صبح ہوتے جوں[۱] دیا منہ اس نے کھول
مطلع خورشید روشن ہو گیا

---

۱ - جب : پ

میں وہ دوزخ ہوں کہ آتش پرمری
آب بھی چھڑکا تو روغن ہو گیا

کس کی مژگاں شب خدنگ انداز تھیں
سینۂ افلاک روزن ہو گیا

وسعتِ دستِ جنوں کے ہاتھ سے
اب گریباں جیسے دامن ہو گیا

مصحفی پھر جان کا کیا ہے دریغ
جب فدائے دوست تن من ہو گیا

۹۰

دوست تھا اپنا سو دشمن ہو گیا
راہبر قسمت سے رہزن ہو گیا

سنگِ دل تیرے کی سختی سے میاں[۱]
اب تو دل اپنا بھی آہن ہو گیا

شمع پردے میں جلی تو کیا ہوا
ہم پہ سب احوال روشن ہو گیا

پردۂ دل میرا چھلنی کی طرح
چھن کے ان پلکوں سے روزن ہو گیا

آتے آتے تک مرے لب پر دریغ
نالۂ شادی بھی شیون ہو گیا

جب دیا چاک گریباں اس نے کھول
دامن نظارہ گلشن ہو گیا

---

۱ - یہاں : ل ۲ -

مصحفی ! تھا تُو تو دریانوش واہ
اک ہی پیالے میں اٹیرن[1] ہو گیا

۹۱

میاں ! تم ہم سے نت کرتے ہو رم کیا
تمھیں ایسے برے لگتے ہیں ہم کیا
ستم کرتے رہے تم اور ہم نے
نہ جانا یہ کہ ہوتا ہے ستم کیا
قد نازک نہال اس شاخ گل کا
ہوا سے دیکھیو کھاتا ہے خم کیا
رگِ گل کر دیا موے کمر کو
کرے کام اس سے نازک مو قلم کیا
تری آنکھوں کی کیفیت کے آگے
مری آنکھوں میں ٹھہرے جام جم کیا
صمد سے پھر گئیں ناہد کی آنکھیں
نظر آیا کوئی کافر صنم کیا
بہت دم باز میں دیکھے ہیں ایسے
مجھے باتوں میں تم دیتے ہو دم کیا
قسم کھاتے ہو میرے سر کی جھوٹی
میاں ! جاؤ بھی جھوٹوں کی قسم کیا
نہیں آتے جو اب پلکوں پہ آنسو
جگر سب ہو گیا اے چشمِ نم کیا

---

۱ - اٹیرن ہونا (ہ) چکرا جانا ۔

نہیں آتا سرِ تیر اب جو کوئی
سبھی مارے گئے صیدِ حرم کیا
جو قُد[1] ہیں مصحفیؔ شاعر ہیں وے لوگ
ہماری شاعری کیا اور ہم کیا

۹۲

ترچھے قدم کے پڑتے کل جوں قد اس کا لچکا
پہنچا تلے زمیں کے مُردوں کے دل کو دھچکا
کہیے جو جھوٹ تو ہم ہوتے ہیں کہہ کے رسوا
سچ کہیے تو زمانہ یارو ! نہیں ہے سچ کا
اب دیکھو تو قلعی[2] سی ان کی ادھڑ گئی ہے
تھا جن عمارتوں پر دلی کی کام گچ کا
گھوڑے کی ٹاپ اس کی جس دم لگی زمیں پر
زیرِ زمیں کلیجہ گاوِ زمیں کا دھچکا

---

۱ - قد : بڑے استاد ، بہت گھرے -
ہیں گین باز ایک کھلاڑی بڑے ہی قد
آساں نہیں ہے مارنا کچھ ان کی گوٹ کا ــــ انشا
(کلیاتِ سید انشاء اللہ خاں، صفحہ ۳۱ مطبع دہلی اردو اخبار، ۱۸۵۵ء)
قح : بالضم و تشدید حا - سادہ و بے آمیز و خالص و نیکی و بدی و درشت و جفا کار از مردم و غیر آں و خربزۂ خام -
(از منتخب اللغات ، ص ۳۷۹ مطبع نول کشور ۱۸۷۰ء)
قح : مرغی کے انڈے کی زردی (عربی لغات فیروزی ، ص ۱۹۱)
قد ، لغات اردو فارسی میں نظر سے نہیں گزرا - (فائق)
۲ - اصل : قلی

تا زیست **مصحفی** کی چھوڑی نہ دل کی جانب
دیوانہ ہوں میں یارو ! زلفوں کی اس کی بچ کا

۹۳

خط گرد ہے چہرے کے ترے ناد ِ علی سا
منہ لال ہے پانوں سے ترا گل کی کلی سا
اللہ رے تری شان کہ با ایں ہمہ شوکت
پیدا نہ کیا پھر ید ِ قدرت نے علی سا
ہونا بہت آسان ہے شیطان سے مشہور
پر ہو تو لے دنیا میں کوئی بھلے ولی سا
گر **مصحفی** دل بیچے تو مت چھوڑیو اس کو
مجھ کو نظر آتا ہے یہ مصحف بغلی سا

۹۴

برہم زن ِ تقریر نہیں پیر و جواں کا
جوں غنچہ میں[1] عقدہ ہوں ، پر اپنی ہی زباں کا
مت بھول[2] بہار ِ رخ ِ گل رنگ پر اتنا
یاں رنگ کی گردش میں ہی موسم ہے خزاں کا
پیدا ہے کہ حلقوم پہ ہم تشنہ لبوں کے
ہے[3] حکم تری تیغ کے تئیں آب ِ رواں کا

---

۱ - میں ہوں عقدہ : پ -
۲ - پھول (؟) -
۳ - حکم اس کے دم تیغ کو ہے آب رواں کا : پ ، ل ۱ -

بے نام و نشاں ہو گئے جوئندہ و لیکن
پایا نہ عدم میں بھی نشاں اس کے دہاں کا

از بس کہ تعب کھینچے ہے[1] اب دل کو ہمارے
نے آہ کی طاقت ہے، نہ زہرہ ہے فغاں کا

سو بت کدے اور دیر ہوے خاک برابر
پر دل سے ہمارے نہ مٹا نقش بتاں کا

پیراہنِ شبنم سے بدن کو ترے اے گل!
گر دیکھیے تو رابطہ ہے ماہ و کتاں کا

تعریف بیاں کرتے ہو تم حسن کی اپنے
واللہ کہ کشتہ ہوں میں اس حسنِ بتاں کا

جوں ریگِ رواں رہتے ہیں دن رات سفر میں
کیا جانیے ہے اپنے تئیں قصد کہاں کا

رسوائیِ عشق اپنی بہت دور گئی[2] ہے
اندیشہ ہمیں کچھ نہیں اب سود و زیاں کا

کیا جانیے ہے منتظر آنے کی وہ کس کے
نرگس میں ہے نقشہ مری چشمِ نگراں کا

یہ خوں میں کس کشتے کے سر ڈوب ہوئی ہے
کیا رنگ چمکتا ہے تری نوکِ سناں کا

اے **مصحفی** جاتے ہیں تہی دیکھیے کیا ہو
کچھ کام ہوا ہم سے نہ یاں کا نہ وہاں کا

---

۱ - بین (؟) -
۲ - کھچی ہے : ب ، ل ۱

۹۵

جب کوہ و بیاباں میں جا ہم نے قدم مارا
فرہاد نہ کچھ بولا ، مجنوں نے نہ دم مارا

تنہا نہ دل اپنا ہی میں زیر و زبر دیکھا
اس جنبشِ مژگاں نے عالم کو بہم مارا

باتوں پہ[1] کوئی اس کی بھولے سو دوانا ہو
کتنوں کو یوں ہی اس نے کہا جھوٹی قسم مارا

وہ نوچہٴ کشتی گیر اترا جوں ہی میداں میں
تیاری کو دیکھ اس کی رستم نے نہ دم[2] مارا

ان کو جو زمیں پر تھے محسود[3] زمانے کے
آخر کو فلک تو نے کر جور و ستم مارا

تھا صید فگن میرا از بس کہ ستم پیشہ
کعبے گیا سو واں بھی سو صیدِ حرم مارا

میں تیرے تغافل کا کشتہ ہوں کہ عاشق کو
معشوق کی آنکھوں نے اس لطف سے کم مارا

اے مصحفی جو میرے اشعارِ بیاضی تھے
میں صاد کیا ان پر اور سب کو قلم مارا

---

۱ - جو کوئی اس کے بھولے سو دوانا ہو - انتخاب حسرت ، صفحہ ۱-
۲ - خم : پ ، ل ۱ ، ۲ -
۳ - مجبور : پ ، ل ۲ -

۹۶

دشنام سو سنیں لبِ خوباں[1] سے کیا کیا
گر ہم ذلیل ہو گئے طفلاں سے کیا کیا

لشکر کشی پر اپنی تو منعم نہ بھولیو[2]
اک مور نے ، سنا کہ سلیماں سے کیا کیا

دیر و حرم تک آ تو کہ معلوم ہو تجھے
الفت نے تیری گبر و مسلماں سے کیا کیا

جو ہاتھ اس کے گوشۂ داماں سے دور تھا
اس ہاتھ نے ہمارے گریباں سے کیا کیا

یہ خوں سنجافِ سرخ سے کچھ کم نہ تھا میاں
کیوں دھو دیا میرے خون کو داماں سے کیا کیا

جو قیدی اس کی تیغ سے محروم ہی رہے
ان قیدیوں نے چھوٹ کے زنداں سے کیا کیا

گاہے سلام تو مرا کہتا تھا یار سے
افسوس کیوں بگاڑی میں درباں سے کیا کیا

اے **مصحفی** نہ کڑھ کہ جگر میرا چھن گیا
ہم نے کسی کے ناوکِ مژگاں سے کیا کیا

---

۱ - جاناں : پ ، ل ۲ -
۲ - پھولیو (؟)

۹۷

گر اور بھی مری تربت پہ یار ٹھہرے گا
تو زیرِ خاک نہ یہ بے قرار ٹھہرے گا

نہ بولو کوئی[1] مرے جھگڑے میں میں سمجھ لوں گا
مرے اور اس کے جو دار و مدار ٹھہرے گا

اگر یہ ہے ترے دامن کی حشر و نشر میاں
زمیں پہ خاک ہمارا غبار ٹھہرے گا

چلے بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

یہی ہے دل کا دھڑکنا مرے اگر تہِ خاک
تو کیا مزار پہ سنگِ مزار ٹھہرے گا

نگاہِ لطف سے تیری ہمیں توقع ہے
کبھی تو وعدۂ بوس و کنار ٹھہرے گا

تمھارے ناوکِ مژگاں کے سامنے خوباں
کہاں تلک یہ دلِ داغ دار ٹھہرے گا

یہی ہے لوٹ تو[2] شانے کے ہاتھ سے پیارے
نہ ایک بھی تری زلفوں کا تار ٹھہرے گا

تمھارے وعدوں پہ ہم کو تو اب نہیں ٹھہراؤ
مگر نیا کوئی امیدوار ٹھہرے گا

جو سیر کرنی ہے کر لے کہ جب خزاں آئی
نہ گل رہے گا چمن میں نہ خار ٹھہرے گا

---

۱ - بروزن فع -
۲ - جو ; ل ۲ -

خدنگ خوردہ دل آگے سے اُس کے جاتا ہے
خبر نہیں کہ کہاں یہ شکار ٹھہرے گا

شتاب آئیو ٹھہرا رکھیں گے ہم اس کو
جو جاں لبوں پہ دمِ انتظار ٹھہرے گا

اسے نہ دفن کرو سمجھو تو کوئی یارو
زمیں میں مصحفیِ بے قرار ٹھہرے گا

۹۸

جو رنگ بدلے ٹک اس چرخِ آبنوسی کا
یہ رنگ کبھوں ہو مرے اشک سندروسی[1] کا

رچے ہی رہتے ہیں مہندی میں دست و پا شب و روز
زبس کہ اس کے تئیں شوق ہے عروسی کا

ملاحت اک تو ترے حسن کی قیامت ہے
کرے ہے تس پہ ستم رنگ شالِ طوسی کا

میں وہ نہیں ہوں کہ سر بر ہو مجھ سے خصم رکیک
کہ خامہ ہاتھ میں میرے عصا ہے موسی کا

نہ پہنچے مصحفی ہم اس کے در تلک گاہے
نت اشتیاق رہا آستانہ بوسی کا

سندروس : ایک گوند۔

۹۹

نہیں زلفوں کی تری بے سر و پائی کا گلا
ہے ہمیں اپنے نصیبوں کی رسائی کا گلا

اس سے[1] جس کے تئیں مانندِ حنا مل ڈالا
نہ سنا ہم نے ترے دستِ حنائی کا گلا

دور کھینچے ہے زبس اپنے تئیں مجھ سے وہ شوخ
وصل میں بھی ہمیں رہتا ہے جدائی کا گلا

دشتِ پرخارِ محبت سے اگر ہووے گزار
مردِ عاشق کو نہیں برہنہ پائی کا گلا

مصحفی کیا ہوئے ہو جان کے اپنی دشمن
کرتے پھرتے ہو جو تم ساری خدائی کا گلا

۱۰۰

کتنوں کو تو نے شوخ کہاں کش الٹ دیا
جس وقت اپنے تیروں کا ترکش الٹ دیا

خورشید ہو گیا خجل اپنے عذار سے
پردہ جو تو نے اے بتِ مہ وش، الٹ دیا

وا قسمتا! کہ سر پہ مرے آفتاب نے
ہوتے ہی صبح طشتِ پُر آتش الٹ دیا

---

۱ - اس نے : پ۔

حسرت ہے یہ کہ ضد سے مری کل زمین پر
ساقی نے شیشۂ مے بے غش[1] الٹ دیا

اے مصحفی تو کیوں کہ بچے اس نگاہ سے
جس نے کہ رستموں کو بہ ابرش[2] الٹ دیا

۱۰۱

فسانہ اک طرف شب ہائے ہجراں کی درازی کا
قیامت ماجرا نالوں کی ہے ہنگامہ سازی کا

نہ مہر و لطف ، نے گاہے نگاہ اور نہ کبھی ملنا
بیاں کیا کیجیے اللہ تیری بے نیازی کا

وہ روزِ عید جب سج کو بنا مسجد میں آتا ہے
ڈھلا جاتا ہے اس کی ہی طرف دل ہر نمازی کا

بھری مجلس میں روتی شمع کیوں میری طرح اس کو
جو ہوتا حوصلہ بے طاقتی اور جاں گذاری کا

نہ پہنچاوے خدا سنگیں دلوں[3] تک شیشۂ دل کو
کہ چرچا سخت ہے عالم میں اب بے امتیازی کا

زبس ہر لحظہ اشکِ تازہ آ مژگاں پہ ناچے ہے
مری آنکھوں میں عالم جلوہ گر ہے شیشہ بازی کا

---

۱ - بے غش : خالص -
۲ - ابرش : ابلق گھوڑا -
۳ - سنگیں دلاں : ل ۱ -

۱۰۲

کس سے سیکھا ہے میاں تم نے مٹک کر چلنا
عاشقِ خفتہ پہ دامن کو جھٹک کر چلنا

شاخِ گل صدقے ہے اس تیرے قد نازک کے
اس نے پایا ہے کہاں ایسا لچک کر چلنا

اس کی رفتار کے بل سمجھے کوئی کیا طاقت
برق بھی سیکھ گئی جس[1] سے چمک کر چلنا

فتنۂ تازہ زمانے میں ہوا ہے پیدا
اس کے آگے سے تو اے فتنہ دبک[2] کر چلنا

مصحفی چاہے ہے گر حسنِ تجلی دیکھے
اک ذرا اس کی گلی سے تو ٹھٹک کر چلنا

۱۰۳

کس رات میں اس فکر سے تا صبح نہ جاگا
کب شوخ تصور ترا آ آ کے نہ بھاگا

کیا ڈھونڈے ہے اسبابِ رفو زخم جگر کا
یاں سوزنِ عیسٰی کو میسر نہیں تاگا

رکھ آیا ہے اک تاند کا جیسے کہ کنارا
تم دیکھیو زاہد کی ذرا پگڑی کا آگا

کس شب میں نہ کی فکرِ خوش اندازِ سخن میں
کس روز نشانے پہ مرا تیر نہ لاگا

---

۱ - اس سے : ل ۲ -
۲ - دبکنا (ہ) : چھپنا -

گر تارِ محبت نہ دو تا ہو کے بٹا جائے
ہے بیمِ گسستن[1] اسے ، کچا ہے وہ دھاگا

گہ فارسی کہتا ہوں گہے **مصحفی** ہندی
یعنی کہ مری طبع کا گھوڑا ہے دو باگا

۱۰۴

کل دیکھ کے مجھ کو سرِ رہ سے جو وہ بھاگا
میں کوچہ بدل دوڑ کے آس کا لیا آگا

خوابیدہ رہا خون مرا کوے بتاں میں
سو فتنے اٹھے خاک سے پر ایک نہ جاگا

کچھ ٹوٹے پھٹے سینے کو ، ساتھ اپنے سفر میں
کیا وہ بھی مسافر جو نہ رکھے سوئی دھاگا

اک طرفہ بلا تھی شبِ ہجراں کی سیاہی
جو دیوِ سپید اس کے تئیں دیکھ کے بھاگا

کل **مصحفی** نے دیکھا جو وہ جوہری بچہ
رکھ ہاتھ میں فیروزۂ دل بیچنے لاگا

۱۰۵

آ کے جب پاس مرے وہ گلِ تر بیٹھ گیا
جوش کھا کھا کے مرا خونِ جگر بیٹھ گیا

تھا کھڑا بام پہ شب ، مجھ کو جو دیکھا اس نے
منہ چھپا شرم سے وہ رشکِ قمر بیٹھ گیا

---

۱ - بیمِ گسستن : ٹوٹنے کا خوف ۔

اے مصور تجھے ہم لکھ کے دکھا دیویں گے
اپنے دل میں بھی کوئی نقش اگر بیٹھ گیا

اشک آ پہنچے بہت جلد ، بڑی خیر ہوئی
شعلہ اٹھا ہی تھا اس سینے سے پر بیٹھ گیا

بزم میں اس کی جو شب شمع کو روتے دیکھا
میں بھی اک کونے میں لے دیدۂ تر بیٹھ گیا

شام اس قاتلِ خوں خوار نے جوں جھاڑا[1] ہاتھ
رکھ کے خورشید منہ اپنے پہ سپر بیٹھ گیا

ق

مصحفی جائے تھا گھر اپنے و لیکن ناگاہ
تیرِ مژگاں جو ترا[2] اس کے دو سر بیٹھ گیا

اک قدم چل نہ سکا کوچے سے تیرے وہ غریب
دونوں ہاتھوں سے پکڑ اپنی کمر بیٹھ گیا

۱۰۶

ناتوانی نے کیا اب تو ہمیں بے دست و پا
دست و پا ماریں تھے ہم بھی جب تلک تھے دست و پا

جب سے آئے ہیں نظر یارو ہمیں وے دست و پا
ہم در و دیوار سے ماریں ہیں دے دے دست و پا

تیرا اسلوبِ بدن یوں دیکھ کر کہتی ہے خلق
دیکھیو پائے ہیں اس نے کیا ہی اچھے دست و پا

---

۱ - ہاتھ جھاڑنا : مارنا ۔
۲ - پڑا (؟)

گر نہ تھا چورنگ میں تیغِ جفائے چرخ کا
کاٹ کر ٹکڑے کیے کیوں اس نے میرے دست و پا

حیف ہے ہم کو نہیں اپنے تنِ زیبا کی قدر
لوگ پردے میں چھپا رکھتے ہیں ایسے دست و پا

رات سے اے **مصحفی** کچھ خون ہی روتا ہے تو
کچھ تو کہہ کس کے حنائی تو نے دیکھے دست و پا

۱۰۷

پس گئے اہل زمیں یوں آسماں کے زیرِ پا
مورچے آ جاویں جوں پیلِ دماں کے زیر پا

چونک اٹھا میں سادہ اس کو جان کر پائے نگار
آ گیا تھا سر مرا شب پاسباں کے زیر پا

دیکھیے اک دم میں یہ سر جاوے یا سالم رہے
اب تو ہم بیٹھے ہیں تیغِ امتحاں کے زیر پا

شاخِ گل کا جھکنا ہم تجھ کو دکھاویں گے نسیم
آ گیا دامن گر اس سروِ رواں کے زیر پا

کیجیو تربت مری دیر[1] مغاں کی راہ میں
شاید آ جائے کسی مستِ جہاں کے زیر پا

ہر قدم پر فرش ہوتی آتی ہے دامن کی طرح
زلف بھی اس کیفیِ دامن کشاں کے زیر پا

کیا مزہ ہو میں پڑا روتا ہوں اور آنکھیں مری
وقتِ شب آ جاویں اس آرامِ جاں کے زیر پا

---

۱ - پیر مغاں : ل ۲ -

دیکھ کر رنگِ کفک کو اس کے یوں کہتی ہے خلق
خوں کسی کا آ گیا ہے اس جواں کے زیر پا

لذتِ محمل کشی میں کچھ نہ سوجھا اس کو ہائے
گرچہ تھا صحرا ہی نشتر سارباں کے زیر پا

کیا درازی زلف کی کہیے کہ ہنگامِ خرام
سانپ سا آ جائے ہے اس مومیاں کے زیر پا

سرگزشت اپنی کہوں کیا ہائے اس گلشن کے بیچ
سبزۂ بیگانہ ہوں میں رہرواں کے زیر پا

اب لگا کانٹوں پہ چلنے مصحفی ہے کل کی بات
آبلہ پھوٹے نہ تھا اس ناتواں کے زیر پا

۱۰۸

رو کے ان آنکھوں نے دریا کر دیا
ابر کو پانی سے پتلا کر دیا

حسن ہے اک فتنہ گر، اس نے وہیں
جس کو چاہا اس کو رسوا کر دیا

تم نے کچھ ساقی کی کل دیکھی ادا
مجھ کو ساغر مے کا چھلکا کر دیا

اس نے جب مجھ پر چلائی تیغ ہائے
کیوں میں اپنا ہاتھ اونچا کر دیا

مصحفی کے دیکھیو چہرے کا رنگ
عشق نے کیا اس کا نقشا کر دیا

۱۰۹

اس نے جب بندِ قبا وا کر دیا
خلق کو محوِ تماشا کر دیا

تجھ سے شکوہ ہے مجھے اے چشمِ تر
تو نے رازِ عشق افشا[1] کر دیا

جنبشِ پا نے تری اے سرو ناز
ایک عالم جا سے بے جا کر دیا

حشر کے دن اک بڑا ہنگامہ تھا
آتے ہی کچھ اس نے پرچھا[2] کر دیا

دی ملا[3] ساقی نے مجھ کو صاف و درد
اک ذرا ساغر نہ ٹیڑھا کر دیا

بے کسی برسے ہے میری خاک پر
مرگ نے عالم سے تنہا کر دیا

مصحفی رنگِ کفک نے یار کے
اک جہاں میں فتنہ برپا کر دیا

۱۱۰

جب عارضِ گل رنگ سے خط اس نے نکالا
بلبل نے کہا سلمہ اللہ تعالیٰ

ناداں ہے جو اب دل کو کوئی تجھ سے لگاوے
زلفوں کو دکھا تو نے کسے مار نہ ڈالا

---

۱ - رسوا : ل ۲ -
۲ - پرچھا کر دینا (ہ) : بھیڑ کم کر دینا ـ
۳ - دی ملی : ل ۲ -

کیا عاشق و معشوق میں ہوتی ہے لڑائی
واں خنجرِ مژگاں ہے تو یاں آہ کا بھالا

رو بات کا ہرگز نہیں اس بزم میں تجھ کو
جوں آئنہ اک میں بھی ہوں منہ دیکھنے والا

ہووے نہ کبھی غسلِ شہیدانِ محبت
جب تک کہ نہ اس کُو میں بہے خون کا نالا

کرنے کو ترے حسن سے گلشن میں گدائی
ہر پھول لیے ہاتھ میں نکلے ہے پیالا

تدبیر تو سو کرتے ہیں ہم لیک کسی طرح
ہوتا نہیں اس دردِ محبت کا امالا[1]

ہر حرف میں ہو جس کے کجی راست تو یہ ہے
مانندِ نگیں ایسے کا منہ کیجیے کالا

بیتاب ہی رہتا ہوں سدا جوں دُرِ غلطاں
دیکھا ہے میں جس دن سے ترے کان کا بالا

جو میری طرح سیر کرے سو وہی جانے
اس باغ میں اب سوجھے ہے مضمون نرالا

ہر غنچہ ہے دل بستگیٔ طبع کا مکتوب
ہر گل ہے پریشانیِ خاطر کا رسالا

اس چشم کی گردش تو مجھے لے ہی گئی تھی
پر **مصحفی** میں اپنے تئیں زور سنبھالا

---

۱ - ازالہ (؟)

۱۱۱

زِ اشک ہے مری چشمِ پُر آب میں دریا
بہ وقتِ گریہ ہے یاں کس حساب میں دریا

صدف کی طرح لگیں رہنے اب وے پانی میں
جن آنکھوں نے کہ نہ دیکھا ہو خواب میں دریا

گیا ہے شور مرے بحرِ اشک کا واں تک
تبھی تو ہے شب و روز اضطراب میں دریا

ظہورِ حق سے نصیب اپنے جز طپش نہ ہوا
رکھے ہے موج کو نت پیچ و تاب میں دریا

کرے عطش پہ مرے گر نگاہ ساقیِ بزم
بجائے مے بھرے ظرفِ شراب میں دریا

نقاب رخ سے جو کھولے تو خلق جاوے ڈوب
رکھا ہے باندھ کے اس نے نقاب میں دریا

حباب و موج کا کیا حادثہ بیاں کیجے
کہ آ گیا ہے عجب انقلاب میں دریا

ڈرا کرو مرے طوفانِ اشک سے یارو
نعوذ باللہ گر آوے عتاب میں دریا

نظر بہ اصل جو کیجے تو موج ہے نہ حباب
چھپا ہے کسوتِ موج و حباب میں دریا

زمانہ جذبِ رطوبت نہ کر گیا ایسے
کہ جلوہ گر ہو لباسِ شراب میں دریا

اک اشک پر نہ تصرف رہا ان آنکھوں کا
چلے تھا جن کی ہمیشہ رکاب میں دریا

تو جا کے بحر پر اے مصحفی نہ رویا کر
کہ تیرے رونے سے ہے اک عذاب میں دریا

۱۱۲

گذر ہو کیوں کہ وہاں صبح و شام عاشق کا
ہے مدعی وہ محلہ تمام عاشق کا

کچھ آج ہی نہیں عاشق کشی ہوئی ایجاد
زمانہ تشنۂ خوں ہے مدام عاشق کا

جدا نہیں کسی حالت میں عشق سے عاشق
کہ ساتھ عشق کے ہے التزام عاشق کا

نہ روزِ بد سے گلہ کیجیے کہ دنیا میں
ہمیشہ کوے بلا ہے مقام عاشق کا

کریں ہیں آن کے نت اس کو نیک و بد مجرا
نہیں قبول سو کیا اک سلام عاشق کا

صبا نے بھی نہ کہا اس سے ڈر کے مارے کچھ
گیا بہ باد ہی آخر پیام عاشق کا

ستم گری کا جنھیں مصحفی سلیقہ ہے
وہ اک نگاہ میں کرتے ہیں کام عاشق کا

۱۱۳

کبھی تو ہنس کے لیا کر تو نام عاشق کا
زباں ہلانے سے نکلے ہے کام عاشق کا

جز آہ و نالہ نہیں یاد آہ ! کچھ دل کو
یہی وظیفہ ہے اب صبح و شام عاشق کا

غرورِ ناز ترا جس جگہ کہ ساقی ہو
سفالِ سگ سے بھی بدتر ہے جام عاشق کا

جب اس نے مکھڑے سے اپنے اٹھا دیا پردہ
رہا کہاں سے بھلا ننگ و نام عاشق کا

صبا جو اس کی گلی کی طرف تو جا نکلے
تو ایک ایک سے کہیو سلام عاشق کا

سمجھ کے زلف کو ٹک اپنی کیجیو شانہ
کہ بال بال میں یاں ہے مقام عاشق کا

ہمیشہ چال پر اپنی پڑے ہے اس کی نگہ
رقیب ہے وہ بتِ خوش خرام عاشق کا

خدا ہی جانے یہ آئینہ کس کا حیراں ہے
کہ اس سے نکلے ہے نقشہ تمام عاشق کا

تری خرام، تری چال اور تری رفتار
ملے ہے تلووں تلے دل مدام عاشق کا

ہمیشہ **مصحفی** اس کا ہی ذکر کرتا ہے
ہے اب تلک وہی سودائے خام عاشق کا

۱۱۴

تیرے ہاتھوں سے میاں دل مرا بن کر ٹوٹا
حیف صد حیف کہ یہ شیشہ مکرر ٹوٹا

کھل پڑا نامہ مرا اس کے پروں سے یا رب!
یا ہوا بیچ کوئی بالِ کبوتر ٹوٹا[1]

---

۱ - ل ۲ میں یہ شعر زائد ہے:

حال کیا پوچھتے ہو ہم سے تباہی زدوں کا
کشتی طوفانی ہوئی، بہہ گئی، لنگر ٹوٹا

حیف صد حیف ! کہ اک پیاسے نے لب تر نہ کیے
بیچ مجلس کے کشا کش ہی میں ساغر ٹوٹا

جس طرح آہِ شرر بار مری گزرے ہے
اس طرح تو کبھی تارا نہ فلک پر ٹوٹا

وہ جو خود بینی کا اک بت تھا مرے ہاتھوں میں
کیا کہوں میں کہ بڑے زور سے کافر ٹوٹا

آسماں دیتا رہا مجھ کو ہی ہر روز شکست
نہ سنا میں نے کہ دشمن کا مرے سر ٹوٹا

وہی مجروح تو سمجھے گا الم کو میرے
مصحفی زخم میں جس کے دمِ خنجر ٹوٹا

۱۱۵

آج کیا جانے مری کون نظر سے گزرا
ناوکِ آہ جو یکبار جگر سے گزرا

پیچ و تابِ کمر و زلف سے گھبرا کے وہ شوخ
اب یہ کہتا ہے میں اس زلف و کمر سے گزرا

شمع اس چہرۂ پر نور سے کیا رو کش ہو
رتبۂ حسن میں جو شمس و قمر سے گزرا

سینہ[1] سوراخ تو ہے لیک یہ معلوم نہیں
آہ سینے سے کہ یہ تیر سپر[2] سے گزرا

---

۱ - ل ۲ میں یہ شعر زائد ہے :
مند گئیں آنکھیں مری راہ ہی تکتے تکتے
لیک کافر نہ کبھو ہو کے ادھر سے گزرا

۲ - جگر (؟)

ہم تو دیوانے ہیں اس شخص کے جس نے شبِ ہجر
سر رکھا خشت پہ اور بالشِ سر[1] سے گزرا
ہم بھی اے ابر بہاری تجھے دکھلاویں گے
گر کوئی لختِ جگر دیدۂ تر سے گزرا
مصحفی شمع کی مانند میں اس بزم میں رات
یاں تلک رویا کہ دریا مرے سر سے گزرا

۱۱۶

اس راہ سے جو ہو کر کل تو ذرا نہ گزرا
کیا کیا ہمارے جی میں اے بے وفا نہ گزرا
کشتوں کے تیرے جس جا کچھ استخواں پڑے تھے
اڑتا ہوا ہوا میں واں سے ہما نہ گزرا
شب کون سی وہ میں نے باتوں میں سب نہ کاٹی
دن کون سا وہ مجھ پر بے "ہو و ہا" نہ گزرا
قاصد کا منہ تو دیکھو رکھے وہاں قدم کو
جس کی گلی میں اب تک بادِ صبا نہ گزرا
اے مصحفی، وہ شب تو تنہا ملا تھا تجھ سے
کم بخت تو ہی چوکا[2] جو جی چلا[3] نہ گزرا

---

۱ - بالش پر : ل ۱ ، ۲ -
۲ - چوکنا (ہ) : خطا کرنا ، بھولنا ۔
۳ - جی چلانا : ہمت کرنا ، جی چلا ہونا ۔ بلند حوصلہ ، دلیر، منچلا ہونا ۔ آزاد نے اس محاورے کو بھی مقامی بتایا ہے ۔ انشا کا شعر ہے :

نہ وہ لن ترانی ادھر کی سن
ارنی ہے کہنے پہ جی چلا

۱۱۷

کیا دخل ہے جا کر ہمیں اس کُو میں بھٹکنا
رونا وہی راتوں کو وہی سر کو پٹکنا

تم جتنا چھڑاؤ میں نہ چھوڑوں گا مری جان
ہاتھوں سے مرے فائدہ دامن کو جھٹکنا

اے برقِ جہاں سوز ٹک اک دم تو لیا کر
یہ کس نے سکھایا ہے تجھے اتنا مٹکنا

ہیں ایک تو آفت ترے رخسارِ دل‌آویز
پھر تس پہ قیامت ہے یہ زلفوں کا لٹکنا

جب دیکھوں ہوں گلبن کو تو آتا ہے مجھے یاد
ہر شاخِ دل آویز سے بلبل کا لٹکنا

وقتیکہ پتا یار کا ملتا نہیں اے دل
پھر فائدہ کیا رکھتا ہے گلیوں میں بھٹکنا

اے مصحفی کر شکر کہ تو جی سے بچا ہے
دیوانے کہیں ایسی جگہ پھر نہ اٹکنا[1]

۱۱۸

کی آہ ہم نے لیکن اس نے ادھر نہ دیکھا
اس آہ میں تو ہم نے کچھ بھی اثر نہ دیکھا

ہرگز ہوا نہ یارو وہ شوخ یار اپنا
زیں پیش ورنہ ہم نے کیا کیا کہ کر نہ دیکھا

---

۱ ۔ اٹکنا (ہ) : پھنسنا ، دل لگانا ۔

رہتے ہیں کیا بھلا واں آفت زدے ہی سارے
اس کوچے میں کسی کا آباد گھر نہ دیکھا

پہنچا گلی تک اس کی جب تک تو تھا نظر میں
آگے قدم کے رکھتے پھر نامہ بر نہ دیکھا

دو دو پہر تک اس کے آگے کھڑا رہا میں
پر اس نے ضد کے مارے بھر کر نظر نہ دیکھا

کیا فائدہ رکھے ہے بس اب زیادہ مت رو
رونا ترا کسی نے اے چشمِ تر نہ دیکھا

کل یار کی گلی میں ڈھونڈا جو **مصحفی** کو
اک لاش تو پڑی تھی پر اس کا سر نہ دیکھا

۱۱۹

اب اوروں سے کی گرم صحبت ، بھلا
بھلا بے وفا ، بے مروت بھلا

کبھی یار بھی ہم سے سمجھیں گے خوب
کرو جتنی چاہو عداوت بھلا

جو برداشت تیری جفا کی کرے[۱]
کہاں ہم میں وہ تاب و طاقت بھلا

سنا بس کہیں چپ رہو شیخ جی
کہو گے سو کیجے گا حضرت بھلا

اب اس زیست سے مر ہی جانا ہے خوب
کوئی کھینچے کب تک اذیت بھلا

۱- کریں (؟)

کہوں میں تو سو بات پر اب مجھے
کہاں بات کہنے کی فرصت بھلا

ترے غم سے ہے نزع میں **مصحفی**
ٹک اک دیکھ جا اس کی صورت بھلا

۱۲۰

دیر تک اپنے شہیدوں پہ نظر کرنا تھا
سرسری تم کو نہ مقتل سے گزر کرنا تھا

گر لبِ جام کے شایستہ نہ تھا اے قاتل
لبِ خنجر تو مرے خون سے تر کرنا تھا

کیوں خبر یار کے آنے کی میں کی یاروں کو
کیا کیا ہائے کسی کو نہ خبر کرنا تھا

بچ رہا شب مرے قابو سے وہ، میں ہی چوکا
دونوں ہاتھوں کو مرے طوقِ کمر کرنا تھا

لے گیا دل کو مرے، یار ہنر سے جس وقت
ہائے کچھ مجھ کو بھی اس وقت ہنر کرنا تھا

جوں صبا ہر طرف آوارہ پڑا پھرتا ہوں
میری قسمت میں مگر خاک بسر کرنا تھا

تیغِ قاتل کو میں کیوں ہاتھ سے[1] روکا افسوس
مصحفی میرے تئیں سینہ سپر کرنا تھا

---

۱ - ہاتھ : انتخاب حسرت۔

۱۲۱

اک برق کا سا جھمکا[۱] اس مہ لقا سے دیکھا
میں کیا کہوں کہ اس کو کل کس ادا سے دیکھا

کاہے کو اس قدر تھے سفاک ہاتھ سادے
عالم کا خون ہوتا رنگِ حنا سے دیکھا

یوں تو رہا ہمیشہ وہ میرے رو برو ہی
پر روے دل نہ ہرگز اس بے وفا سے دیکھا

یا داغ یا کہ مرہم یا سوز یا کہ ماتم
جو کچھ کہ ہم نے دیکھا اس مہ لقا سے دیکھا

یہ جانتے نہیں ہم اس میں بدن ہے، کیا ہے
شعلہ سا اک جھمکتا زیرِ قبا سے دیکھا

کب ہم سے راستی پر آیا یہ چرخِ کج رو
ہم نے تو نت ستم ہی اس فتنہ زا سے دیکھا

ہم گبر و ہم مسلماں، ہم جمع، ہم پریشاں
اک سلسلہ بندھا اس زلفِ دو تا سے دیکھا

یاروں کی آنکھیں اس سے کیوں کر لڑیں الٰہی
سوے فلک نہ ہرگز جس نے حیا سے دیکھا

اے مصحفی ہمیں تو کچھ درد ہی میں ہے چین
یعنی ضرر ہی ہم نے اکثر دوا سے دیکھا

---

۱ - جھمکا (ہ) : چمک ۔

۱۲۲

کل اس کو باتیں کرتے اک آشنا سے دیکھا
پر وہ بھی دیکھتا تھا ، ہم نے دغا سے دیکھا

غرفے سے کل میں اپنی آنکھیں ملا دیاں تھیں
اس نے بھی کیا کہوں میں کس کس ادا سے دیکھا

فردوس میں بھی شاید اپنے نصیب ہووے
جو لطف اس چمن کی آب و ہوا سے دیکھا

صحبت رہی یہ اس سے اپنی کہ مل گئے جب
اس نے جھکا دیں آنکھیں، میں نے حیا سے دیکھا

پاکیزگی کا عالم اس کی میں کیا بتاؤں
کانوں میں اس کے موتی کل جس صفا سے دیکھا

غیرت پہ باغباں کی پتھر پڑیں کہ ہم نے
سو بار گل کو ہنستے بادِ صبا سے دیکھا

اے **مصحفی** بتوں میں ہوتی ہے یہ کرامت
دل پھر گیا نہ تیرا آخر خدا سے ، دیکھا ؟

۱۲۳

پاؤں بے طرح پھر اس شوخ پسر کا نکلا
شام گھر آنے لگا اب وہ سحر کا نکلا

کر گئی سنتے ہی جان اپنی تو دنیا سے سفر
منہ سے اس بت کے جوں ہی نام سفر کا نکلا

گرچہ محتاج تو غازے کا نہ تھا پر جو ملا
اور ہی حسن کچھ اس رشکِ قمر کا نکلا

خار خار[1] اپنے تئیں عشق کا ہے ویسا ہی
مر گئے تو بھی تو کانٹا نہ جگر کا نکلا

دید[2] بازی سے مری کچھ اسے نقصان نہ ہوا
دن بہ دن اور ہی رنگ اس گلِ تر کا نکلا

نے شکر اس لبِ شیریں سے ہو کیوں کر روکش
جن کے آگے نہ کبھی نرخ شکر کا نکلا

گرچہ بل دار ہی پٹکوں سے رہی نت بندھتی
تو بھی زنہار نہ بل اس کی کمر کا نکلا

آتشِ غم میں دل و جان و جگر سب ہی جلا
کچھ بھی اسباب غرض ہم سے نہ گھر کا نکلا

لال ڈوروں کو تری آنکھوں کے دکھلاویں گے
اب کے ناخن میں اگر تار جگر کا نکلا

مصحفی شام گھر آیا تو اچنبھا کیا ہے
اب بھی کیا آ نہ پھرے آٹھ پہر کا نکلا

۱۲۴

عاشق ہوں مجھ کو ڈر نہیں روزِ وفات کا
اور بیش و کم جو ہے بھی تو ہجراں کی رات کا

اللہ رے تیرے سلسلۂ زلف کی کشش
جاتا ہے جی ادھر ہی کھنچا کائنات کا

بوسہ جو میں نے مانگا تو کہنے لگا کہ واہ!
جاؤ جی ، آشنا نہیں میں ایسی بات کا

---

۱ - خار خار (ف) : خواہش، بے کلی -
۲ - دیدہ (؟)

یک لخت دل ہماری بھی جانب سے اے صبا
آخر تو لے چلی ہے تُو خط پات پات کا
نامحرموں کے آگے نہ آیا کرو میاں
پاجامہ اس پھبن سے پہن محرمات[1] کا
سو رخنے ہو ہے پردۂ ناموس مصحفی
جب مجھ کو یاد آئے ہے چاک اس قنات کا

۱۲۵

مجھ کو زلفوں سے تری پیار وہی ہے جو تھا
اب تلک تو یہ گنہ گار وہی ہے جو تھا
دن بہ دن رنگ کو میں اپنے ہی پاتا ہوں تغیر
ورنہ اس کا گلِ رخسار وہی ہے جو تھا
تنگ‌چشمی سے تری کیوں کہ نہ فریاد کروں
اب تلک رخنۂ دیوار وہی ہے جو تھا
آج کیا بھول گئے مجھ کو ، ادھر تو دیکھو
جان میری یہ گنہ گار وہی ہے جو تھا
اور تو پنپے[2] بھی کھا کھا کے غذائیں کم و بیش
پر تری چشم کا بیمار وہی ہے جو تھا
ہاں کسی اور کو رو اس نے دیا ہووے گا
ہم سے تو وعدۂ دیدار وہی ہے جو تھا
اس میں تو کچھ بھی ترے ہجر میں باقی نہ رہا
دیکھ تو تُو یہ دلِ زار وہی ہے جو تھا

---

۱ - محرمات : ایک ریشمیں کپڑا ۔
۲ - پنپنا (ہ) : سنبھلنا ، صحت مند ہونا ۔

اب تو[1] کچھ مجھ کو یہ پھیکا سا نظر آتا ہے
مصحفی دیکھ تو تُو یار وہی ہے جو تھا

۱۲٦

صورت کو تیری دیکھ کے مانی نے رو دیا
یاں تک کہ خوں میں اپنا مرقع ڈبو دیا

ہرگز رہے نہ ہم تو کسی کام کے دریغ
سب کام سے ہمیں تری الفت نے کھو دیا

کیا دشمنی تھی مجھ سے کہ یوں روزگار نے
میرے ہی نام کو تری خاطر سے دھو دیا

اس اشکِ خوں سے مجھ کو یہی بحث ہے کہ ہائے
سلکِ گہر میں لعل کو لے کیوں پرو دیا

اودھر گیا تو غسل کو ، حمام کی طرف
یاں اشکِ گرم نے مرے دریا سمو دیا

آگنے کی کچھ خبر نہیں پر دشت‌دشت[2] میں
میں دانہ ہائے اشک سے اک کھیت بو دیا

گالی تلک بھی اس سے نہ منہ پھیر مصحفی
ہے مفت ہی کریم نے سائل کو جو دیا

---

۱ - اب تو کچھ پھیکا سا مجھ کو یہ نظر آتا ہے : ل ۱ -
۲ - دشت عشق میں : ل ۲

١٢٧

معالج ہو سکے اب کیا کوئی غم‌خوار رونے کا
کہ ان آنکھوں کو اک مدت سے ہے آزار رونے کا

میں آنسو پونچھتا ہوں اس کی مجلس میں بہت اپنے
ولے چھپتا ہے کوئی دیدہ و رخسار رونے کا

نصیحت کام کیا آتی ہے مردم کی خدا حافظ
مزہ تم کو پڑا اے دیدۂ خوں‌بار رونے کا

مجھے روتا سنا لیکن نہ اتنا بھی کہا اس نے
کہ ہے یہ شور سا کیسا پسِ دیوار رونے کا

خدا جانے کہ رستہ بند ہے کس موجِ دریا سے
جو ان آنکھوں میں اب تک بندھ رہا ہے تار رونے کا

سرشک آنکھوں سے ہیں بہتے پہ تو بھی ان کے ساتھ اے دل
چلا چاہے تو چل، ہے قافلہ تیّار رونے کا

ہنسی آتی ہے تیری بات پر اے مصحفی مجھ کو
نہ کر تو ذکر میرے سامنے ہر بار رونے کا

١٢٨

ازل کے روز سے سررشتہ گم تھا زار رونے کا
ان آنکھوں ہی نے آخر کو نکالا تار رونے کا

خدا جانے یہ آنسو کیوں بہے جاتے ہیں آنکھوں سے
نہیں معلوم ہوتا کچھ ہمیں اسرار رونے کا

---

۱ - سے؛ ل ۲

مرے نالے کو سن کر کوئی صاحب دل ہی رووے گا
بنایا سنگ دل جس کو ، نہیں زنہار رونے کا

میں سو سو بار دن میں ہم نشیں کاہے کو پھر روؤں
نکل جاوے بخار اس دل سے گر اک بار رونے کا

بھلا اے دوستاں[1] منہ بند کر وہ کس طرح رووے
طفولیت سے خوگر ہو جو دھاڑیں مار[2] رونے کا

کبھی اشک اور گاہے خونِ دل آنکھوں سے ٹپکے ہے
نہایت گرم ہے کچھ ان دنوں بازار رونے کا

کسی دن مصحفی گزرے ہے جو کچھ تجھ پہ کہہ اس سے
بھلا کیا فائدہ پیشِ در و دیوار رونے کا

۱۲۹

ترے کوُ سے مر کر یہ بے جان نکلا
بھلا تیرے جی کا تو ارمان نکلا

میں اس آن کے کیوں نہ ہو جاؤں صدقے
کہ ٹک یاد کرتے ہی تو آن نکلا

کماچی[3] بجانی گئے بھول مطرب
وہ زاہد پسر جب بھویں تان نکلا

زمینِ چمن کس کا مدفن ہے یا رب
جو گل چاک کرکے گریبان نکلا

---

۱ - اے دوستو : ل ۲ -
۲ - دھاڑیں مارنا (ہ) زور زور سے رونا -
۳ - کماچی : بربط -

وہ کافر جب آیا ٹک اک امتحاں پر
نہ مسجد سے کوئی مسلماں نکلا

جسے رات پکڑا تھا عاشق سمجھ کر
بڑی خیر گزری وہ درباں نکلا

غرض صلح کے وقت سینے سے میرے
دلِ خوں چکاں تھا جو پیکاں نکلا

یہ مشتِ غبار اپنا آخر کو بہات
ترے کوُ سے ہو کر پریشاں نکلا

میں سمجھا تھا کوئی قطرہ ہووے گا ان میں
جو دیکھا تو آنکھوں سے طوفاں نکلا

جہاں شیخ جی روز کرتے تھے سجدہ[2]
وہاں شیخ سدو[3] کا اک تھان نکلا

ہوئے مصحفی خون کتنوں کے دم میں
وہ جب اپنے گھر سے چبا پان نکلا

۱۳۰

اس دل میں تیرے ملنے کا ارماں رہ گیا
یہ دل تڑپ تڑپ کے مری جان رہ گیا

سمجھے وہ مرغِ خستہ مرے اضطراب کو
سینے میں جس کے ٹوٹ کے پیکان رہ گیا

---

۱ - بر وزنِ فع -
۲ - روز سجدہ کریں تھے : ل ۲ -
۳ - شیخ سدو : عورتوں کا ایک فرضی پیر یا جن - (جامع اللغات)

تھا نزع میں کہ ذبح کیا مجھ کو یار نے
گردن پہ میری اس کا یہ احسان رہ گیا

دیکھا ہزار بار تجھے ہم نے ہر کہیں
اے جانِ من تو اب تلک انجان رہ گیا

پھر بھی ہمیشہ اس کو وہی آرزو رہی
پیارے جو ایک شب ترے مہمان رہ گیا

سل قافلے میں صاحبِ حشمت چلے گئے
ہم سا ہوا جو بے سروسامان رہ گیا

آیا جو اس جہاں میں سو برباد ہی گیا
نے جامِ جم نہ تختِ سلیمان رہ گیا

نازاں تھا اپنے حسن و صفائی پر آئنہ
صورت کو تیری دیکھ کے حیران رہ گیا

آیا بہ کار بخیۂ زخم اپنے ہاتھ سے
ثابت جو کوئی تارِ گریبان رہ گیا

دنیا سے ہم چلے گئے ناچار **مصحفی**
اک یادگار اپنا یہ دیوان رہ گیا

۱۳۱

کل میں جو راہ میں اسے پہچان رہ گیا
کچھ وہ بھی مجھ کو دیکھ کے حیران رہ گیا

شہرِ عدم کو قافلے لاکھوں گئے ولے
چل چل کے نت میں بے سر و سامان رہ گیا

شوخی تو دیکھ تیر کو سینے سے کھینچ کر
کہتا ہے تیرے تیر کا پیکان رہ گیا

دیکھ اس کی تنگ پوشی کو خجلت سے باغ میں
ہر ایک غنچہ سر بہ گریبان رہ گیا

مارے خوشی کے کود پڑا میں تو مصحفی
شب پاس میرے اس کا جو دلمیان[1] رہ گیا

۱۳۲

جس کشتے کا زخموں سے ہو چور بدن سارا
خوں میں نہ بھرے کیوں کر پھر اس کا کفن سارا

یوں اس کی صف مژگاں بھالے ہی دکھاتی ہیں
چڑھ آیا ہے عاشق پر گویا کہ دکن سارا

زلفِ ہمہ مشک اس کی خوشبوئی میں کیا کم ہے
جس زلف کے حلقوں میں بستا ہے ختن سارا

گر شمع کے رونے میں ہے ایسی ہی رنگینی
بھر جائے گا لوہو سے تا صبح لگن سارا

اس گل کا پتا واں بھی ہرگز نہ ملا مجھ کو
جوں بادِ صبا ڈھونڈا ہر چند چمن سارا

اے مصحفی، تو واں سے کیوں روٹھ کے اٹھ آیا
دیوانے تری خاطر کڑھتا ہے وطن سارا

---

۱ - دو المیان، دلمیاں: پٹکے میں لگی تھیلی:

کاش! اس تاش کی دلمیان کے بدلے انشا
وہ پھرا کے مجھے اک سنگ فلاخن مارے (انشا)

۱۳۳

آپھی دمِ شمشیر ہے یاں ہم پہ دم اپنا
کس واسطے کرتا ہے تو تیغا علم اپنا

در گزرے ہم ان باتوں سے یہ ہم پہ غضب ہے
پاس اپنے ہی تم رہنے دو لطف و کرم اپنا

چوکیں نہ زباں زوری سے ہم پیچھے زباں کے
کٹ جاوے اگر سر بھی بہ رنگِ قلم اپنا

شوریدگی ہوتی ہے فزوں جلوے کی مقدار
رخ اب سے دکھایا کرو تم ہم کو کم اپنا

اس شکل سے کعبے کو نہ جا ورنہ مری جان
سر پیٹ نکل جاویں گے اہلِ حرم اپنا

جو حرف کہ گرتا ہے جواہر کی رقم ہے
ہم نام رکھیں کیوں نہ جواہر رقم اپنا

سر کاٹ کے یوں چاہے کوئی پھینک دے لیکن
اس کوُ سے نہیں بڑھنے کا آگے قدم اپنا

جو ہے سو گرفتار ہے یاں تازہ الم میں
لے جاویں سو کس پاس کہو تم الم اپنا

نے جینے کی شادی ہے نہ کچھ مرنے کا غم ہے
عاشق کے برابر ہے وجود و عدم اپنا

اے **مصحفی**، مدت سے غمِ عشق بتاں میں
مشغول ہیں اتنے کہ نہیں ہم کو غم اپنا

۱۳۴

شمع پر پروانہ شب جس وقت جل کر رہ گیا
دیکھ کر اس کو میں اپنے ہاتھ مل کر رہ گیا

کیا کہوں سرگشتگی اپنے نصیبوں کی میں ہائے
کل کٹار اس کی کمر سے کچھ اُگل کر رہ گیا

آتشِ سوزاں پہ میں نے رکھ دیا تھا دل کو رات
جوں سپند آخر کو وہ کود اور اچھل کر رہ گیا

کھینچ کر تلوار جوں میرے وہ آیا سامنے
میں ستم نادیدہ اس ساعت دہل کر رہ گیا

دور سے بوسے کی خاطر جوں ہی میرے لب ہلے
دیکھ کر میری طرف تیوری بدل کر رہ گیا

میں نے جانا تھا بہے گا موجِ آبِ اشک ہو
دل مرے سینے میں ہی ہے ہے پگھل کر رہ گیا

کاش میں اس کو نظر آیا نہ ہوتا **مصحفی**
گھر سے باہر آج وہ کافر نکل کر رہ گیا

۱۳۵

ہائے وہ زخمی کہ سنبھلا اور سنبھل کر رہ گیا
مرغِ بسمل کی طرح دو گام چل کر رہ گیا

کل اسے میں لے چلا تھا سیرِ گلشن کی طرف
کچھ سمجھ کر ساتھ سے میرے وہ ٹل کر رہ گیا

میں نے چاہا تھا لے آؤں اس کو ساتھ اپنے وہ شوخ
گھر کے دروازے ہی پر آخر مچل کر رہ گیا

عشق کا شعلہ کیا جو دل کے دامن کو لپٹ
خوں آنسو ہو کے وہ ناچار جل کر رہ گیا
جس جگہ ڈوبا تھا کل دریا کے اندر **مصحفی**
اس جگہ کہتے ہیں پانی سا اچھل کر رہ گیا

۱۳۶

دم اس دھج سے کچھ پڑتا ہے تیغ غارت گرِ جاں کا
کہ دل ہر آن دم پر لوٹ ہے گبر و مسلماں کا
اس آبِ اشک میں یوں لختِ دل بہتے نظر آئے
کہ جیسے وقتِ شب دریا میں عالم ہو چراغاں کا
وہ تیرے آستانے پر قدم اپنا رکھے ہے جب
سر اپنا پیٹ لیتا ہوں یہ رتبہ دیکھ درباں کا
اگر اب کے بہار آئی تو ہم ان جامہ زیبوں کو
دکھاویں گے تماشا دھجیاں کرکے گریباں کا
نوائے بلبلانِ قدس کا میں سننے والا ہوں
خوش آتا ہے مجھے کب زمزمہ مرغِ گلستاں کا
اگر کچھ زلف کا مذکور اس کی درمیاں آیا
فسانہ طول کھینچے گا بہت شب ہائے ہجراں کا
نہ ہم مرہم سے واقف اور نہ ہم پھاہے کو کچھ سمجھیں
ہمارے زخم پر احسان ہے تیرے نمک داں کا
اگر انداز رونے کا یہی ہے جیسے **فوارہ**
تو سر کھینچے گا اک دن ماجرا اس چشمِ گریاں کا
مرا دریائے اشک اس زور سے بہتا ہے ان روزوں
کہ چلتا ہے جلو میں جس کے اکثر شور طوفاں کا

جو یہ دنبالہ داری ہے تو اک دن مر ہی مردم کے
بلا لاوے گا پیارے سرمہ تیری چشمِ فتّاں کا

کیا زندانیوں کو حکمِ قتل اس واسطے اس نے
کہ راتوں کو اسے نا خوش رکھیے تھا شور زنداں کا

جنھوں کے چشمِ دل روشن ہیں وہ اس کو سمجھتے ہیں
کہ ہر ذرے میں جلوہ ہے اسی خورشیدِ تاباں کا

جسے منظور ہو اس لب کا بوسہ کیوں ذقن چومے
کوئیں پر بھی کہیں جاتا ہے پیاسا آبِ حیواں کا

غزل اک اس زمیں میں اور بھی اے مصحفیؔ! کہہ جا
کہ ہے شور آسماں پر تیری طبعِ برق جولاں کا

۱۳۷

خدا جانے یہ دل کشتہ ہے کس اندازِ داماں کا
کہ ہے چاکِ کفن کی شکل چاک اس کے گریباں کا

کوئی یاں مجھ سے پوچھے حضرت مجنوں کی تربت کو
کہ میں آوارہ اک مدت سے زائر ہوں بیاباں کا

شبِ مہتاب میں کیا کیا سمے ہم کو دکھاتا ہے
بکھرنا چاند سے مکھڑے پہ اس زلفِ پریشاں کا

کٹاری مار کے میں اپنی مر جاؤں گا کیا حاصل
نہ لینا نام میرے رو بہ رو تم اس کی مژگاں کا

شفق میں جس طرح جھمکیں ستارے، جلوہ دیتا ہے
جو سرخی میں لبوں کی دیکھیے عکس اس کے دنداں کا

---

۱ - غمیں : انتخاب حسرت -

کہے ہے تو جو نت اے عشق[1] مجھ کو رہ بیاباں میں
بیاباں میں لگے ہے دل بھلا کس خانۂ ویراں کا

ہمارے دل پہ یار اب تیر بے پیکاں لگاتا ہے
کہ پر دشوار ہوتا ہے نکلنا دل سے پیکاں کا

بہار آئی خدا جانے کہ کیا گزری[2] اسیروں پر
نہیں معلوم کچھ اب کے برس احوال زنداں کا

بھلا اے چشم گریاں تجھ سے ہم یہ چشم رکھتے تھے[3]
ہمارے زخم پر کیوں تو نے منہ کھولا نمک داں کا

تبھی ہم تم پہ گل کھائے[4] پھریں تھے او میاں لڑکے
سبق تم جن دنوں مکتب میں پڑھتے تھے گلستاں کا

کیا ہے تیغِ بے جوہر کو جوہر دار قاتل نے
خمِ ابرو پہ یہ عالم نظر آتا ہے افشاں کا

بگولے سے ہماری خاک کے ہوتا ہے یہ رو کش
مگر کچھ سر پھرا ہے ان دنوں گردونِ گرداں کا

گلے سے لگ گیا میں دوڑ کر اس سرو مائل کے
کہ سب[5] انداز تھا اس میں مرے سروِ خراماں کا

تبسم سا کرے ہے کچھ لبِ زخم جگر میرا
مگر پھر آج اس کا کوئی ڈھیلا ہو گیا ٹانکا

---

۱ - بھائی عشق : پ -
۲ - گزرا : انتخاب حسرت -
۳ - چشم رکھنا : (چشم داشتن کا ترجمہ) امید رکھنا -
۴ - گل کھانا : داغ کھانا ، عاشق ہونا -
۵ - اک : ل ا -

تجھے اے مصحفی ، کب ہے خبر دردِ محبت کی
نہ لے تو میرے آگے نام اے بیدرد ، درماں کا

۱۳۸

ان آہوں سے حجاب اس آسماں کا اٹھ نہیں سکتا
غضب یہ ہے کہ پردہ درمیاں کا اٹھ نہیں سکتا

ہوا ہوں ناتواں اتنا میں غم میں اس کی ابرو کے
کہ میرے ہاتھ سے قبضہ کماں کا اٹھ نہیں سکتا

ہم اس گلشن سے اک دن آشیاں اپنا اٹھاویں گے
کہ اب ہم سے دماغ اس باغباں کا اٹھ نہیں سکتا

عجب یہ ہے کہ بعد از مرگ میرے میرے یاروں سے
جنازہ مجھ سے مشتِ استخواں کا اٹھ نہیں سکتا

جسے لغزش ہو میخانے کے در پر پھر وہ کیا سنبھلے
کہ کہتے ہیں گرا اس آستاں کا اٹھ نہیں سکتا

یہ کس کی تیغ سے سیراب ہو کر ایسے سوتے ہیں
جو سر بالیں سے ان آسودگاں کا اٹھ نہیں سکتا

نہ باندھ اب آشیاں اپنا تو شاخِ گل پر اے بلبل
کہ اس سے بوجھ تیرے آشیاں کا اٹھ نہیں سکتا

حکایت زلف کی تیری عجب پُر پیچ لکھی ہے
کسی سے ایک حرف اس داستاں کا اٹھ نہیں سکتا

غرور اور ناز تم جو کچھ کرو ہم کو قبول اے جاں
یہ نکتوڑا[1] تمھارے پاسباں کا اٹھ نہیں سکتا

---

۱ - نکتوڑا (ہ) : نخرا -

نہ اسبابِ تعلق سے دل اپنا باندھ ، کہتے ہیں
کہ اُٹھتے وقت اسباب اس جہاں کا اُٹھ نہیں سکتا
ہوا ہوں ناتواں اتنا کہ میرا نام اگر لکھیں
تو پھر صفحے سے نام اس ناتواں کا اُٹھ نہیں سکتا
مزاج اپنا زبس نازک بڑا ہے **مصحفی** ہم سے
غرور اور ناز اس رعنا جواں کا اُٹھ نہیں سکتا

۱۳۹

یہ خیال اک دن اسی صورت فزوں ہو جائے گا
رفتہ رفتہ ، مجھ کو سوجھے ہے ، جنوں ہو جائے گا
اس قدر بھی کوچہ گردی مت کر اے دل باز آ
دیکھ میں کہتا ہوں تو رسوا کہوں ہو جائے گا[1]
خدمتِ پیرِ مغاں سے منہ نہ موڑ اک جام میں
صاف جوں آئینہ بیروں و دروں ہو جائے گا
ان حنائی ہاتھوں کو پردے میں رکھ بہرِ خدا
مفت میں ظالم کسی کا ورنہ خوں ہو جائے گا
تابش خورشید میں تو گھر سے باہر مت نکل
پھول سا رخسارہ تیرا لالہ گوں ہو جائے گا
گرد بادِ آہ آیا گر کبھی چکر کے بیچ
خیمۂ افلاک دیکھوگے نگوں ہو جائے گا
کب یقیں تھا ہم کو اے پیارے کہ ہنگامِ عتاب
لب کا بھی ہلنا ترے ہم پر فسوں ہو جائے گا

---

۱ ۔ کہ رسوا تو یوں ہو جائے گا ۔

۱۱۹

گو کہ اب پاتے نہیں ہم اس کا کوچہ **مصحفی**
شوق اگر یہ ہے تو اک دن رہنموں ہو جائے گا

۱۲۰

ساقی شراب لایا، مطرب رباب لایا
مجھ پر تو اک قیامت، عہدِ شباب لایا

دل درد و غم کی اس کے ہرگز[۱] نہ تاب لایا
یہ ہر گھڑی کا رونا اور اک عذاب لایا

کیا دور ہے جو پردہ رخ سے ترے اٹھاوے
عرصے میں مہر و مہ کو جو بے نقاب لایا

کہتا نہ تھا میں اے دل مت جا تو اس گلی میں
آخر تو مجھ پر آفت خانہ خراب لایا

میں سر کو اپنے رکھ کر زانو پہ خوب رویا
نامے کا میرے قاصد اچھا جواب لایا

اے عاشقو، مبارک ہو تم کو عیدِ قرباں
پھر نیمچے کو اپنے دے کر وہ آب لایا

دور فلک سے ہر گز شاکی نہیں میں اب تک
گردش میں گو کہ مجھ کو جوں آفتاب لایا

آئینہ کیا کہ ہم نے پتھر پہ گر نظر کی
چہرے پر اپنے وہ بھی اک آب و تاب لایا

اے **مصحفی**، تو اب منہ کیا دیکھتا ہے پی لے
ہو یار آپ ساقی جامِ شراب لایا

---

۱ - آخر: ل ۱ - مرکر: لیث -

۱۴۱

جی رات لبوں پر آ رہا تھا
مرنے میں ہمارے کیا رہا تھا

بارے ترے عہد میں وہ نکلا
خورشید بہت چھپا رہا تھا

تھے جن دنوں ہم کسی کے عاشق
سودا ہمیں سال ہا رہا تھا

کیا وقت تھا وہ بھی جب کہ ہم تم
مے پیتے تھے ابر چھا رہا تھا

واں چغد کا آشیانہ ہے اب
اک عمر جہاں ہما رہا تھا

میں نے شبِ وصل اسے نہ چھوڑا
ہر چند کہ وہ کھنچا رہا تھا

آنکھوں نے تری بہت چھکایا
اک عمر میں پارسا رہا تھا

میں سینے سے دل نکال ڈالا
یہ مجھ کو بہت ستا رہا تھا

مارا گیا دل گلی میں تیری
اپنا یہی آشنا رہا تھا

میں تاب نہ لا سکا وہ مجھ سے
آنکھیں تو بہت ملا رہا تھا

شاید کہ شبِ گذشتہ اس کا
معشوق اس سے جدا رہا تھا

میں صبح جو مصحفی کو دیکھا
آنکھوں سے ندی بہا رہا تھا

۱۴۲

آساں نہیں ہے تنہا در اس کا باز کرنا
لازم ہے پاسباں سے اب ہم کو ساز کرنا

گر ہم مشیر ہوتے اللہ کے تو کہتے
یعنی وصال کی شب یا رب دراز کرنا

اس کا سلام مجھ سے اب کیا ہے، گردشِ رو
طفلی میں میں سکھایا جس کو نماز کرنا

از بس کہ خونِ دل کا کھاتا ہے جوش ہر دم
مشکل ہوا ہے ہم کو اخفائے راز کرنا

با یک نیاز اس سے کیوں کر کوئی بر آوے
آتا ہو سو طرح سے جس کو کہ ناز کرنا

کرتے ہیں چوٹ آخر یہ آہوانِ بد مست
آنکھوں سے اس کی اے دل ٹک احتراز کرنا

اے آہ اس کے دل میں تاثیر ہو تو جانوں
ہے ورنہ کام کتنا، پتھر گداز کرنا

ہووے گی[1] صبح روشن اک دم میں وصل کی شب
بند قبا کو اپنے ظالم نہ باز کرنا

اے مصحفی ہیں دو چیز اب یادگارِ دوراں
اس سے تو ناز کرنا، مجھ سے نیاز کرنا

---

۱ - ہو جاگی : ل ۲ -

۱۲۳

یہ چہرۂ پُل‌دار نہ دیکھا تھا سو دیکھا
بانکوں میں طرح دار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

دل لے کے مرا کر گیا انکار بدیہی
اس طرح کا عیار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

بن دیکھے ترے رہنے لگیں خون میں ڈوبی
آنکھوں نے یہ آزار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

مت پوچھ حقیقت شب ہجراں میں یہ اپنی[1]
جو ہم نے کبھی یار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

پامال جسد جس نے کیا برگ گلِ تر
اس رنگ کا رخسار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

زخموں سے تری تیغ کے میں اے مرے قاتل
ہر عضو کو گلزار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

جاوے تو صبا کہیو جدائی میں تمھاری
مرغانِ گرفتار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

اک جنبشِ مژگاں میں تری ہم نے مری جاں
جو حادثہ زنہار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

شب مصحفی مارا گیا جا بزمِ بتاں میں
خوں ریزوں کا دربار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

---

۱ - یہ میری : ل ۱، ۲ -

۱۲۴

قاصد کبھی ہمارا دل‌دار تک نہ پہنچا
الٹا ہی نت پھر آیا خط یار تک نہ پہنچا

ہم اک طرف کہ ہے ہے اس نو بہار میں تو
اک پر بھی اپنا اڑ کر گلزار تک نہ پہنچا

تیرِ مژہ سے اس کی دل بندھ کے رہ گیا حیف
ابروے راست خم کی تلوار تک نہ پہنچا

آنکھوں سے اشک ڈھل کر مژگاں تلک تو آیا
مژگاں سے پر ڈھلک کر رخسار تک نہ پہنچا

اس سر میں بھی تو آخر رکھتا تھا شورِ منصور
حیراں ہوں میں کہ یہ سر کیوں دار تک نہ پہنچا

لختِ جگر میں اپنے کر جمع گل بنایا
سو وہ بھی گل بتاں کی دستار تک نہ پہنچا

طفل سرشک میرا یوسف سے کم نہ تھا کچھ
پر حیف مصر کے یہ بازار تک نہ پہنچا

چاہا تھا رات میں نے گھر اس کے کود جاؤں
یہ دستِ کوتہ اپنا دیوار تک نہ پہنچا

دل مرغِ ناتواں تھا بعد از رہا ہوئے بھی
اڑ کر درِ قفس سے دیوار تک نہ پہنچا

روز اجل بہ سختی دی جان مصحفی نے
یٰسین خواں کوئی اس بیمار تک نہ پہنچا

۱۲۵

کریں گے خواب راحت یا یہی جنجال ہووے گا
خدا جانے کہ بعد از مرگ کیا احوال ہووے گا

اگر اس شمع کے شعلے میں یہ کچھ جگمگاہٹ ہے
تو ہر پروانہ اس کا مرغِ زریں بال ہووے گا

قدم اس دھج سے مت رکھا کرو وقتِ خرامیدن
اگر تم یوں چلو گے اک جہاں پامال ہووے گا

پس از مردن ہمارا داغِ دل ضائع نہ جاوے گا
کسی لالے کے رخسارے کا یہ بھی خال ہووے گا

ترے ملنے سے پیارے اور بیتابی ہوئی دونی
غلط سمجھے تھے ہم اس دل کو استقلال ہووے گا

میں جس دم دیکھوں ہوں اپنی طرف ہنس کر یہ کہتا ہوں
کوئی مجھ سا بھی دنیا میں پریشاں حال ہووے گا

لگا جوں ہی مرے پہلو پر، اک جھنکار سی نکلی
کٹار اس خونیِ بے رحم کا اک ڈال[1] ہووے گا

ہماری اشک ریزی کا تماشا دیکھیو اس دم
ہمارے ہاتھ میں جب نامۂ اعمال ہووے گا

غلط ہے مصحفی مجلس میں اس کی شعر پڑھتا تھا
کسی گوشے میں بیٹھا با زبانِ لال[2] ہووے گا

---

۱ ۔ اک ڈال : بے جوڑ ۔
۲ ۔ زبان لال (ت) : بمعنی گنگ ـــــــ

زبان لال کہاں اور مدیح تاج خروس
گرا ہے خاک پہ کیا لعل افسر کاؤس (مومن)

۱۲۶

ہجراں میں بس کہ مجھ پہ عذابِ الیم تھا
ہر شعلہ آہ کا مری نارِ جحیم تھا

کرتے تھے گل مزار سے میرے شگفتگی
یعنی کبھی ادھر بھی گزارِ نسیم تھا

میں بے کسی پر اپنی جو روتا تھا روزِ ہجر
ہر قطرہ اشک کا مرے درِ یتیم تھا

افشاے عشق بعد خدا جانے کیا بنے
جب تک حجاب تھا یہی امید و بیم تھا

کرتا تھا کون شب ترے کوچے میں آہ آہ
شعلہ بلند تا سرِ عرشِ عظیم تھا

کس زلفِ مشک فام کی بو تھی جو باغ میں
ہر ایک غنچہ نافۂ عنبر شمیم تھا

پردوں میں جسم کے تھی مرے ہیئتِ فلک
یاں تک کہ تارِ اشک خطِ مستقیم تھا

چلتی تھی تیغ واں سرِ دشمن پہ **مصحفی**
اور میرا مارے رشک کے یاں دل دو نیم تھا

۱۲۷

نام مت لے تو گھر کے جانے کا
فائدہ کیا مرے کڑھانے کا

رگِ گل سا چبھے ہے جی میں مرے
خار بلبل کے آشیانے کا

آئنہ پاس رکھ جو تیرے تئیں
شوق ہے انکھڑیاں لڑانے کا

جو ملا اس نے بے وفائی کی
کچھ بھروسہ نہیں زمانے کا

تیرے نازک لبوں سے سیکھا ہے
غنچہ انداز مسکرانے کا

یار کیسا شتاب جاتا ہے
کشتہ ہوں ان قدم اٹھانے کا

تیغ ابرو کو اس کی رکھ تو عزیز
مصحفی ہے یہ پھل ٹھکانے کا

۱۲۸

اٹھائے زخم اتنے کس نے ، میرا سا جگر کس کا
ہوا یوں معرکے میں عشق کے ، سینہ سپر کس کا

ادھر تو دیکھ ، دیکھے ہے ترے منہ کو کھڑا عالم
تو منہ دیکھے ہے آئینے میں اے رشکِ قمر کس کا

صدائے الفراقِ آوازِ آبِ جو سے آتی ہے
خدا جانے سحر گلشن سے تھا عزم سفر کس کا

سر اپنا پیٹتا پھرتا ہوں مدت سے میں گلیوں میں
کوئی جو مجھ کو کہتا ہو کہ ہے یہ نوحہ گر کس کا

کسی کی جب نظر ترچھی پڑے ہے آہ کرتا ہوں
کھبا ہے دل میں میرے آہ! اندازِ نظر کس کا

گریبانِ سحر کو چاک دیکھا میں نے کیا جانے
گریباں کھل گیا تھا نیند سے اٹھتے سحر کس کا

خدا کے واسطے کافر کی ٹک رفتار کو دیکھو
قدم پڑتا ہے وقتِ جلوہ اس انداز پر کس کا

ہلال عید میں اک صورتِ آغوش نکلے ہے
نظر تو کیجیو یارو یہ ہے طوقِ کمر کس کا

چلا ہے سیکڑوں خط لے کے ظالم مجھ سے سچ کہیو
پڑھاوے گا تو اس کو پہلے خط اے نامہ بر کس کا

ہزاروں آرزوے کشتہ میرے دل میں پنہاں تھیں
خدا جانے یہ خوں تم سے بہا اے چشم تر کس کا

بھلا ہم بھی تو دیکھیں کون وہ دلخواہ ہے تیرا
کیا کرتا ہے اے دل ذکر تو شام و سحر کس کا

تمھیں میاں مصحفی کیا ہو گیا ہے بیٹھے راتوں کو
یہ قصہ تم کہا کرتے ہو اب دو دو پہر کس کا

۱۲۹

پاؤں گر رکھ نہیں سکتا ہے تو در پر اپنا
منہ تو غرفے سے دکھا دے کبھو چھپ کر اپنا

جب نہ تب اس سے ہی ہم کرنے لگے ہیں پنجہ
زور چلتا ہے گریباں ہی پر اکثر اپنا

مفت میں خون مرا ہوگا ترا دامن گیر
پونچھیو گوشۂ دامن سے نہ خنجر اپنا

ہم کو کیا کام ہے عالم کے بد و نیک سے یار
ہیں تو عالم میں، پہ ہے عالمِ دیگر اپنا

سرخیِ رنگِ حنا یہ ہے تو ان ہاتھوں سے
خون ہووے گا کسی روز مقرر اپنا

زیورِ حسن ترا دیکھ کے اے رشکِ بہار
گل نے برباد دیا سب زر و زیور اپنا

کوئی اس میکدے میں ہم کو نہیں دیتا مے
ہر طرف خالی لیے پھرتے ہیں ساغر اپنا

سانس سینے سے کچھ اوپر کو چڑھی جاتی ہے
آن پہنچا ہے مگر وقتِ مقرر اپنا

مصحفی ایک غزل اور بھی لکھ آخر تو
کھولے بیٹھے ہیں سبھی بزم میں دفتر اپنا

۱۵۰

سینہ جلتا ہے تپِ عشق سے اکثر اپنا
ہاتھ رہتا ہے اسی واسطے دل پر اپنا

وہ جو آتے تھے چلے پیچھے گری ان پر برق
منہ پھرایا جو کل اس شوخ نے ہنس کر اپنا

جاوہ گر زلفِ سیہ سے نہیں اس کی درگوش
شبِ تاریک میں چمکے ہے یہ اختر اپنا

خس سمجھ کر بھی کسی نے نہ جلایا اس کو
اتنے بھی کام نہ آیا تنِ لاغر اپنا

رسم تا نامہ بری کی نہ رہے عالم میں
سب سے پہلے میں کیا ذبح کبوتر اپنا

بت تراشی پہ میں آؤں تو مری صنعت دیکھ
تیشہ رکھ دیوے وہیں ہاتھ سے آذر اپنا

آؤ جی آرزوے قتل میں ہم مرتے ہیں
کس طرف اٹھ گئے تم نیمچہ لے کر اپنا

مصحفی نقشِ قدم وار میں جم بیٹھا ہوں
نہیں اٹھنے کا اب اس کوچے سے بستر اپنا

ردیف ب

۱۵۱

نوح کا یہ نہیں طوفاں کہ زمیں جاوے ڈوب
میں کروں گریہ تو تا عرش بریں جاوے ڈوب

رنگ لعلیں[1] کو ترے لب کی جو دیکھے تو وہیں
عرقِ شرم میں خجلت سے نگیں جاوے ڈوب

خونِ عشاق کے دریا میں تو گھوڑے کو نہ ڈال
پھر غضب ہے جو ترا دامن زیں جاوے ڈوب

عین برسات میں قاصد اسے بھیجوں ہوں تو وہ
یہ دعا مانگے ہے رستے میں کہیں جاوے ڈوب

جی میں آتا ہے کہ کر اپنے نوشتے کو یاد
روئیے اتنا کہ سجدے میں جبیں جاوے ڈوب

دیدے تیورا گئے ہیں اور غش آتا ہے چلا
مجھ کو یہ ڈر ہے مرا جی نہ کہیں جاوے ڈوب

اس غضب سے تو مجھے ذبح نہ کرنا کہ میاں
خوں میں تا قبضہ ترا خنجر کیں جاوے ڈوب

---

۱ ۔ رنگ لالی ؛ ل ۱ ۔

تاؤ[1] پر آوے جو وہ حسن تو جل جاوے چگل[2]
لہر پر آوے جو وہ زلف تو چیں جاوے ڈوب

مصحفی چاہ زنخداں میں گرا ہے تیرے
کھا کے دو غوطے مزہ ہے جو وہیں جاوے ڈوب

۱۵۲

شب کیا میں نے جو اک نالۂ زار آخرِ شب
سوتے سوتے اٹھے ہمسائے پکار آخر شب

یار بن سیر گلستان سے میں مجروح آیا
تیر سی دل میں لگی صوتِ ہزار آخر شب

وصل کی شب ہے دلا اتنی نہ بےہوشی کر
ورنہ اس سے کا تو کھینچے گا خمار آخر شب

کم نصیب ایسے سے کیا وصل کا پوچھو ہو مزہ
جس کو مر مر کے ملا بوس و کنار آخر شب

ہم نے مضمون ترے دزدِ حنا کا باندھا
لگ گیا ہاتھ ہمارے یہ شکار آخر شب

اولِ شب سے مجھے نیند نہ آئی جس دن
اس نے مجھ سے کیا ملنے کا قرار آخر شب

آہ وہ آتشِ سوزاں ہے کہ ہمسایوں کو
سینے میں ڈالے ہے نت اس کا شرار آخر شب

---

۱ - تاؤ (ہ) : گرمی ، غصہ -
۲ - چگل : ترکستان کا ایک شہر جہاں کا حسن مشہور ہے -

مل گئے خاک میں ہم صبح کے ہوتے شبِ وصل
اٹھ چلا جھاڑ کے دامن کو جو یار آخر شب

جاگتے تھے جو نصیب اپنے تو اس کوچے میں
کبھی یاروں کا بھی ہوتا تھا گزار آخر شب

شب تری کاکلِ مشکیں کی مسیحائی سے
کر گئی زندہ ہمیں بادِ بہار آخر شب

وے بھی کیا دن تھے کہ جب آنکھ کھلے تھی اپنی
چمن ِ وصل کی لوٹیں تھے بہار آخر شب

کانپ اٹھتا ہوں میں جس وقت ترے کوچے میں
نالے کرتا ہے کوئی زار و نزار آخر شب

مصحفی دیکھتے تھے ہم بھی سر شعلۂ شمع
جب کیا جی کو پتنگے نے نثار آخر شب

۱۵۳

مجھ کو صحبت ہے سر زلف سے اب آخر شب
ہے یہی جاں کنی کا میری سبب آخر شب

کھل گئی آنکھ مری سوتے سے جب آخر شب
تہ دنداں نظر آئے مجھے لب آخر شب

اے دل اب تو کہیں شیون کے تئیں کر موقوف
تعزیہ دار بھی سو رہتے ہیں سب آخر شب

یہ وہی جانے جو اٹھ اٹھ کے کبھی جاگا ہو
لذت اک وصل میں ہوتی ہے عجب آخر شب

اول شب تو بڑی بھیڑ ہے اس مجلس میں
ہووے تو ہووے کہیں ملنے کا ڈھب آخر شب

جب سے اس نالۂ جاں سوز نے سر کھینچا ہے
آگ اس طرح کہیں بھڑکے ہے کب آخر شب
شور بلبل سے میں شاکی نہیں اس گلشن میں
مجھ پہ نالے مرے لائے ہیں غضب آخر شب
در و دیوار سے آواز بگیر آتی ہے
یار کے کوچے میں ہم جاتے ہیں جب آخر شب
نہ کھلی مصحفی اس کافرِ بے درد کی آنکھ
میں نے نالے کیے ہر چند کہ شب آخر شب

۱۵۴

پاؤں اس دھج سے تو رکھو نہ زمیں پر صاحب
پھیلے کیا پڑتے ہو ہر لحظہ ہمیں پر صاحب
ہے غرض غصے کی صورت بھی تمھارے پیاری
کیا بھلے لگتے ہو اس چینِ جبیں پر صاحب
دیکھتے کیا ہو جگرخستگی میری ، کیجے
اک نظر اپنے بھی لعلِ نمکیں پر صاحب
گر تمھاری ہے یہی چال تو تم دیکھو گے
آفت آوے گی کسی خاک نشیں پر صاحب
کس کا سر کاٹ کے فتراک سے باندھا تھا جو آج
ہے بہار آپ کی اس دامنِ زیں پر صاحب
آؤ مت دیر کرو ، آ رہی ہے اپنی اب
زندگانی نفسِ بازپسیں پر صاحب
ہم نہ کہتے تھے میاں مصحفی دل اس کو نہ دو
تم بلا لائے نہ اس جانِ حزیں پر صاحب

۱۵۵

'صاد' سے چشم تو ہے زلفِ دوتا 'دال' سے خوب
حق نے یہ چہرہ بنایا ہے خط و خال سے خوب

ابر رحمت میں توقع پہ تری آیا ہوں
دھو سیاہی کو مرے نامۂ اعمال سے خوب

اک ذرا اور بھی اٹھکھیلیاں کرتے چلیے
آپ نظروں سے مری لگتے ہیں اس چال سے خوب

کیسری شال کو سر سے نہ جدا کر اپنے
چمپئی حسن ترا لگتا ہے اس شال سے خوب

میں دل آزردہ یہی جانِ حزیں رکھتا ہوں
دشمن و دوست ہیں واقف مرے احوال سے خوب

تھی گرفتاریِ ایام برا الجھیڑا[1]
مر کے ہم چھوٹ گئے[2] زیست کے جنجال سے خوب

مصحفی حال پریشاں ہے ترا وصل نہ چاہ
منہ اسے اپنا دکھانا نہیں اس حال سے خوب

۱۵۶

یہ خستہ تمام ہو چکا اب
بس اپنا تو کام ہو چکا اب

---

۱ - الجھیڑا (ہ) : جھنجٹ ، جھگڑا —

تیری زلفوں کے نہ الجھیڑے میں جو کوئی پھنسے
وہ جہاں جائے کسی طرح نمودار نہ ہو (انشا)

۲ - مر گئے چھوٹ گئے : ل ۲ -

سب ناظمِ ملک سو رہے ہائے
دنیا کا نظام ہو چکا اب

روٹھا رہا وہ یوں ہی تو اپنا
بس وعدۂ شام ہو چکا اب

ہم مل گئے خاک میں ہی ، ہم سے
ملنے کا پیام ہو چکا اب

چل سو رہیں ٹک کہ شب ہے آخر
دورِ مے و جام ہو چکا اب

قاصد اگر اُس گلی میں جاوے
کہیو کہ غلام ہو چکا اب

سیرِ شبِ ماہ یار تک تھی
لطفِ لبِ بام ہو چکا اب

دنیا ہے سرائے فانی اس سے
چلیے کہ مقام ہو چکا اب

رکھا نہ خاک مصحفی کو
آرام تمام ہو چکا اب

۱۵۷

بال و پر باز کیا چاہیے اب
یاں سے پرواز کیا چاہیے اب

بس بہت ضبطِ غمِ عشق کیا
گریہ آغاز کیا چاہیے اب

بات جانے لگی اپنی اس تک
فکرِ غماز کیا چاہیے اب

فرش پر اس کے قدم ہے اے دل
عرش پر باز کیا چاہیے اب

سخت مشکل ہے ترا بھی شکوہ
بخت ناساز کیا چاہیے اب

کیا ستم ہے کہ تصور کو ترے
اپنا ہمراز کیا چاہیے اب

مصحفی دل کوئی لیتا[1] ہی نہیں
خاک انداز کیا چاہیے اب

۱۵۸

لو اب اس دل کو تمھیں آگ لگاؤ صاحب
جھوٹی باتوں سے مرا جی نہ جلاؤ صاحب

جلوہ ہر ایک کو اپنا نہ دکھاؤ صاحب
کیا غضب کرتے ہو ٹک منہ تو چھپاؤ صاحب

کون مشتاق تھا آنے کا تمھارے ایسے
جاؤں جاؤں ہی جو کرتے ہو ، تو جاؤ صاحب

ہم سے کیا کہتے ہو پکڑے نہیں کچھ ہم نے ہاتھ
دل کے تئیں ڈھونڈ لو سینے میں جو پاؤ صاحب

یہ کوئی طور ہے منہ ڈھانپ چلے جانے کا
کس طرف جاتے ہو ٹک تو ادھر آؤ صاحب

کل سرِ راہ میں تم غیر سے کیا کہتے تھے
تم کو میری ہی قسم ہے نہ چھپاؤ صاحب

---

۱ - دیتا ہی نہیں : ل ۲ -

اور مذکور کو جانے دو خفا بیٹھے ہیں
مصحفی اب تو کوئی شعر سناؤ صاحب

۱۵۹

بات میں ہو گئے خفا صاحب
یہ بھی کوئی[1] بات تھی بھلا صاحب

اب جو یوں تم نے منہ تتھایا[2] ہے
پھر نہ بولو گے ہم سے کیا صاحب

صدقے ہیں ہم تمھاری صورت کے
زور بیٹھے ہو منہ بنا صاحب

ہیں کھلے گل کی طرح بندِ قبا
کیا تمھیں بھی لگی ہوا صاحب

ہم سے ملتے ہی بے وفائی کی
یہ ہی[3] ہوتی ہے کیا وفا صاحب

ووں ہی کچھ تم نکل ہی بھاگے ورلے
میں کوئی تم کو چھوڑتا صاحب

بچ گئے رات میرے ہاتھوں سے
دو نصیبوں کے تئیں دعا صاحب

پوچھتے کیا ہو **مصحفی** کا نشاں
خاک میں وہ تو مل گیا صاحب

---

۱ - بر وزن فع -
۲ - منہ تتھانا (ہ) : ناراض ہونا -
۳ - یہ بھی : ل ۲ -

ردیف پ

۱۶۰

سج کرکے جو آج آئے ہیں شمشیر و سپر آپ
فرمائیے یہ بارے کہ جاتے ہیں کدھر آپ

کچھ خانہ خرابی کا نہیں ان کی میں باعث
ہیں دشمنِ جاں اپنے تو یہ دیدۂ تر آپ

مانگا جو میں بوسہ، تو کہا تند ہو، مجھ کو،
یہ شوخیاں مجھ سے نہ کریں بارِ دگر آپ

مت جائیو قاصد تو مری بےخبری پر
میں گم شدہ دل اپنے کی رکھتا ہوں خبر آپ

اپنی تو نہیں خواہشِ دل گریہ پہ لیکن
کیا کیجے جو آنکھوں سے گریں لختِ جگر آپ

چھپ جاتے ہیں پھر ووں ہی مہِ عید کے مانند
آ جاتے ہیں آنکھوں میں کسی کی جو نظر آپ

اے **مصحفی**! اس کوچے سے جوں چاہیے توں اب
ہے خیر اسی میں کہ کریں عزمِ سفر آپ

ردیف ت

۱۶۱

ہو جس جگہ نہ ناوکِ تقدیر کی نشست
خاطر نشاں کرے ہے ترے تیر کی نشست

از بس کہ اس کی بزم میں ہے ازدہام خلق
میں اک طرف کہ واں نہیں تدبیر کی نشست

دنیا سے دل نہ باندھ کہ اس بزم گاہ میں
گاہے جوان کی ہے ، گہے پیر کی نشست

ربطِ گل و بنفشہ سے دیتی ہے مجھ کو یاد
عارض پر اس کی زلف گرہ گیر کی نشست

کیا بیٹھے نقشِ لالہ و گل اس ورق کے بیچ
خاکے پہ جس کے ہو تری تصویر کی نشست

اب حلقہ حلقہ بیٹھتے ہیں واں جنوں زدہ
جس در پہ تھی نہ حلقۂ زنجیر کی نشست

کیا مارے دست و پا وہ ستم کشتہ بعد قتل
ہر استخواں پہ جس کی ہو شمشیر کی نشست

دنیائے دوں نہ جائے اقامت ہے **مصحفی**
ہم اس دری پہ بیٹھے ہیں رہ گیر کی نشست

۱۶۲

ہو جس کے دل میں داغِ غمِ یار کی نشست
کیا خوش کرے اسے گلِ گلزار کی نشست

بیٹھے ہے جب کہ خانۂ زیں میں وہ طفلِ شوخ
عالم کو ذبح کرتی ہے خوں خوار کی نشست

جیتے تو گوشت پوست مرا اس کا وقف تھا
اب ہڈّیوں پہ ٹھہری ہے تلوار کی نشست

بیٹھا ہوں دست بستہ میں یوں اس کے رو بہ رو
ہو محکمے میں جیسے گنہ‌گار کی نشست

پھر ہم جو تیری بزم میں آویں تو کیا کریں
واں تو ہمیشہ رہتی ہے دوچار کی نشست

یہ ظرف تنگ اور وہ دریاے بے کراں
اس دل میں کیوں کہ ہو غمِ بسیار کی نشست

کیا بک گیا ہے ہاتھ کسی کے تو مصحفی
اب پھر شروع کی ہے جو بازار کی نشست

۱۶۳

دل جانے ہے اس ابروے خم‌دار کی نشست
کر دی ہے پست جس نے کہ تلوار کی نشست

دیکھے سے اس کے ، دل تو مرا داغ ہو گیا
کیا پوچھتے ہو خالِ رخِ یار کی نشست

اس تفرقے میں حیف کہ موقوف ہو گئی
تھی میرے اس کے ، وہ جو کبھی پیار کی نشست

اتنا تو اچپلا[1] ہے کہ مانی نہ لکھ سکا
جوں برق اک جگہ تری رفتار کی نشست

جس نے سرِ بریدہ کو کرسی کیا اسے
کم تختِ سلطنت سے نہیں دار کی نشست

سوزن نہ مارو کوئی کہ ہر زخم پر مرے
سوزن زن آپ ہے مری منقار کی نشست

---

۱ - اچپلا : (ہ) چلبلا ، شوخ -
اچپلاہٹ، اچپلائی (ہ) : شوخی -

چتون میں یہ لگاوٹ ، سرمے کی وہ گھلاوٹ
پھر قہر یہ سجاوٹ ، یہ اچپلائیاں ہوں

سطحِ زمیں ہے صفحۂ صورت گراں کہ ہے
جس پر ہزار بے خود و ہشیار کی نشست

گل چیں یہ کب روا ہے کہ ایسی بہار میں
برخاست ہووے گل کی ، رہے خار کی نشست

گریے سے میرے موسم برسات لگ گیا
یارو عجب نہیں در و دیوار کی نشست

ق

اس صفحے پر برائے خدا دیکھیو ذرا
تیرے قلم کی اور مرے اشعار کی نشست

دو چار گرچہ بستہ و آوردہ ہیں ولے
نقشِ نگیں ہے **مصحفی** دو چار کی نشست

۱٦۴

ایسا بھی کوئی[1] کرے ہے خلل ملک دیں میں بت
ہر گز میں اس کی شکل کا دیکھا نہ چیں میں بت

مذہب میں میرے ، شیخ کے ، اتنا ہی فرق ہے
میں ہاتھ میں رکھوں ہوں ، تو وہ آستیں میں بت

دیں ہو گیا بہ کفر بدل یاں تلک کہ خلق
رکھے ہے جائے قبلہ نما اب نگیں میں بت

سجدہ کرے خدا کو تو کیجو سمجھ کے شیخ
اب بھی گڑے ہوئے ہیں ہزاروں زمیں میں بت

---

۱ - بر وزن فع -

جاؤں طواف کرنے کو کیوں کر میں **مصحفی**
کعبے کے طاق میں ہے ، مری ہے نگیں میں بت

۱٦۵

رہا یہ دل تو بیمارِ محبت
گیا اس سے نہ آزارِ محبت

ہیں عاشق اور بھی لیکن نہ ہوگا
کوئی مجھ سا گنہگارِ محبت

نہ دیکھا جس نے روے دانہ و دام
سو میں ہوں وہ گرفتارِ محبت

ہمارے نالۂ آتش فشاں نے
کیا پھر گرم بازارِ محبت

نظر کرتے ہی اس کافر مژہ پر
چبھا دل میں مرے خارِ محبت

اسے کیا دوش[1]، رسوا ہو گیا ہوں
میں آپھی کرکے اظہارِ محبت

بہ چشمِ کم نہ دیکھو **مصحفی** کو
ہے دولت خواہِ سرکارِ محبت

---

۱ ۔ دوش (ہ) : الزام ۔

١٦٦

جگر میں کھٹکے ہے خارِ محبت
خلش کرتا ہے اظہارِ محبت

نگاہوں سے نگاہیں جب ملیں ہیں
بٹا جاتا ہے تب تارِ محبت

مرا دل دامِ زلفِ عنبریں سے
نہ چھوٹا تھا گرفتارِ محبت

محبت میں موے ہم تو بھی ہم سے
رہا پوشیدہ اسرارِ محبت

زیانِ جاں وہاں اول قدم ہے
نہ پوچھو سودِ بازارِ محبت

اسے کیا کام ہے دیر و حرم سے
جو کافر ہو پرستارِ محبت

نپٹ احوالِ بد ہے **مصحفی** کا
بچے گا کیا یہ بیمارِ محبت

١٦٧

برا ہوتا ہے اظہارِ محبت
نہ کیجے گا ہے اقرارِ محبت

وہ مجرم ہوں کہ یاروں نے رکھا ہے
لقب میرا زیاں‌کارِ محبت

بس اب اقرار کے ثمرے کو دیکھا
میں اور من بعد انکارِ محبت

نہ آیا شام بھی گھر پھر کے اپنے
تماشائیِ بازارِ محبت

میں ہردم خوں میں تڑپوں ہوں کہ مجھ کو
یہی ہے سیرِ گلزارِ محبت

بہت اے **مصحفی** آنکھوں نے کھایا
فریبِ حسنِ تکرارِ محبت

خدا کے واسطے تو چھوڑ اب تو
یہ استبداد و اصرارِ محبت

۱۶۸

نہ کر مجھ سے تو انکارِ محبت
کوئی چھپتا ہے آزارِ محبت

مرے چہرے کا رنگِ زعفرانی
کرے ہے آپ اظہارِ محبت

بہ ایں نازک تنی اے وا مصیبت
ہوا تو ناز بردارِ محبت

صراحی سی تری گردن ہوئی ہائے
اسیرِ تارِ زنارِ محبت

بھلا میری طرح صد شکر اے شوخ
ہوا تو بھی گرفتارِ محبت

کسی کے نشترِ مژگاں سے بارے
چبھا دل میں مرے خارِ محبت

ق

تری آنکھوں سے لب سے رنگِ رخ سے
عیاں ہیں سارے آثارِ محبت

ستم ہے یہ کہ تو بھی میرے آگے
نہیں کرتا ُتو اقرارِ محبت

نہ کر یہ بات پنہاں مصحفی سے
کہ جانے ہے وہ بیمارِ محبت

۱۶۹

اُس کی ابرو سے کچھ آئی نہ تھی دوچار کی موت
کتنے اس شبہے میں مارے گئے تلوار کی موت

رو بہ رو میرے کوئی بات بھی اس سے نہ کرو
ہائے اس بات میں ہے میرے دلِ زار کی موت

مارے بے طاقتیوں کے یہ موا جاتا ہے
کاش ! آ جاوے شتابی ترے بیمار کی موت

آب و دانے کا گلہ تجھ سے نہیں اے صیاد !
ہے مگر قیدِ قفس ، مرغِ گرفتار کی موت

عشق کا جس کو مرض ہو وہ یہی کہتا ہے
نہ ہو دشمن کی بھی قسمت میں ، اس آزار کی موت

مصحفی مل کے ہم جاتے ہیں اس کوچے میں
جب کبھی آتی ہے اس شہر میں دوچار کی موت

۱۷۰

جب سے کافر نے سنی ہے کسی بدذات کی بات
تب سے کرتا ہی نہیں لطف و عنایات کی بات

جنبشِ چشم سے اس کی؛ کوئی واقف نہ ہوا
کون بیمار کی سمجھے ہے اشارات کی بات

اک ہمیں ہیں کہ نہیں آتے زباں پر اس کی
درمیاں رہتی ہے یوں سب سے ملاقات کی بات

دن کو اب شیخیاں کرنے لگے میرے آگے
چلو، جاؤ بھی میاں، بھول گئے رات کی بات؟

مصحفی شوق ہوا ہے سببِ طولِ کلام
ورنہ کیا ہے سخنِ عشق تو اک بات کی بات

۱۷۱

زبس کہ گریے سے فرصت ہمیں نہیں دن رات
رہے ہے دیدۂ گریاں پہ آستیں دن رات

بزار حیف بہ ایں چہرۂ شگفتہ چو گل
خراب و خوار پھرے تجھ سا نازنیں دن رات

نہ ہووے کیوں کہ مجھے درد سر کہ کافر کی
لپی ہی رہتی ہے صندل سے کچھ جبیں دن رات

زمیں کا پیٹ نہیں اب تلک بھرا تب تو
چلا ہی جاوے ہے عالم تہِ زمیں دن رات

درازیِ شب ہجراں سے ظلم ہے مجھ پر
خدا کرے کہ برابر بھی ہو کہیں دن رات

کبھو جو پھر گیا پلکوں کا اس کی منہ ابدھر
مرے جگر کے اوپر برچھیاں چلیں دن رات

شکست زلفِ بتاں ہو اگر ذرا بھی درست
دلِ شکستہ مرا ، کیوں رہے حزیں دن رات

سیاہ بختی پر اس کی نہ جائیو ہرگز
کہ زیرِ سہر ہے عاشق کے جوں نگیں دن رات

خوشی کا نام نہ دیکھا کہیں زمانے میں
جیے تو ہم ، پہ رہے **مصحفی** غمیں دن رات

۱۷۲

ہم کو گر رکھا زمیں میں دیدۂ گریاں سمیت
روز محشر خاک سے اٹھیں گے ہم طوفاں سمیت

ہائے رے وہ شرمگینی اور منحرف دیکھنا
دل میں پھرتی ہیں وہ نظریں سایۂ مژگاں سمیت

وہ جو تھے پلکوں پہ میری ، چندقطرےاشک کے
جھڑ پڑے دامن میں آخر حسرت و حرماں سمیت

ان ستم کشتوں میں ہوں تیرے کہ میری خاک سے
تیر بھی نکلے ہیں گر اے شوخ تو پیکاں سمیت

حشر کے فریادیوں پر عرصہ ہو جاوے گا تنگ
ہم بھی آ نکلے اگر واں ، اس دلِ نالاں سمیت

جس نے دیکھا ہو ترا چاکِ قبا اے سروِ ناز
کیوں نہ پھاڑے وہ گریباں مثلِ گل داماں سمیت

عالمِ زیرِ زمیں بھی حسن سے خالی نہیں
خاک سے گل تب تو نکلے ہے لبِ خنداں سمیت

اس ادا سے کل وہ آیا باغ میں دامن کشاں
ہو گئے گل فرش سارے سنبل و ریحاں سمیت

مصحفی گر یہ غزل میں لکھ کے بھیجوں لکھنئو
میر رخت تازہ گوئی نہ کرے دیواں سمیت

۱۷۳

اشک سے میرے بچے ہمسایہ کیوں کر گھر سمیت
بہہ گئی ہیں کشتیاں اس بحر میں لنگر سمیت

چشم زخم[1] آنکھیں لڑانے سے اسے پہنچے مگر
رہتے ہیں جو رخنۂ دیوار بند اب در سمیت

مت کہ داری پہ نازاں ہو کہ اک گردش کے بیچ
مل گئے ہیں خاک میں یاں کتنے سر ، افسر سمیت

کس کے کانوں کی صفا کا شور دریا میں گیا
جو پڑا بے تاب پھرتا ہے صدف ، گوہر سمیت

یاں تو لکھتے ہی نہ تھے یا آئے جب لکھنے اوپر
صفحے کے صفحے سیاہ ہم کر گئے مسطر سمیت

ایسے قاتل پر کوئی اثبات خوں کیوں کر کرے
خاک میں جس نے سلائے سینکڑوں خنجر سمیت

بے طرح سے آ پھنسے ہیں چنگل صیاد میں
دیکھیے چھوٹیں گے کیوں کر یاں سے بال و پر سمیت

کس کی مژگاں کا میں کشتہ ہوں کہ ہنگام بہار
سبزہ میری خاک سے اگتا ہے ہر نشتر سمیت

---

۱ - چشم زخم (ف) : نقصان جو آنکھیں لڑانے سے پہنچے ۔

عشق کی رہ وہ بری رہ ہے کہ جس میں مصحفی
صاحبِ طبل و علم ، حیران ہیں لشکر سمیت

۱۷۴

بس کہ گرمِ گریہ تھا دل رات چشمِ تر سمیت
لخت دل دامن میں گرتے تھے مرے اخگر سمیت

تو سہی ناصح کہ میں اپنے گریباں کے تئیں
دھجّیاں کرکے اڑا دوں دامنِ محشر سمیت

کس کے تئیں مارے ہوئے آتا ہے ظالم سچ تو کہہ
بھر رہا ہے ہاتھ تیرا خون میں خنجر سمیت

اس ہوا میں کر رہے ہیں ہم ترا ہی انتظار
آ کہیں جلدی سے ساقی شیشہ و ساغر سمیت

میں ہی جانوں ہوں کہ جیسی ہے کسی سے شمع بر
جل کے خاکستر ہوا پروانہ بال و پر سمیت

جب سے دیکھا ہے ترا روئے عرق آلودہ جان
آسماں پھرتا ہے تیرے گرد نِت اختر سمیت

مصحفی چرخِ مقرنس[1] ہے وہ فانوسِ خیال
جس میں شاہانِ جہاں گردش میں ہیں لشکر سمیت

---

۱ ۔ مقرنس (ع): سقف یا گنبد گچ ۔ عمارت عالی کہ در سقف آن نقش و نگار برجستہ . . . (فرہنگ عمید ، ص ۱۱۲۳) ۔

۱۷۵

کچھ مجھ سے ان دنوں نہیں اس کی نظر درست
پہنچی ہے میرے عشق کی اس کو خبر درست

صیاد سے کہو پر و پیکاں کو آب دے
اب ہم نے پھر کیے ہیں ذرا بال و پر درست

نت پرزے پرزے کرکے اڑاتا رہا وہ شوخ
لایا نہ واں سے ایک بھی خط نامہ بر درست

روتا ہوں جب میں یاد کر اس رشکِ بدر کو
ہر اشک سے بنے ہے زمیں پر قمر درست

دو کہیے[1] جو کوئی ہم کو تو ہم مانیں کیوں برا
اس عہد میں خراب ہیں اہلِ ہنر درست

میرے دلِ شکستہ کو کہتی ہے دیکھ خلق
کیا زور آئنہ ہے یہ ، جڑ جائے اگر درست

کٹ کٹ کے اب تو سینے سے نکلے ہے مصحفی
وے دن گئے کہ تھا کبھی اپنا جگر درست

۱۷۶

سو دل سے تیرے تیر کا گزرا ہے سر درست
پیکاں سے تیرے کس کا رکھتا ہے جگر درست

وا حسرتا ! کہ قافلہ یاروں کا لد چکا
اور ہم سے ہو سکا بھی نہ سازِ سفر درست

---

۱ ـ دو کہنا (ف) : الزام دینا ، عیب نکالنا ، لعن طعن کرنا ۔

۱۶۰

ہوتی نہیں درست شکن اس کی زلف کی
کرتا رہے ہے گرچہ وہ شام و سحر درست

ہے ہے کہ آشیاں پہ مرے برق ہے گری
جب فصلِ گل میں میں نے کیے بال و پر درست

مرغانِ میوہ خوار سے فریاد ہے کہ ہائے
اس نخل سے گرا نہ کبھی اک ثمر درست

جب نیمچے کو اس نے میاں سے علم کیا
خورشید کی رہی نہ فلک پر سپر درست

میرا دلِ شکستہ وہ شیشہ ہے مصحفی
جس شیشے کو کرے نہ کوئی شیشہ گر درست

۱۶۷

اور یاں پیر و جواں جتنے ہیں ، ہیں پیر پرست
میں وہ کافر ہوں جسے کہتے ہیں تصویر پرست

سجدہ کرتا ہوں میں محراب سمجھ کر اس کو
عشق نے تیرے کیا ہے مجھے شمشیر پرست

در و دیوار کی صورت کا تماشائی ہوں
میں ترے کوچے میں جوں مردمِ تعمیر پرست

عکسِ خوباں سے ہوا آبِ رواں بت خانہ
جس کی ہر موج ہے اک ہندوے تصویر پرست

زلفِ مشکیں کے ترے گرد ہے یوں اک عالم
خانۂ کعبہ میں جوں خلق ہو زنجیر پرست

مصحفی کیوں نہ تکے روے نکویاں کی طرف
چشمِ صیاد سدا رہتی ہے نخچیر پرست

۱۷۸

گرچہ جوں آئینہ اول تھا یہ دل حیرت پرست
دیکھ اس کی شکل آخر ہو گیا صورت پرست

سرو پر قمری ہے عاشق اور گل پر عندلیب
ہے ہر اک مرغِ چمن اس باغ میں الفت پرست

جان دینے سے نہیں اس کے تئیں ہرگز دریغ
عشق بازی میں یہ دل ہے زور ہی ہمت پرست

نت جن آنکھوں میں رہے تھا تیری صورت کا خیال
اب وہ آنکھیں صورتِ آئینہ ہیں حیرت پرست

مصحفی میخانۂ گلشن میں ہنگامِ بہار
ایک ہی پیالے پہ ہے گل کی طرح عشرت پرست

۱۷۹

جب سے جدا ہوا ہے تو اے مایۂ حیات
آہ و فغاں میں گزرے ہے مجھ کو تمام رات

عاشق تمام عمر ہے **قیدِ فرنگ** میں
ممکن نہیں کہ ہووے غمِ عشق سے نجات

آپس میں دوستوں کا نہ ہو جاوے خوں سپید
ہووے ذرا بھی رنگِ محبت کو گر ثبات

زلفوں نے تیری پھینکی ہے خورشید پر کمند
رخ نے ترے کیا ہے مہِ چاردہ کو مات

اللہ رے کافری ترے طرزِ خرام کی
نقشِ قدم سے کر دیا کعبے کو سومنات

دریا تمام لہروں سے آغوش ہے ہنوز
دیکھی تھی ایک دن کہیں اس سیم تن کی گات

اس سے زیادہ اور ہوں کیا خوار شیخ جی
کعبے گئے تو واں بھی نہ پوچھی کسی نے بات

زخم اپنے دیکھ دیکھ نہ رو اتنا مصحفی
کیا ڈر ہے بچ رہے کہ اگر ہے تری حیات

۱۸۰

مرے خوں کا پیاسا وہ قاتل رہا نت
گلے اس کے تیغا حمائل رہا نت

نہ تنہا میں عاشق ہوں خوش قد پہ تیرے
دلِ سروِ مائل بھی مائل رہا نت

جگر کو مرے تم سرا ہو عزیزو
کہ مژگاں کے اس کی مقابل رہا نت

زبس کشتے پر کشتے تڑپا کیے واں
گلی میں تری رقصِ بسمل رہا نت

کبھی میں نے بے پردہ اس کو نہ دیکھا
مرے اس کے اک پردہ حائل رہا نت

نہ سویا کوئی میرے عہدِ جنوں میں
کہ راتوں کو شورِ سلاسل رہا نت

نہ دی بھیک تو نے کبھی مصحفی کو
ترے در پہ پیارے وہ سائل رہا نت

۱۸۱

بدنام کیا میں نے عبث نام محبت
مجھ سے نہ ہوا کچھ بھی سرانجام محبت

یہ مے کدہ وہ ہے کہ نہ پھر ہوش میں آیا
اس مے کدے سے جس نے پیا جام محبت

میں سیکڑوں خط اس کو لکھے، اس نے نہ بھیجا
قاصد کی زبانی کبھی پیغام محبت

اے عشق اب اس دل کو ذرا چین دے ظالم
اس دل نے اٹھائے بہت الزام محبت

اس طائر وحشی کے نہ درپے ہو تو صیاد
جو چھوڑ کر آیا قفس و دام محبت

میں آپ کو بدنام کیا میوہ خوروں میں
اس باغ میں چن چن ثمر خام محبت

کیا سحر ہے آنکھوں میں تری جس نے مری جاں
کر رکھا ہے عالم کے تئیں رام محبت

کیا صوم و صلوٰۃ اس سے ہو جو شخص موا ہو
مصروف بہ دل داری احکام محبت

مارا گیا شب مصحفی اس بت کی گلی میں
سچ ہے کہ برا ہوتا ہے ابرام محبت

۱۸۲

جس میں ہم دیکھیں تھے ہر آن خدا کی قدرت
سو وہ دل یوں ہوا حیران خدا کی قدرت

پیرہن لوٹے مزے تیری ہم آغوشی کے
ہم کریں چاک گریبان خدا کی قدرت

جن سے ہم رکھتے تھے سو چشم وہ کل دیکھ ہمیں
ہو گئے جان کے انجان ، خدا کی قدرت

جب میں روتا ہوں تو دامن میں مرے گرتے ہیں
جاے اشک آنکھوں سے پیکان خدا کی قدرت

کیوں نہ مشتاق بناوے خط و خال اس رخ کا
کام میں اپنے ہے ہر آن خدا کی قدرت

چشمِ بینندہ کہاں ہے جو تماشا دیکھے
ہے "الئی الآن کما کان" خدا کی قدرت

ابھی چاہے تو اک ادنٰی کے تئیں کر دیوے
مالکِ ملک "سلیمان" خدا کی قدرت

دل کو لے جا کے مرے ہر گھڑی دکھلاتی ہے
اس کی ہر زلفِ پریشان خدا کی قدرت

پیکرِ نور فرشتوں کو ملے ، اور ہووے
خاک سے خلقتِ انسان خدا کی قدرت

مصحفی سا بشر اے شوخ ترے کوچے میں
یوں پھرے خوار و پریشان خدا کی قدرت

۱۸۳

عاشق وہی ہے کہ جس کے آنسو بہا کریں نت
رومال اشک خوں میں ڈوبے رہا کریں نت

مجلس تلک رسائی اس کی نہیں ، وگرنہ
ہم ساری رات بیٹھے ، قصے کہا کریں نت

اک ملنے والے ہم تھے ، سو ہو چکے ہیں صاحب
اب آپ جس سے چاہیں اس سے ملا کریں نت

مکتب نشین لڑکے ، کتنے غضب ہیں ہے ہے
کس نے کہا انھوں سے مشقِ جفا کریں نت

خورشید و مہ نے نقشہ دیکھا نہیں وگرنہ
دن رات جستجو میں تیری پھرا کریں نت

جس خاک سے تو گزرے آبِ حیات کی طرح
تا روزِ حشر مردے واں سے اٹھا کریں نت

ردیف ث

۱۸۴

نہیں آیا ہمارے پاس اب تک یار کیا باعث
گیا کیوں بھول ، کر کے ملنے کا اقرار کیا باعث

ٹھہرتا ہی نہیں سینے میں دل زنہار کیا باعث
چوے ہی پڑتے ہیں کچھ دیدۂ خوں بار کیا باعث

دکھا کرتا ہے دل سینے میں میرے روز و شب یارو
نہیں معلوم ہوتا اس کا کچھ اسرار کیا باعث

نکل بھی جا کہیں اے دل شتابی ساتھ آنسو کے
میرے سینے میں تو کھینچے ہے کیوں آزار کیا باعث

کبھو آنکھوں میں سرمہ اور کبھو ابرو پہ وسمی ہے
سجی جاتی ہے واں ہر دم نئی تلوار کیا باعث

جو کوئی "شیخِ صنعاں" کی طرح عاشق ہو ترسا کا
نہ پوچھو اس سے باندھی تو نے کیوں زنار کیا باعث

خموشی خوب ہے ایسی جگہ اے مصحفیؔ چپ رہ
کسو سے دردِ دل کا کیجیے اظہار کیا باعث

۱۸۵

عنقا ملا ہے کس کو دلا جستجو عبث
پھرتا ہے ڈھونڈتا تو اسے کوبکو عبث

اس چرخِ خود مراد سے اس کے وصال کی
خواہش عبث ، امید عبث ، آرزو عبث

عادی بہ آہ و نالہ ہوں میں، آہ کیا کروں
نت مانے ہے برا وہ بتِ تند خو عبث

اے دل گر اس کے سامنے جاوے تو میں بدوں[1]
کرتا ہے شیخیاں تو مرے روبہ‌رو عبث

ہرگز نہیں یہ دوختنی مثل جیبِ گل
کرتے ہو چاکِ سینہ کو میرے رفو عبث

اے فصلِ نو بہار بے انبساطِ طبع
کرتی ہے مجھ پہ عرضِ گل و لالہ تو عبث

---

۱ - بدنا (ہ) : شرط لگانا ۔

اپنی تو چشم میں چمنِ روزگار کا
لطفِ بہار، ہیچ ہے اور رنگ و بو عبث

پیدا کر اول عشق جو چاہیے ہے وصلِ دوست
اے شیخ ورنہ ہے یہ نماز و وضو عبث

اے مصحفی وہ چاہے تو جانے بھی دے اسے
اپنی طرف سے اتنا لگا جا ہے تو عبث

ردیف ج

۱۸۶

پڑتی ہی نہیں اس دلِ بے تاب کو کل آج
آرام و سکوں میں نظر آتا ہے خلل آج

پھر صبح کو ہم اور وہی سیرِ خرابات
اس لغزش و مستی سے جو جاتے ہیں سنبھل آج

مدت سے توہم تھا ہمیں اس کے دہن کا
جنبش میں ٹک اس لب کی یہ عقدہ ہوا حل آج

کی شانہ صفت کس نے میاں دست درازی
کھاتی ہے تری زلف تو کچھ زور ہی بل آج

ہمراہ مجھے دیکھ کے کہتا ہے یہ قاتل
جاتا نہیں، شاید تری آئی ہے اجل آج

ہے تا سرِ دیوار چمن جوشِ بہاراں
گلگشتِ گلستاں کو جو چلنا ہے، تو چل آج

شاید کہ صبا آئی ہے اس گل کی گلی سے
جوں لالہ شگفتہ ہے مرے دل کا کنول آج

اپنی تو چشم میں چمنِ روزگار کا
لطفِ بہار، ہیچ ہے اور رنگ و بو عبث

پیدا کر اول عشق جو چاہے ہے وصلِ دوست
اے شیخ ورنہ ہے یہ نماز و وضو عبث

اے مصحفی وہ چاہے تو جانے بھی دے اسے
اپنی طرف سے اتنا لگا جا ہے تو عبث

ردیف ج

۱۸۶

پڑتی ہی نہیں اس دلِ بے تاب کو کل آج
آرام و سکوں میں نظر آتا ہے خلل آج

پھر صبح کو ہم اور وہی سیرِ خرابات
اس لغزش و مستی سے جو جاتے ہیں سنبھل آج

مدت سے توہم تھا ہمیں اس کے دہن کا
جنبش میں ٹک اس لب کی یہ عقدہ ہوا حل آج

کی شانہ صفت کس نے میاں دست درازی
کھاتی ہے تری زلف تو کچھ زور ہی بل آج

ہمراہ مجھے دیکھ کے کہتا ہے یہ قاتل
جاتا نہیں، شاید تری آئی ہے اجل آج

ہے تا سرِ دیوار چمن جوشِ بہاراں
گلگشتِ گلستاں کو جو چلنا ہے، تو چل آج

شاید کہ صبا آئی ہے اس گل کی گلی سے
جوں لالہ شگفتہ ہے مرے دل کا کنول آج

تھا ان کے بھی اوپر کبھی تصویر کا عالم
ویران نظر آتے ہیں جو یہ قصر و محل آج

ہے نعش پہ کشتے کی ترے زور تماشا
اے آفتِ جاں تو بھی ذرا گھر سے نکل آج

کیوں چپ ہو میاں مصحفی فرماؤ تو صاحب
پڑھتے نہیں ہو تم جو کوئی شعر و غزل آج

١٨٧

قاتل مرے یاروں کو نہ خط سادہ لکھا بھیج
بھیجے ہے تو کاغذ کو ٹک اک لوہو لگا بھیج

یا اپنے شتاب آنے کا خط مجھ کو لکھا بھیج
یا مجھ کو ہی خط بھیج کے پاس اپنے بلا بھیج

ڈرتا نہیں ہوں میں بھی اب اے عشق بلا سے
جس طرح کی چاہے تو مرے سر پہ بلا بھیج

وا شد نہیں ہوتی ہے مرے غنچۂ دل کو
اس کو سے الٰہی تو کہیں بادِ صبا بھیج

اسبابِ غم و غصہ فلک ہم پہ بہت ہے
جو چاہیے تیرے تئیں تو یاں سے منگا بھیج

قسمت ہی سے یہ زخم کہیں ہاتھ لگے ہے
اے کشتہ تو قاتل کے تئیں اپنی دعا بھیج

جب میں نے کہا دیتا ہوں دل آن کے لے جا
بولا کہ جو دیتا ہے تو گھر بیٹھے دلا بھیج

دے ڈالیں ہم اس دل کو ابھی نیم نگہ پر
بینا کوئی اس دل کا اگر دیوے خدا بھیج

اے مصحفی گل بھیجیں ہیں غیر اس کو تو بھیجیں
تو لختِ جگر کا اسے گلدستہ بنا بھیج

۱۸۸

بڑھ گئی بیماریِ دل کیجے یارب کیا علاج
اب تو مرنا ہی پڑا اس غم سے ہم کو لا علاج
تو نے اے جراح کیوں مرہم لگایا کیا کیا
سودۂ الماس اس زخمِ کہن کا تھا علاج
اٹھ سر بالیں سے میری، جا بھی گھر کو اے طبیب
اب دمِ آخر ہے یاں کیسی دوا ، کیسا علاج
صعب تھا از بس مرض میرے دلِ بیمار کا
چپ رہا میں نے مسیحا سے اگر پوچھا علاج
جان بیکل ہے جدی اور دل جدا کرتا ہے درد
کیجیے اے مصحفی افسوس کس کس کا علاج

۱۸۹

رکھتا ہوں ایک میں تو ترے غم کی احتیاج
کافر ہو جس کو ہو دلِ خرّم کی احتیاج
کھائے ہزار زخم تری تیغ کے ولے
عیسٰی سے ہم نے رکھی نہ مرہم کی احتیاج
اتنا ہوں غم رسیدہ کہ تیرے فراق میں
ہرگز رہی نہیں مجھے ماتم کی احتیاج
رہتا ہے روز و شب انھیں ہر ماہ تعزیہ
کب اہلِ درد کو ہے محرم کی احتیاج

پڑھنا تھا جو کہ ہم کو سو تحصیل کر چکے
مسلم[۱] کی اب ہوس ، نہ مسلّم[۲] کی احتیاج

عشاق اک نگہ سے تری قتل ہو گئے
اب تجھ کو کیا ہے تیغِ تبردم کی احتیاج

ہے ظلم اس پہ خنجرِ کم دم لگائیے
جس صید کو ہے تیغِ تبر دم کی احتیاج

اٹھ جائے مصحفی سو کہاں یاں سے یا علی
اس در سے رفع ہوتی ہے عالم کی احتیاج

۱۹۰

روم دبتا ہے اس کے رخ کو باج
شام سے زلف نے لیا ہے خراج

ایک نالے پہ ہے معاش اپنی
ہم غریبوں کی ہے یہی معراج

سلطنت اور معنی رکھتی ہے
یوں تو سر ہر خروس کے بھی ہے تاج

عاشقی کیوں نہ مبتذل ہووے
کارِ پروانہ جب کرے دراج[۳]

تابِ موے کمر بھی اس کو نہیں
بس کہ نازک بڑا ہے اس کا مزاج

۱ - صحیح مسلم ۔
۲ - مسلّم [مسلّم الثبوت (کتاب فقہ)] ۔
۳ - دراج : تیتر ۔

ہے دوا اس مریض کی تجھ پاس
جس کا عیسٰی بھی کر سکے نہ علاج

مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ
اب ہے اشعارِ ہندوی کا رواج

ردیف چ

۱۹۲

تجھ سے میں یہ نہیں کہتا کہ تو تلوار نہ کھینچ
اپنے دامن کو مرے ہاتھ سے اے یار، نہ کھینچ

رہ لگا آئنہ خانے میں تو اے آئینے
میرے اور یار کے بیچ آن کے دیوار نہ کھینچ

نہ بٹھا حلقۂ ماتم میں گرفتاروں کو
نیل گوں خط تو بہ گردِ گلِ رخسار نہ کھینچ

لٹ پٹی چال تو چل شوق سے اے مستِ شراب
لیک دامن کو زمیں پر گہِ رفتار نہ کھینچ

شوق ہوتا ہے فزوں مجھ کو ہم آغوشی کا
یوں تو خمیازہ مرے سامنے ہر بار نہ کھینچ

اے نسیمِ سحری رہنے دے زنداں میں مجھے
دامنِ شوق مرا جانبِ گلزار نہ کھینچ

تیر کو کھینچ، میں مانع نہیں، پر تیر کے ساتھ
دل کو سینے سے مرے اے بتِ خونخوار نہ کھینچ

مصحفی جانے بھی دے اس بتِ ہرجائی کو
اس قدر اس کے تجسس میں تو آزار نہ کھینچ

۱۹۳

یوں ہے عارض کی جھلک زلفِ پریشان کے بیچ
شمع روشن ہو کہیں جیسے شبستان کے بیچ
چمکے پھرتے تو ہو بازار میں مانندِ نگیں
دیکھیو حرف نہ آ جائے کہیں شان کے بیچ
دلِ سی پارہ میں یوں عشق کے داغوں کی ہے شان
پرِ طاؤس ہو جیسے کسی قرآن کے بیچ
ہے مگر رطب مزاجی سے خطر ریزش کا
شیشۂ مے نے جو رکھی ہے روئی کان کے بیچ
شور مرزائی کا بےجا نہیں اپنی کہ یہاں
جائے گل، لختِ جگر رہتے ہیں گلدان کے بیچ
مصحفی یہ تو تلاشی تھی اب اپنے ڈھب کی
اک غزل اور لکھا چاہیے دیوان کے بیچ

۱۹۴

کب کا اک عمر سے جھگڑا تھا دل و جان کے بیچ
کام دونوں کا کیا یار نے اک آن کے بیچ
جب کہ چہرے سے اٹھاتا ہے تو اے شوخ نقاب
برق پڑتی ہے ہمارے سر و سامان کے بیچ
شب کہیں گوشۂ ابرو کو ترے دیکھا تھا
سر، مہِ عید کا اب تک ہے گریبان کے بیچ
خواب سے چونکے تو یاں ہم کو سفر پیش آیا
آنکھ کھلتے ہی پڑی بانگِ جرس کان کے بیچ

ہم سیہ بخت نہ کیوں خون میں لوٹیں کہ وہاں
ربط اک تازہ ہوا ہے مسی و پان کے بیچ
میں وہ بلبل ہوں کہ منقار سے اپنی جس نے
رخنے کر ڈالے ہیں دیوارِ گلستان کے بیچ
مجھ پہ گلگشتِ گلستاں کی نہ تہمت کیجو
مصحفی لختِ جگر ہیں مرے داماں کے بیچ

۱۹۵

اک دن جو لے گئی مجھے وحشت چمن کے بیچ
چھپتا پھرا میں سایۂ سرو و سمن کے بیچ
کیا چہچہے تھے کرتے ہم اپنے چمن کے بیچ
ہوگا وہ دن جو پہنچیں گے پھر بھی وطن کے بیچ
اب جس سے چاہے اس سے میاں انکھڑیاں لڑا
یاں کام ہو چکا، مژہ برہم زدن کے بیچ
تن تو کہاں ہے شعلۂ فانوس کی طرح
اک آگ سی بھری ہے مرے پیرہن کے بیچ
اگلی پڑے ہے جیسے کہ شمشیرِ خوش غلاف
اب یہ زباں ٹھہرتی نہیں ہے دہن کے بیچ
وہ آپ سا بتاوے ہے، وہ آپ سا تجھے
جھگڑا پڑا ہے رنگ کا گل اور سمن کے بیچ
رسمِ دیارِ عشق کا کشتہ ہوں میں کہ واں
جیتے کو گاڑ دیتے ہیں رکھ کر کفن کے بیچ

---

۱ - کیا چہچہے کریں تھے : ل ۱ -

غافل تو آنکھ کھول کے سیر جہاں تو کر
جلوہ کیا ہے یار نے کس کس برن[1] کے بیچ

مارے حیا کے ہم سے وہ کل بولتا نہ تھا
ہم چھیڑ چھیڑ کر اسے لائے سخن کے بیچ

پروانہ ہو کے زخمی بہ تیغِ زبان شمع
ایسا گرا کہ جان ہی دی شب لگن کے بیچ

میں شمع بزم دہر ہوں ان روزوں **مصحفی**
میرا ہی ذکر گرم ہے ہر انجمن کے بیچ

۱۹۶

دھجیاں پاؤں سے باندھیں ہم نے اس منزل کے بیچ
یہ خبر پہنچے اسے جو جاوے ہے محمل کے بیچ

میں وہ بسمل ہوں کسی کی تیغِ تیزِ شرم کا
قطرۂ خوں بھی نہیں کھنچنے کو جس بسمل کے بیچ

اس نگر کے رہنے والے کیا سبھی ہیں بے نوا
خاک بھی یاں تو نہ دیکھی کاسۂ سائل کے بیچ

رشک ہے اس مرغ بسمل پر مجھے جو بعدِ ذبح
آپ کو پنہاں کرے ہے دامنِ قاتل کے بیچ

حق کے کہتے دار پر کیوں کھینچتے منصور کو
کچھ ممیز فرق اگر کرتے حق و باطل کے بیچ

کیا خدائی ہے کہ اب در تک نہیں ہے اس کے بار
جس سے ہم زانو بہ زانو بیٹھیں تھے محمل کے بیچ

---

۱ - برن : روپ -

اس سے ہم اک بات بھی کہنے نہ پائے مصحفی
مرتے مرتے رہ گئی دل کی ہمارے دل کے بیچ

ردیف ح

۱۹۷

دیکھ اس رشک پری کے باغ میں آنے کی طرح
گل گریباں پھاڑتے ہیں اپنے[1] ، دیوانے کی طرح

تار رونے کا بندھا جب سے مرا ، ہر ایک اشک
رشتہ دار آپس میں ہیں تسبیح کے دانے کی طرح

گر چھوا ہو میں نے اس کی زلف کو تو ہم نشیں
ہاتھ ساعد سے جدا ہووے مرا شانے کی طرح

میں بھی ہوں اس شعلۂ سرکش کا عاشق ، آسماں
رات دن پھرتا ہے جس کے گرد پروانے کی طرح

تیشۂ فرہاد میرے ہاتھ آیا چاہیے
کس قدر دشوار ہے سر سے گزر جانے کی طرح

منہ چھپاتے ہو جو ہر دم مصحفی کو دیکھ کر
کس سے سیکھی ہے میاں یہ تم نے شرمانے کی طرح

۱۹۸

سحر ہے رخ پر ترے زلفوں کے بل کھانے کی طرح
سیکھے کوئی تجھ سے پیارے دل کے لے جانے کی طرح

---

۱ - اپنا : ل ۱ ۰

اس میں گو جل جاویں یا مر جاویں ، ہونا ہو سو ہو
چومنا منہ شعلہ رو کا ہم کو پروانے کی طرح

پان کھانے پر کرو ہو اس کے یارو کیا نگاہ
اک ذرا دیکھو مرے بھی خونِ دل کھانے کی طرح

سن کے میرا ماتمی قصہ لگا رونے وہ رات
مرثیے سے بس کہ ملتی تھی اس افسانے کی طرح

گاہ حصے میں مرے گاہے بہ کامِ دیگرے
ساری اس کی چشم میں نکلے ہے پیمانے کی طرح

جب مرا دل دام میں زلفوں کے اس کی پھنس گیا
اور کچھ آئی نظر تب خویش و بیگانے کی طرح

یار کے وقتِ تماشا قابلِ تصویر ہے
مثلِ آئینہ مرے حیران رہ جانے کی طرح

گہ شگافِ در سے ، گہ روزن سے کرتا ہے نگاہ
یاد ہیں کتنی ہی اس کو ، آنکھیں پھڑکانے کی طرح

شیخ جی تم بھی عجب خر ہو بھلا سمجھو تو بات
دانۂ انگور کھاتا ہے کوئی دانے کی طرح

پھر گئیں کیا جانے کیوں ہم سے وہ زلفیں مصحفی
ہم تو رکھتے تھے دل ان کا ہاتھ میں شانے کی طرح

۱۹۹

شہر آتا ہے نظر ہر گرد ویرانے کی طرح
رہ گئی یاں کون سی اب جی کے بہلانے کی طرح

تھی بلا گردانِ شمعِ روئے گل شب تا سحر
آخر آخر جی دیا بلبل نے پروانے کی طرح

کیا سمجھ کر ہم نے یا رب سالہا سجدہ کیا
جس جگہ کعبے کی صورت تھی نہ بت خانے کی طرح

کل جو رستے میں وہ ناگہ مل گیا ، تھی دیدنی
میرے رہ جانے کی وضع اور اس کے رک جانے کی طرح

رنگ گل کرتا ہے آخر یاد اگر ہوتی تمھیں
خاک اور خوں میں کسی بسمل کے تڑپانے کی طرح

۲۰۰

شاخِ گل گو کہ لچکتی ہے قدِ یار کی طرح
پر کہاں اس میں بہار اس گلِ رخسار کی طرح

کس کے مقتول کا یا رب یہ چمن مشہد ہے
نظر آتے ہیں جو گل سینۂ افگار کی طرح

دیکھیے اب کے تپِ عشق سے کیوں کر بچیے
بے طرح سی نظر آتی ہے اس آزار کی طرح

کیا چرایا تھا ترا اس نے ، قفا پر پیارے
ہاتھ کیوں باندھے ہیں کاکل کے گنہگار کی طرح

غیر سے شب اسے خلوت رہی اور ہم تا صبح
رہے حیران کھڑے صورتِ دیوار کی طرح

تھا گھمنڈ ابرِ بہاری کو بہت رونے کا
پر نہ رویا وہ مرے دیدۂ خوں بار کی طرح

ہو چکا کب کا گریباں تو مگر ہیں باقی
تار دو چار گلے میں مرے زنار کی طرح

دام میں زلف کے کیا پوچھو ہو نقشہ دل کا
کیا کہیں دیکھی نہیں مرغِ گرفتار کی طرح

ہیں طرح‌دار تو دنیا میں بہت پر واللہ
مصحفی آفت جاں ہے مرے خوں خوار کی طرح

ردیف خ

۲۰۱

کہتا ہے کون ہاتھ ہیں اس کے حنا سے سرخ
میں دیکھتا ہوں اس کو تو ہیں ابتدا سے سرخ

آتے ہی کچھ خزاں کے عجب زرد ہو چلے
چہرے گلوں کے ہو کے چمن کی ہوا سے سرخ

دریائے خونِ خلق میں پیرا ہے تیرا رخش
پاؤں اس کے سینے تک نہیں رنگِ حنا سے سرخ

ہم مارے انفعال کے کِل آب ہو گئے
دیکھا جو رنگ چہرے کا اس کے حیا سے سرخ

اے بت ہزار شکر کہ ہم اپنے خون میں
چاہیں تھے دست و تیغ کو تیرے خدا سے سرخ

دل جی اٹھے ہے جنبشِ دامن میں یار کی
جیسے دہک کے ہو کبھی اخگر ہوا سے سرخ

یہ بھی عجب مزا ہے کہ تڑپوں میں خون میں
دشمن کا منہ نہ ہو تری تیغِ جفا سے سرخ

خوں ریزیوں سے ہاتھ اٹھا کے اب تو اے فلک
صحرا کے صحرا ہیں تری تیغِ جفا سے سرخ

کشتہ ہوں میں حنائی سر انگشت کا، تری
فندق کہاں ہے غنچے کی ایسی ادا سے سرخ

یہ کیا بلا ہے دیدۂ خوں بار میں مرے
جو ہو گیا ہے رنگِ فلک اس گھٹا سے سرخ
گریے کا رنگ اپنے تو معلوم ہو ہمیں
دو چار قطرے اشک کے ٹپکیں بلا سے سرخ
رہتی ہے خونِ دل پہ معاش اپنی مصحفی
ہے ایک چہرہ اپنا تو اس کیمیا سے سرخ

۲۰۲

لگائے ہاتھ کوئی اس بدن کو کیا گستاخ
نہ جس بدن کو لگی ہو کبھی ہوا گستاخ
میں چھیڑتا ہوں جو اس کو کہے ہے کٹ کے رقیب
قدیم سے ہے تمھارا یہ آشنا گستاخ
یہ برگِ گل نہیں، ہیں بلبلوں کے لختِ جگر
قدم نہ رکھیو خیاباں میں اے صبا گستاخ
میں دیکھتا ہوں جو شانے کو اس کی زلفوں میں
کہوں ہوں یوں ہی کبھی میرا ہاتھ تھا گستاخ
کبھی لپٹتی ہے، گاہ اس کے بوسے لیتی ہے
ہے تیرے رخ سے تری زلف بھی بلا گستاخ
میں رکھ دیا جو سر اپنا شب اس کے زانو پر
کہا یہ ہنس کے، تو اب اتنا ہو گیا گستاخ
مجھے یہ ڈر ہے کہ صحبت بگڑ نہ جائے کہیں
ہوئی ہے اس کفِ نازک سے پھر حنا گستاخ
سنا ہے مصحفی میں جب سے شعر عرفی کا
ہمیشہ ہاتھ گریباں سے ہے مرا گستاخ

بہ ساعتے کہ کشائی قبا بیاد آور
کہ می کشاد کسے بند این قبا گستاخ

۲۰۳

مہندی سے دستِ یار سپید و سیاہ و سرخ
ہیں برگ لالہ وار سپید و سیاہ و سرخ

کیا رنگ تھا یہ تجھ سے جو آنسو گریں تھے رات
اے چشمِ اشک بار سپید و سیاہ و سرخ

اس چشم پر خمار کے صدقے کہ اک جگہ
دیکھی نہ تھی بہار سپید و سیاہ و سرخ

یہ صدمے گزرے دل پہ کہ ہو ہو گیا مرا
چہرہ ہزار بار سپید و سیاہ و سرخ

اب تو وہی غنی ہے زمانے میں جس کے پاس
پل[1] ہوویں بے شمار سپید و سیاہ و سرخ

دیکھا نہ تیرے رنگ کا اک اس چمن کے بیچ
یوں پھول ہیں ہزار سپید و سیاہ و سرخ

اے **مصحفی** زمانہ وہ مار سہ رنگ ہے
ہیں جس کے نت نگار سپید و سیاہ و سرخ

---

۱ - پل : نقدی ، پیسہ .

ردیف د

۲۰۴

تھی آب دم اس کے میں میاں بس کہ بلا سرد
بسمل ترا لگتے ہی تو خنجر کے ہوا سرد

گرمی سے تپِ عشق کی آ جی پہ بنی ہے
الفت سے بتاں کی کرے اب دل کو خدا سرد

اس دست نگاریں سے ہوا سوزِ دل افزوں
مشہور غلط ہے یہ کہ ہوتی ہے حنا سرد

ہم جس سے ملے جا کے خنک ہی اسے پایا
ہے آج کل ازبس کہ زمانے کی ہوا سرد

اے مصحفی کیا کہیے دلِ گرم کی تیرے
اتنا تو مری جان یہ زنہار نہ تھا سرد

۲۰۵

ہر چند رہی نت ترے کوچے کی ہوا سرد
تو بھی ترے ملنے سے دل اتنا نہ ہوا سرد

دل جلتا ہے ، لاؤ وہی کھا جاؤں بلا سے
کافور کو کہتے ہیں کہ ہوتا ہے بلا سرد

میں آنکھوں میں لا کر وہیں کل پی گیا آنسو
ہر چند کہ اتنا بھی تو یہ آب نہ تھا سرد

دیکھا ہے مگر صبح دم اس گل کو چمن میں
جو آج نپٹ بھرتی ہے دم بادِ صبا سرد

گرمی پہ نہ آیا دلِ افسردہ ہمارا
ہر گز نہ کرے بندے کو اتنا بھی خدا سرد

ہر چند کہ فردوس میں سب کچھ ہے ولیکن
دیواروں کے یہ سایے کہاں اور یہ ہوا سرد

کیوں تپ میں مجھے خونِ جگر غم نے پلایا
تپ والوں کو دنیا میں تو دیتے ہیں دوا سرد

باتوں نے تری اس کو ذرا گرم کیا ہے
تھی ورنہ مری جان طبیعت میں حنا سرد

اے مصحفی تھا ہم کو بڑا تیرا بھروسا
اک زخم کے لگتے ہی میاں تو تو ہوا سرد

۲۰۶

غیر سے آشنائیاں تا چند
دیکھیں یہ بے وفائیاں تا چند

نالہ پر بے اثر ہے ہم بیمار
آہ تیری رسائیاں تا چند

ہنس کے بولو کبھی تو ہم سے میاں
جھڑکیاں اور رکھائیاں[1] تا چند

میرے اور اس کے دیکھیں رہتی ہیں
درمیاں میں جدائیاں تا چند

---

۱ - رکھائی (ہ): ناراضگی ، بے التفاتی :

جی چاہتا ہے بولیں ، پر بولتے نہیں ہیں
ہوویں اگر تو باہم ایسی رکھائیاں ہوں

میری طاقت پہ کر نگہ اے دوست
نت کی زور آزمائیاں تا چند
بھوں چڑھاؤ نہ مصحفی پہ میاں
اس سے یہ کج ادائیاں تا چند

۲۰۷

دانتوں کے رو برو ہوئی سلکِ گہر سپید
آگے لبوں کے جس کے نہ ہووے شکر سپید
کاغذ سمجھ کے اس پہ بھی ہم کچھ کریں رقم
ہوں مرغِ نامہ بر کے اگر بال و پر سپید
کرتا ہے مثلِ ماہ کتاں چاک پیرہن
جب بر میں کپڑے پہنے ہے وہ سیم بر سپید
اے شامِ ہجر اب تو کہیں رو سیاہ کر
بس روتے روتے ہو تو گئیں چشمِ تر سپید
بے رنگ ہو گئے ہیں کچھ اس کا عجب نہیں
لالہ ہماری خاک سے پیدا ہو گر سپید
اول سیاہ روئی کا کر شیخ کچھ علاج
صابن سے دھو دھو داڑھی کو اتنا نہ کر سپید
روکش جو ہو ہے صبح بنا گوشِ یار سے
ہے برگ نسترن تو کہاں اس قدر سپید
چہرے پہ ایک کے تو[۱] نہ پایا وفا کا رنگ
اہلِ جہاں کا خون ہوا سر بسر سپید

---

۱ - بھی ; ل ۲ -

ہو کر سپید پوش تو آ پشتِ بام پر
ہے چاندنی سے دیکھ تو کیا بحر و بر سپید
سنتا ہے **مصحفی** تو نہ کھو ان کو رایگاں
تیرا ہر اشک لال ہے اے بے خبر سپید

۲۰۸

اے دل سپیدی آئی ، ہوئے موئے سر سپید
رو رو کے اب تو نامۂ اعمال کر سپید
خوں خشک ہو گیا مرا یاں تک کہ وقت فصد
نکلا رگِ جگر سے مری نیشتر سپید
یعقوب یوں کہے ہے کہ یوسف سے یہ کہو
ہیں اے پسر ترے لیے چشمِ پدر سپید
گویا کہ قطرہ خون نہیں اس میں دیکھیو
چہرہ مریض کا ہے ترے کس قدر سپید
تجھ بن یہ رنگ ہے مری چشمِ پُر آب کا
ہووے کسی کا جیسے سپیدی سے گھر سپید
از بس سیاہی اس کی نہ اس سے جدا ہوئی
دیکھا نہ میں کبھی رخِ داغِ جگر سپید
اے اشک سرخ کیجیو ٹک، اور بھی مدد
تھوڑا سا رہ گیا ہے یہ تارِ نظر سپید
ہم رفتہ رفتہ غم میں ترے پیر ہو گئے
اہلِ سفر کو جیسے کہ کر دے سفر سپید
تعریف کیا کروں تری دانتوں کی آب کی
اس آب و تاب پر نہیں آبِ گہر سپید

ہو جاویں کل کو لعل تو اس کی خبر نہیں
اب تک تو میرے اشک ہیں جیسے گہر سپید

اے مصحفی فراق میں مت ڈھونڈ روشنی
دیکھی ہے کس نے وصل کی شب کی[1] سحر سپید

۲۰۹

نہ تو ہے لعل یار کے مانند
نہ گل اس کے عذار کے مانند

گرچہ گل ہے ہزار کے مانند
پر کہاں گل عذار کے مانند

ہے خوش آئند یار کا آنا
موسم نو بہار کے مانند

خوں میں تڑپا ہے کون سا بسمل
اس دل بے قرار کے مانند

پھر گئیں ہم سے یار کی آنکھیں
گردش روزگار کے مانند

جگر لالہ داغ ہے، میرے
جگر داغ دار کے مانند

رخت ہستی پہ خوش نہ ہو کہ یہ ہے
جامۂ مستعار کے مانند

کوئی ناخن لگا جگر پہ مرے
تو وہ بولے گا تار کے مانند

---

۱ - ہے ; ل ۱ -

مل کے دشمن مرے چڑھ آئے ہیں
مجھ پہ سارے گہار[1] کے مانند

میری آنکھوں میں سرو اس قد بن
نظر آتے ہیں دار کے مانند

گرچہ ہے زلف لام نستعلیق
خط ہے خطِ غبار کے مانند

نہیں عشق کے حق میں لذتِ وصل
لذتِ انتظار کے مانند

دیکھ اس گل کو جب میں کرتا ہوں
گریہ ابرِ بہار کے مانند

اشک آنکھوں سے میری گرتے ہیں
دانہ ہائے انار کے مانند

مصحفی خاکِ راہ کس کا تھا
اڑ گیا جو غبار کے مانند

۲۱۰

زلف ہے گرچہ مار کے مانند
رخ ہے نقش و نگار کے مانند

یا الٰہی دعا میں کس کی ہے
ہاتھ میرا چنار کے مانند

اس میں کشتی نہ لا کہ ہیں یہ سرشک
قلزم بے کنار کے مانند

---

۱ - گہار : بلوائی

دلق عاشق پہ رکھ کہ ہو جاوے
حلہ[۱] زرلگار کے مانند

نہیں تیغِ ولایتی کا خم
خمِ ابروے یار کے مانند

آخرِ عیشِ لذتِ دنیا
ہے نشے کے اُتار کے مانند

وہ ہے عاشق جو رکھ دے سرتہِ تیغ
عاشقِ سرگزار کے مانند

چھیڑیو مت کہ یہ دلِ صد چاک
کھل رہا ہے انار کے مانند

ق

دل سلگتا ہے کیا مگر میرا
اندک اندک شرار کے مانند

جو دھواں سا جگر سے اُٹھتا ہے
ناتواں سے غبار کے مانند

نوک سبزے کی اس چمن کے مرے
دل میں چبھتی ہے خار کے مانند

تربتِ مصحفی کو دیکھا کل
ڈھیر تھا اک مزار کے مانند

۱۔ حلہ : لباس ۔

۲۱۱

کیے جس ڈھب سے اس نے چاکِ در بند
وہ کرتا کاش یہ چاکِ جگر بند

بتاں کاوش سے پلکوں کی تمھاری
ہے یاں رگ رگ میں میری نیشتر بند

زبس خونِ غلیظ آنکھوں سے آیا
ہوئیں آخر بہم[1] مژگانِ تر بند

ہم اور دل یوں گرفتارِ بلا ہیں
بہم دو مرغ ہوں جیسے کہ پر بند

غرور اس کو لفافے پر نہ لایا
لکھا بھی خط تو کر بھیجا کمر بند

کئی دن سے پھر اب کچھ ہو گئی ہے
رہِ آمد شدِ پیغام بر بند

بہ صد خوبی دہانِ تنگ اس کا
رہا پیوستہ جوں دُرجِ گہر بند

تری بالیں پہ بیٹھا ہے مسیحا
ابھی اے مصحفی آنکھیں نہ کر بند

۲۱۲

کیا عالم کے منہ پر جس نے در بند
فراغت سے وہ بیٹھا چشم کر بند

گئے وے دن کہ اشک آتے تھے اب تو
کرے ہے کٹ کٹ آنکھوں سے جگر بند

---

۱ - کو ہم : ل ۱ -

نہیں ہوتا جو دل تو چٹکیوں میں
ملا کرتا ہے وہ دو دو پہر بند

بہار آئی خبر لے ان کی صیاد
قفس میں تھے ہمارے مشتِ پر بند

اجابت تک دعا کس رہ سے جاوے
درِ افلاک ہیں شام و سحر بند

کبھیں کل چاکِ در سے جھانکتا تھا
رہی تا دیر واں میری نظر بند

مجھے اے **مصحفی** لکھنے ہیں اشعار
ذرا اس تاؤ[1] کے تو لے کے کر بند

ولیکن قطع میں چھوٹے نہ ہوویں
برابر ہاتھ کے ہو راست ہر بند

۲۱۳

بہت کیں ہم نے اپنی چشم تر بند
ہوا لیکن نہ خونِ نابِ جگر بند

مرے سینے میں دل بیتابیوں سے
پھڑکتا ہے پڑا جوں مرغِ پر بند

کیا جب ٹکڑے ٹکڑے اس نے ہم کو
پڑا تڑپا کیا لوہو میں ہر بند

کمر باندھے ہے میرے خوں پہ ہر دم
وہ کافر کرکے زلفوں کو کمر بند

---

۱ - تاؤ: کاغذ کا تختہ -

کیا کیوں پرزے پرزے اس نے یا رب
مرے نامے کا تو تھا مختصر بند

چلی ہے شب جہاں اس زلف کی یاد
سحر واں رہ گئے ہیں گھر کے گھر بند

مری آنکھوں سے باہر کیوں کہ جاوے
کہ طفلِ اشک ہے میرا نظربند

دمِ شمشیرِ تیغِ (؟) ناز اس کا
ہوا ہے دل پہ میرے آن کر بند

دریغ اے مصحفی ہم نے شبِ وصل
نہ کی راہِ شبیخونِ سحر بند

۲۱۴

پھڑک کر کیا کرے وہ مرغِ پر بند
قفس کا جس کے نت رہتا ہو در بند

ہے گل دامِ نگاہِ عشق بازاں
یہ بلبل چشم کا تیرا کمربند

مری آنکھوں میں یوں پھرتا ہے وہ شوخ
کسی کو جیسے رکھتے ہیں نظربند

تری پلکوں کی نازک کاریوں سے
مشبک[۱] ہے تمام اپنا جگر بند

لگائی جب حنا ہاتھوں پر اس نے
کیا عالم کا دل خوں مشت کر بند

---

۱ - مشبک : جالی دار۔

یہ بسمل کس کا کشتہ ہے کہ جس کا
تڑپتا ہے پڑا لوہو میں ہر بند

کھلے بندوں گر آ بیٹھے وہ در پر
عجب کیا ہے کہ ہو جا، رہ گذر بند

فسانہ رہ گیا دنیا میں باقی
نہ اسکندر رہا، نے اس کا دربند

نہیں زلفوں کے حلقوں میں وہ رخسار
ہوئے ہیں مصحفی شمس و قمر بند

۲۱۵

اگر کھولے چمن میں اپنے تو بند
وہیں بہنے سے ہو جا آبِ جو بند

زمیں صیدِ قمرغہ[1] کا ہے میداں
سفر کی راہ ہے یاں چار سو بند

شگفتہ ہی نہیں ہوتا کسی طرح
کہے تو دل مرا پارہ ہے ہو بند

کہیں ہیں دل میں عاشق کے گرہ ہے
غلط ہووے گی کوئی آرزو بند

نہیں مقدور یاں دم مارنے کا
زباں اپنی ہے تیرے رو بہ رو بند

---

۱ - قمرغہ : شکار گاہ
''بہ فتحِ اول و ضم میم و سکون رائے مہملہ و فتح غین معجمہ، شکار گاہ کہ امرا و سلاطین در احاطۂ کلان آہو و گوزن وغیرہ می گزارند۔''
(غیاث اللغات، صفحہ ۳۴۶)

کوئی تیرا گریباں گیر ہوگا
دراز اپنے نہ رکھ جامے کے تو بند
کی[۱] اس نے روزنِ درکرگل اندود[۲]
نگاہوں کی بھی راہِ جستجو بند

ق

کیا تھا مصحفی کے زخمِ دل کو
ابھی جراح نے کر کے رفو بند
سو کروٹ میں وہ ٹانکا کھل گیا تھا
نہیں ہوتا ہنوز اس کا لہو بند

۲۱۶

کیے اس گل نے جوں جامے کے وا بند
چمن کا ووں ہی رستہ ہوگیا بند
چڑھی زنجیریں ہیں پاؤں میں جن کے
دل ان لوگوں کی الفت کا ہے پابند
چمن میں کس کے آنے سے ہوئی ہے
رہِ آمد شدِ بادِ صبا بند
دعا میری ہی[۳] کیا بر وقت پہنچی
اجابت کا سحر در ہووے تھا بند

---

۱ - کر اس نے روزنِ در کو گل اندود ؟ (تصحیحِ قیاسی از فائق)
۲ - گل اندود کرنا : مٹی سے لیپنا ، بند کرنا
۳ - [بھی ؟]

جو کوئی وصل کا طالب ہو، خوباں
کریں ہیں تیغ سے اس کے جدا بند
ملے ڈالیں ہیں دل کو چٹکیوں میں[1]
قیامت ہیں یہ طفلانِ حنا بند
چمن میں مصحفی سا دل گرفتہ
مگر آیا، جو یہ کی ہے ہوا بند

۲۱۷

کہاں تلک بھریں اڑتے ادھر اُدھر صیاد
تری ہی نذر ہیں اب لے یہ مشتِ پر صیاد
جنھوں کے دل میں رہا تیری وضع سے کھٹکا
نہ ہوئے سایۂ گل میں وہ نیند بھر صیاد
نہ ذوقِ شبنم و گل بھولیں ہم اسیری میں
بجائے دانہ کھلاوے اگر گہر صیاد
کہاں وہ سینہ کہاں وہ دل اور کہاں وہ جگر
جو تیری ناوکِ مژگاں کا ہو سپر صیاد
قراولی[2] تری آنکھوں سے سیکھ جاتے ہیں
ہیں وے جو حق میں غزالوں کے فتنہ گر صیاد

---

۱ - دل کو مصحفی کے : ل۱ -

۲ - قراول -
''بہ فتحِ اول و ضمِ واو لفظ ترکیست بہ معنی کسی کہ بہ بندوق شکار اندازد - از ''بہارِ عجم'' و ''چراغِ ہدایت'' شکار انداز، برق انداز، و در ''شمسی'' بہ معنی پیش رو۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

جو کوئی وصل کا طالب ہو، خوباں
کریں ہیں تیغ سے اس کے جدا بند

ملے ڈالیں ہیں دل کو چٹکیوں میں[1]
قیامت ہیں یہ طفلانِ حنا بند

چمن میں مصحفی سا دل گرفتہ
مگر آیا، جو یہ کی ہے ہوا بند

۲۱۷

کہاں تلک پھریں اُڑتے اُدھر صیاد
تری ہی نذر ہیں اب لے یہ مشتِ پر صیاد

جنھوں کے دل میں رہا تیری وضع سے کھٹکا
نہ ہوئے سایۂ گل میں وہ نیند بھر صیاد

نہ ذوقِ شبنم و گل بھولیں ہم اسیری میں
بجائے دانہ کھلاوے اگر گہر صیاد

کہاں وہ سینہ کہاں وہ دل اور کہاں وہ جگر
جو تیری ناوکِ مژگاں کا ہو سپر صیاد

قراولی[2] تری آنکھوں سے سیکھ جاتے ہیں
ہیں وے جو حق میں غزالوں کے فتنہ گر صیاد

---

۱ ۔ دل کو مصحفی کے : ل۱ ۔
۲ ۔ قراول ۔
''بہ فتحِ اول و ضمِ واو لفظ ترکیست بہ معنی کسی کہ بہ بندوق شکار اندازد ۔ از ''بہارِ عجم'' و ''چراغِ ہدایت'' شکار انداز، برق انداز، و در ''شمسی'' بہ معنی پیش رو۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

وہ خوں گرفتہ ہوا کون قابلِ فتراک
جو آج دامنِ زیں ہے بہار پر صیاد

خدا کے واسطے چوبِ قفس کو سرخ[1] نہ کر
ہمارے خون پہ باندھے ہے کیوں کمر صیاد

ہزار حیف ہے اس عندلیبِ غافل پر
کہ آیا جس کے اوپر[2] وقت بے خبر صیاد

طیور اب ترے ہاتھوں سے کیوں کہ ہوں جاں بر
جفا و جور کرے جب تو اس قدر صیاد

چمن میں کون سا ہے آشیانۂ بلبل
کہ جس میں لوہو بھرے نہیں پڑے ہیں پر صیاد

پھر اور کیا ہے سبب مرغِ دل کی وحشت کا
نظر پڑا کوئی اے مصحفی مگر صیاد

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

لشکر و در لغاتِ ترکی بہ معنی شکار و فوجے کہ برائے تعیین مکان جنگ معین شود و در مصطلحات فوجے کہ پیش پیش رود و از سپاہی زدن یعنی نمودار شدن دشمن خبر دہد ، چہ قرا در ترکی سیاہی را گویند ۔

(غیاث اللغات ، صفحہ ۳۳۸)

قراول : بندوقچی ۔ (نوراللغات جلد ۳ ، صفحہ ۳۶۳)

۱ ۔ بند : ل ۱ ۔

۲ ۔ بر وزنِ فعل ۔

۲۱۸

کیا غم مجھے گو ہووے قفس کا مرے در بند
اڑ جاؤں قفس لے کے نہ ہوں گر مرے پر بند
نہ جاوے کوئی یاں سے نہ واں سے کوئی آوے
ہے شہرِ بتاں کی رہِ پیغام و خبر بند
ممکن نہیں ہم دیکھ سکیں اور طرف کو
کر رکھا ہے آنکھوں نے تری ہم کو نظر بند
ہوتا ہوں تصور میں ترے جب کہ مراقب
رہتی ہیں میاں آنکھیں مری دو دو پہر بند
موتی ہی نکالیں گے اگر کھولیں گے ان کو
مانندِ صدف اب تو ہیں یہ دیدۂ تر بند
آساں نہیں اس زلف کے حلقوں سے رہائی
جس زلف کے حلقوں میں کہ ہوں شمس و قمر بند
تنبیہ ہمیں کیوں کہ نہ ہووے کہ نظر میں
لگتا ہے چھری سا یہ ترے جامے کا ہر بند

ردیف ذ

۲۱۹

ہم نے بھیجا جو کبھی یار کو لکھ کر کاغذ
گیا برباد ہی مانندِ کبوتر کاغذ
کیا کروں یوں تو ُتو پڑھتا ہی نہیں خط میرا
ہاں مگر لکھ کے لگا دوں ترے در پر کاغذ

نامہ قاصد نے دیا اس کو جو میرا تو کہا
ایسے رہتے ہیں پڑے راہ میں اکثر کاغذ

یوں پتنگوں میں لگا دیتا ہے تو تاو کے تاو
خط ہی لکھنے کو نہیں تجھ کو میسر کاغذ

نامۂ شوق جو ہر دم ہی لکھا کیجیے گا
لکھتے لکھتے یوں ہی ہو جاوے گا دفتر کاغذ

ہو گئے لختِ جگر آہ سے یوں آوارہ
جنبشِ باد سے جوں گل کے ہوں ابتر کاغذ

مصحفی لکھ ورقِ دل پہ تو اس کی تصویر
اس سے دنیا میں نہیں اور کوئی بہتر کاغذ

۲۲۰

شوق سے لکھیے ، اگر جانبِ جاناں کاغذ
ہو کبوتر کی طرح آپ پر افشاں کاغذ

ہم فقیروں کو تو کیا چاہیے افشاں کاغذ
خط لکھیں اس کو اگر ہو کوئی بھگواں[1] کاغذ

پرزے پرزے جو کوئی ہو سو لکھے نامۂ شوق
بھیجنا یار کو ایسا نہیں آساں کاغذ

لکھ کے رونے کا سخن اس کو اڑا دیجے اگر
ابر کی طرح ہوا میں کرے طوفاں کاغذ

خط پہ خط نت جو لکھے جاتے ہیں معشوقوں کو
شہر عشاق میں کیا ہو گئے ارزاں کاغذ

---

۱ - بھگواں (ہ) : گیروا

دردمندوں کا ترے نامہ جو پہنچے تجھ تک
کھولے اس کو تو کرے نالہ و افغاں کاغذ

خط لکھوں اس کو اور افسوس نہ ہووے تزئیں
خون رو رو کے کیا چاہیے افشاں کاغذ

ان پہ کیا کیا نہ حکایت میں لکھی سرخی سے
لخت دل کے ہوئے سب حرف[1] گلستاں کاغذ

مصحفی نام ہے دیوان کا ، ہاں ہیں تو سہی
ورقِ گل کی طرح چند پریشاں کاغذ

۲۲۱

کہتے ہیں وصل کی شب جس کو سو وہ رات ہے شاذ
ساتھ عاشق کے عرض اس کی ملاقات ہے شاذ

رہ میں ہر چند کہ مل جاوے ولے از رہِ لطف
پوچھے وہ بات مری گاہے ، سو یہ بات ہے شاذ

مدعی بھر بھی کبھی عرصے میں نہ آنا ہرگز
یار پلنیں[2] (کذا؟) اسے کہتے ہیں کہ یہ بات ہے شاذ

شور ہے اشک کے باراں کا مرے عالم میں
چشم وا کیجے تو البتہ یہ برسات ہے شاذ

مصحفی صرف نہ کر اس پہ تو اوقات کہ واں
منفرد ہے ستم اور لطف و عنایات ہے شاذ

---

۱ - صرف گلستاں : پ -
۲ - پیلتن (؟)

ردیف ر

۲۲۲

بہارِ گل نہ رہی اس قدر چمن میں دیر
کہ بیٹھے دل زدہ کوئی' سایۂ سمن میں دیر

ہوا تو آ کے شب ، اسبابِ غسل آمادہ
شہیدِ عشق کے پھر کیا ہے اب کفن میں دیر

مری مجال ہے مل کر اٹھوں نہ واں سے شتاب
ملک نہ بیٹھ سکے جس کی انجمن میں دیر

میں لکھ کے خط کوئی قاصد وطن کو گر بھیجا
لگائی اس نے بھی جا کر بہت وطن میں دیر

بھلا تمیز تو کر بوے مشک و گیسو میں
رہی ہے بادِ صبا تو بھی تو ختن میں دیر

میاں نہ تیغ علم کیجیو کہ کہتے ہیں
ابھی جراحتِ دل کے ہے بہہ شدن میں دیر

میں سینہ چاکیِ گل تجھ کو دیکھ لیتا ہائے
رہا نہ ہاتھ مرا چاکِ پیرہن میں دیر

یہ عشق وہ ہے کہ جب اپنے وعدے پر آیا
ہوئی نہ تیشے سے پھر قتلِ کوہ کن میں دیر

خط آئے پر بھی نہ چھوٹا مرا دلِ قیدی
رہا اسیر تری زلفِ پُر شکن میں دیر

---

۱ - بر وزن فع -

رفوے چاکِ گریبانِ گل کر اے ناصح
ابھی بہارے تو ہے چاک پیرہن میں دیر
گئیے کہاں تھے سیاں مصحفی بتاؤ تو
لگائی رات بہت تم نے انجمن میں دیر

۲۲۳

اس تیغ زن کو یارو مرے دل سے کیا خبر
قاتل کو بے قراریِ بسمل سے کیا خبر
بیدل جو کوئی[1] ہوا تو اسے دل سے کیا خبر
ڈوبے ہوے کو بحر کے ساحل سے کیا خبر
ہم کو تو مار[2] ذبح کیا اس کے ہجر نے
قاصد تو کہہ تو لایا ہے قاتل سے کیا خبر
منہ اٹھ گیا جدھر کو ادھر ہی چلے گئے
آوارگانِ شوق کو منزل سے کیا خبر
پوچھو نہ جا کے شیخ سے یہ مسئلہ کوئی
اس بے تمیز کو حق و باطل سے کیا خبر
مجنونِ دشت گرد ہی واقف جو ہو تو ہو
ہر راہرو کو لیلی کے محمل سے کیا خبر
شمع شبِ فراق بنے ہم تو مصحفی
ہم دل جلوں کو عیش کی محفل سے کیا خبر۔

---

۱ - بر وزن فع -
۲ - یار : ل ۱ -

۲۲۴

آخر گئے ہی تجھ کو وہ بے وفا سمجھ کر
تیری گلی میں عاشق آئے تھے کیا سمجھ کر

کافر مجھے نہ کہیو اے مومنانِ صادق
کرتا ہوں بت کو سجدہ میں تو خدا سمجھ کر

نامے کو اس کے پڑھ کر اوّل تو خوش ہوا تھا
آخر کو رو دیا میں کچھ مدعا سمجھ کر

ایسا نہ ہو کہ جاوے برباد خاکِ عاشق
رکھیو گلی میں اس کی پاؤں[1] اے صبا سمجھ کر

بیگانگی سے اس کی واقف نہ تھا میں ہرگز
میں اس کو دل دیا تھا یار آشنا سمجھ کر

ہم نے تو حال دل کا سب خوب ہی لکھا ہے
من بعد مرگ لیکن کس نے پڑھا سمجھ کر

نظروں میں ایک بوسہ مانگا تھا ہم نے اس سے
اس نے بھی زیر لب ہی کچھ کچھ کہا سمجھ کر

زلفوں سے اس کی مل کر شانے نے حظ اٹھایا
ہم ڈر کے دور بھاگے اس کو بلا سمجھ کر

اے مصحفی وہاں سے جیتا کوئی نہ آیا
اس کی گلی میں پیارے جا ہے تو جا سمجھ کر

---

۱ - بر وزن فع -

۲۲۵

راتوں کو تو گلیوں میں نہ اے ماہ لقا پھر
باز آ کہیں ان چالوں سے ، از بہر خدا پھر

اپنا بھی[1] یہ چہرہ گلِ خورشید کے مانند
رخ یار کا جیدھر ہوا اودھر ہی گیا پھر

گر رخصتِ یک آہ میں لی دل سے تو یارو
دیکھو گے کہ جاوے گی زمانے کی ہوا پھر

یہ دیدۂ تر وے ہیں کہ گر جوش پر آویں
دریا کو کہیں تو مری لہروں میں بہا پھر

اے مصحفی رسوائی ہے ان باتوں میں ناداں
جوں سایہ تو اس شوخ کے پیچھے نہ لگا پھر

۲۲۶

سر کھول کے کافر نہ نہا نہر کے اوپر
ان باتوں سے آوے گی بلا شہر کے اوپر

دیکھو گے یہ سب سلسلے ہو جاویں گے برہم
گر آ گئی وہ زلفِ سیہ لہر کے اوپر

بے طرح جھڑی باندھی ہے اس دیدۂ تر نے
طوفان نہ نازل ہو کہیں دہر کے اوپر

یہ بھی کوئی غصہ ہے ، مری جان کھپے ہے
کم بخت پڑے قہر ، ترے قہر کے اوپر

---

۱ - ہے (؟) از فائق -

اے مصحفی ہے لذت دنیا سمِ قاتل
کس واسطے مرتا ہے تو اس زہر کے اوپر

۲۲۷

ہے اس کی آئنے میں خط و خال پر نظر
کرتا ہے کب ہمارے وہ احوال پر نظر

اٹھکھیلیوں سے کتنوں کو پامال کر دیا
کیجو خدا کے واسطے اس چال پر نظر

گر دیکھیے بہار دلِ داغ داغ کی
طاؤس کے نہ کیجے پر و بال پر نظر

اک حشر تازہ ہووے گا دیوانِ حشر میں
جب ہم کریں گے نامۂ اعمال پر نظر

قلیان[1] ہوا ہے جب سے لبِ یار کا ندیم
مشتاق بوسہ رکھتے ہیں منہنال[2] پر نظر

رو رو کے خون دل شفقی اس کو کر دیا
ٹک چشم تر کے کیجیو رومال پر نظر

اتنا یہ دل غنی ہے کہ بندے کی مصحفی
نے چشم جاہ پر نہ زر و مال پر نظر

---

۱ - قلیان : حقہ -

۲ - منہنال : ''مہنال'' ہندی میں ''منہ نال'' ایران میں ''بن نال'' ''سرنال'' مونث - وہ پیتل چاندی ، خواہ جست کی نلی جو حقے کی نے کے آگے لگاتے ہیں - (نوراللغات جلد ۴ ، صفحہ ۵۵۸ ، فرہنگ آصفیہ جلد ۴ ، صفحہ ۴۶۵)

۲۲۸

یار یہ دونوں اگر کم ہوں تو کم ہی بہتر
نہ ترا پیار بھلا اور نہ ستم ہی بہتر

راستی خوب تو ہے لیک نہ ہر جا اے دل
اُس کی وہ زلفِ گرہ گیر تو خم ہی بہتر

سر بچا کر جو تری تیغ کا لے ہاتھ پہ وار
وائے اس ہاتھ پہ وہ ہاتھ قلم ہی بہتر

وصل میں ہجر کا دھڑکا ہی لگا رہتا ہے
ایسی شادی سے دلا ہم کو وہ غم ہی بہتر

یک دو دم بیش نہیں گلشن ہستی کی بہار
اس سے تو سیر گلستان عدم ہی بہتر

اور نا فہم کوئی جان مری کیا سمجھے
کہ سمجھتے ہیں تری بات کو ہم ہی بہتر

مصحفی خارِ گلستان میں کہاں ایسی بہار
اشک گلگوں سے تری ہر مژہ نم ہی بہتر

۲۲۹

مقتل میں لائی جب مجھے تقدیر کھینچ کر
جلاد سر پر آ گیا شمشیر کھینچ کر

تھا دیدنی ہی حال مرا تب تو رہروان
اس کُو سے لے گئے مری تصویر کھینچ کر

کیا جانیں یہ ملوک ، مریدوں کو راہ پر
لاوے نہ جب تلک کشش پیر کھینچ کر
ان کی بھی کچھ خبر ہے تجھے وے جو مر گئے
کوچے میں تیرے نالہٗ شبگیر کھینچ کر
اس خوش مژہ کے سامنے جو کوئی آ گیا
مارا کمانِ ابرو سے اک تیر کھینچ کر
جاتا تھا اپنے پاؤں مَیں کاہے کو مصحفی
زنداں میں لے گئی مجھے زنجیر کھینچ کر

۲۳۰

لائی تو یاں تلک مجھے تقدیر کھینچ کر
پھر دیر کیا ہے آئیے شمشیر کھینچ کر
صانع نے ہاتھ سے قلمِ صنع رکھ دیا
اس حسن لایزال کی تصویر کھینچ کر
میں کس قطار میں ہوں جہاں مجھ سے سیکڑوں
مر مر گئے اذیتِ زنجیر کھینچ کر
مت کھینچ سر کو تیر کے یوں ، ورنہ تو میاں[1]
پچھتائے گا جگر سے مرے ، تیر کھینچ کر
اس دشتِ پُر خطر میں بہت ہم سے ناتواں
رہ رہ گئے ہیں دامنِ رہ گیر کھینچ کر

---

۱ - میاں مصحفی (؟) پ -

۲۳۱

اس قدر بھی تو مری جان نہ ترسایا کر
مل کے تنہا تو گلے سے کبھی لگ جایا کر

دیکھ کر ہم کو نہ پردے میں تو چھپ جایا کر
ہم تو اپنے ہیں میاں غیر سے شرمایا کر

یہ بری خو ہے دلا تجھ میں ، خدا کی سوگند
دیکھ اس بت کو تو حیران نہ رہ جایا کر

ہاتھ میرا بھی جو پہنچا تو سمجھ لوں گا میں خوب
یہ انگوٹھا تو کسی اور کو دکھلایا کر

گر تو آتا نہیں ہے عالمِ بیداری میں
خواب میں تو کبھی اے راحتِ جاں آیا کر

اے صبا اوروں کی تربت پہ گل افشانی چند
جانبِ گورِ غریباں بھی کبھی آیا کر

ہم بھی اے جانِ من اتنے تو نہیں ناکارہ
کبھی کچھ کام تو ہم کو بھی تو فرمایا کر

تجھ کو کھا جائے گا اے **مصحفی** یہ غم اک روز
دل کے جانے کا تو اتنا بھی نہ غم کھایا کر

۲۳۲

یوں کہہ کے گیا دل ، تو مجھے یاد کیا کر
بیٹھا ہوا غم میں مرے فریاد کیا کر

یک بار اڑا دینے میں کیا لطف ہے صیاد
تو پوچھ کے ہم سے ہمیں آزاد کیا کر

کیا ایسی حیا ہے نہ تبسم نہ نگاہے
گاہے تو ہمارا بھی تو دل شاد کیا کر
ظاہر نہ کیا کر تو مرے قتل کو اس سے
آنکھوں میں اشارہ سوے جلاد کیا کر
کیا خو ہے تری بادِ صبا یہ بھی پرے ہو
مت خاک ہماری کو تو برباد کیا کر
کیا ذکر ہے ہم شیخ تری باتوں میں آویں
تو اپنے مریدوں ہی کو ارشاد کیا کر
ڈرتا ہوں کہ تیرا کہیں سینہ نہ تڑق جائے
اے مصحفی اس طرح نہ فریاد کیا کر

۲۳۳

باندھ آیا تھا کمر وہ دشمنِ جاں کھینچ کر
کتنا پچھتاے ہیں ہم کل اس کا داماں کھینچ کر
میں لگا سر پیٹنے کو رات جس دم لے چلی
دل کو میرے خواہشِ زلفِ پریشاں کھینچ کر
آج اس وحشی نے پھر لی راہِ صحرا ہم جسے
کل بہ خواری لے گئے تھے تا بہ زنداں کھینچ کر
رحم کر گورِ غریباں کی بھی مشتِ خاک پر
چل نہ یوں دامن کو اے سروِ خراماں کھینچ کر
کل جو پیکاں ساتھ اپنے دل لیے نکلا مرا
یار پچھتاے مرے سینے سے پیکاں کھینچ کر
اڑ نہ جاوے ہاتھ سے میرے مرا یہ مرغِ دل
باندھیو ٹک اس کے پر اے طفلِ ناداں کھینچ کر

کچھ نہیں معلوم ہوتا ہم کو جرمِ **مصحفی**
لے چلے ہیں یار کیوں اس کا گریباں کھینچ کر

۲۳۴

کندن سے نورتن کی پہن دیکھ ڈنڈ[۱] پر
پھر آ گیا ہے وہ بتِ کافر گھمنڈ پر

از بس خضاب دوست ہیں مدت سے شیخ جی
رہتی ہے ان کے ہاتھوں سے آفت ارنڈ پر

اچھا ہو کس طرح سے مرا داغِ دل کہ یاں
ناخن سے نت خراش رہے ہے کھرنڈ پر

کر دل کے آئنے کو مرے صاف اینٹ سے
موقوف کچھ جلا نہیں اس کی کرنڈ[۲] پر

اے **مصحفی** میں بیٹھ کے واں کیا غزل پڑھوں
جائے کہ لاکھوں گردنیں ہلتی ہوں کھنڈ پر

---

۱ - ڈنڈ : بازو -
۲ - کرنڈ : دھار تیز کرنے کا پتھر :

یہ باڑھ میری کاٹ کی دی کس نے اس قدر
جو تم رگڑ رہے ہو سروہی کرنڈ پر

کرنڈ (ہ) مذکر : ایک قسم کے مسالے سے بنا ہوا پتھر ، جو نگینے وغیرہ کے گھسنے ، ہتھیار تیز کرنے کے کام آتا ہے -
(نوراللغات جلد ۳ ، صفحہ ۷۵۸)

۲۳۵

منہ سے برقعے کو مری جان اتارا آخر
کام در پردہ کیا تم نے ہمارا آخر

موجِ دریا کی طرح اینٹھو ہو اب کاہے کو
لو جی، ہم نے ہی کیا تم سے کنارا آخر

اول عمر میں دیکھا اسے جس نے یہ کہا
کام آتش کا کرے گا یہ شرارا آخر

جس سے دیں آنکھیں ملا اس صنمِ کافر نے
اتنا گھورا کہ اسے جان سے مارا آخر

دوستاں مصحفیِ خستہ کا کیا کیجے علاج
غمِ خوباں سے ہوا ہے یہ بچارا آخر

سوچ کر بہر خدا تم بھی تو کچھ بتلاؤ
کار افتادہ بہ ایں قوم شما را آخر

۲۳۶

جس بت نے نہ باندھا کبھی زنار کمر پر
اب اس کے سجی رہتی ہے تلوار کمر پر

شملہ وہی جو ہووے بہ اندازۂ شیخی
پھر دم ہے جو لٹکا سرِ دستار کمر پر

کب شاخِ گل اس طرح لچکتی ہے ہوا سے
کرنا نظر اس کی دمِ رفتار کمر پر

کیا دخل ہے بہلہ[1] کا مجھے رشک ہے یارو
اپنا بھی دھرے ہاتھ اگر یار کمر پر
شوریدہ سری اس کی تو بے وجہ نہیں ہے
عاشق ہے تری زلف کا ہر تار کمر پر
اتنا ہے وہ آوارہ کہ جب دیکھوں ہوں اس کو
ہیں پیچ گلے میں سر دستاز کمر پر
اے مصحفی سنہ چشم میں سوزن کے شتر ہے
مت آنکھ کو سی اس کی تو زنہار کمر پر

۲۳۷

تیروں پہ تیر کھا کر زخموں پہ زخم اٹھا کر
آئے تری گلی سے ہم خون میں نہا کر
ہے ٹھوکروں سے تیری مردوں کے دل کو صدمہ
محشر خرام میرے ٹک راہ سے چلا کر
پیارے یہ دشمنی ہے کچھ دوستی نہیں ہے
پلکوں کو بھیر لینا یوں انکھڑیاں ملا کر
ٹک گھور کر جو دیکھا ظالم نے ڈر کے مارے
کل ووں ہی پی گیا میں آنکھوں میں آنسو لا کر

---

۱ ۔ بہلہ : چمڑے کا دستانہ ۔
۱ بہلہ ۔ (ن ۔ بالکسر و فتح لام) مذکر : چمڑے کا پنجہ جس کو شکاری ہاتھ میں پہن کر شکرے یا باز کو ہاتھ پر بٹھاتے ہیں ۔ ایک قسم کا بٹوا جس میں روپیہ ، پیسہ اور ضروری کاغذات رکھتے ہیں ۔ (نوراللغات حصہ اول ، صفحہ ۷۳۲)

مصحفی اب تو گریہ کر موقوف
آستینوں کے خوں میں ڈوبے کوس[1]

۲۵۲

کیوں نہ یہ زلف پھبے اب ترے رخسار کے پاس
کہ طرح دار ہے زیبندہ ، طرح‌دار کے پاس

ہم[2] اسیرانِ قفس لطف چمن کیا جانیں
کون لے جاتا ہے ہم کو گل و گلزار کے پاس

تجھ سے طماع[3] سے بیارے بنے کیوں کر سودا
جبکہ جز جان نہ ہو تیرے خریدار کے پاس

رستموں نے میاں ابرو سے تری منہ موڑا
وے ہمیں ہیں کہ چلے جاتے ہیں تلوار کے پاس

اب تلک چشمہ و سیلاب بہے جاتے ہیں
ایک دن روئے تھے ہم بیٹھ کے کہسار کے پاس

جو مرے حال کو سنتا ہے وہ رو دیتا ہے
ہائے لے جاؤں یہ غم کون سے غم خوار کے پاس

حق تو یہ ہے کوئی کم ہووے گا ہم سا جاں‌باز
شوق سے آپ چلے جاتے ہیں ہم دار کے پاس

اس کی ٹک خاطرِ نازک ہی کا ڈر ہے ورنہ
منہ تو سرگوشی میں لے جاتا ہوں رخسار کے پاس

---

۱ - کوس : آستین کا کف -
۲ - یہ : پ -
۳ - طماع : لالچی -

مصحفی اک غزل اب اس سے بھی بہتر لکھ اور
جا کے پڑھنی ہے ہم بیٹھ کے دوچار کے پاس

۲۵۵

کون آتا ہے عیادت کو دلِ زار کے پاس
لوگ سب جمع ہیں اس نرگسِ بیمار کے پاس

رشکِ معشوقیِ صیاد کا میں بندہ ہوں
جس نے رکھا نہ قفس کو مرے گلزار کے پاس

پاس عصمت اسے اتنا ہے کہ وہ طفلِ حسیں
بیٹھتا ہی نہیں ٹک اپنے گنہ گار کے پاس

ہم پہ وہ مایہ کہاں لیک ز روے تقریب
جا کھڑے ہوتے[1] ہیں ہم اس کے خریدار کے پاس

رو سیہ زلف کو کیوں کر نہ کہوں اپنا رقیب
دیکھتا ہوں اسے ہر دم ترے رخسار کے پاس

ایسے ظالم سے کوئی کیوں کہ بچے خورد و بزرگ
جس کے خنجر بھی کمر بیچ ہو تلوار کے پاس

لے تو خوش رہ کہ میاں ہم نے ہی آنکھیں موندیں
دیکھتے کب تلک[2] ہر دم تجھے اغیار کے پاس

ہم بہ منت اسے اب گھر میں جگہ دیتے ہیں
جس نے ہم کو نہ دیا بیٹھنے دیوار کے پاس

---

۱ - رہتے (انتخاب حسرت ، صفحہ ۳۷)
۲ - 'کب تلک' کی جگہ 'تابکے' وزن کے مطابق ہے - مصحفی جیسے استاد سے یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ وہ 'فعلاتن' کی جگہ 'مفاعیان' استعمال کرے ، اس لیے کہ 'تلک ہردم' بر وزن 'مفاعیلن' ہے - 'بکے ہردم' سے 'فعلاتن' حاصل ہوتا ہے - (فائق)

لعلِ لختِ جگر و گوہرِ ہر اشک غرض
کون سا تحفہ کہ ہم لے نہ گئے یار کے پاس

کیوں نہ ہرروز خرابی تری(مری؟) مہماں ہووے
کہ میں گھر مول لیا خانۂ خمار کے پاس

مصحفی چشم سے ساقی کی نہ رکھ تو صحبت
بیٹھنا خوب نہیں صوفی کو مےخوار کے پاس

ردیف ش

۲۵۶

نہیں دل دار کوئی ہووے دلآزار ہی کاش
گل تو معلوم ، لگے ہاتھ مرے خار ہی کاش

جس کی میں حسرتِ دیدار[1] میں جاں دیتا ہوں
ایک ذرہ وہ دکھادے مجھے رخسار ہی کاش

گرچہ عشاق ترے سارے ہیں گردن زدنی
علفِ[2] تیغ ہو لیکن یہ گنہگار ہی کاش

لطف سے اس بتِ خوں خوار کے ہم درگزرے
آ کے غصے میں لگاوے کوئی تلوار ہی کاش

نظر آتا ہے مجھے دور سے جو طفلِ حسیں
میں یہ کہتا ہوں کہ یہ ہووے مرا یار ہی کاش

درِ گلزار تو کب منہ پہ ترے کھلتا ہے
کھول دے بادِ صبا رخنۂ دیوار ہی کاش

---

۱ - خواہش رخسار : ل ۲ -
۲ - علف : سبز چارہ (خوراک) -

مصحفی دیکھنا ہے اس کے خریداروں کو
آج وہ جلوہ نما ہو سرِ بازار ہی کاش

۲۵۷

کرے ہے جوں جوں اپنے حسن کی وہ شوخ آرائش
ہمارے عشق کی ہوتی ہے یاں ویسی[1] ہی افزائش

تبسم اس دہانِ تنگ میں کیوں کر کہ رہ پاوے
کہ جس کے بیچ تنگی سے نہیں تنکے کی گنجائش

مرا دل عشق کے گلشن کا اے یارو وہ بلبل ہے
نہ آوے جس کو غیر از سایۂ گل خواب آسائش

جو نوکر سرو قد تیرے کے ہیں سرکارِ عالی میں
سوائے نقد غم ان کو ہے بالائی بھی پیدائش

نہیں کچھ مصحفی اتنا تو مفلس سوچتے کیا ہو
بطورِ امتحاں کیجیے کبھی اس پر بھی فرمائش

۲۵۸

وقفہ اے پیکِ نگہ دیدۂ تر ہے درپیش
دن ہیں برسات کے اور رہ میں خطر ہے درپیش

بزم ہستی میں کچھ آسودہ نہیں بیٹھے ہم
جوں چراغِ سحری ہم کو سفر ہے درپیش

---

۱ - دل سے ہی : ل ۲ -

دل حیراں کی مرے دیکھیو[1] کیا صورت ہو
اب تو واں آئنہ ہی آئنہ پھر ہے درپیش

امتحاں باتوں میں کرتے ہو ہمارا اے واہ
کھینچیے تیغ کو واللہ یہ سر ہے درپیش

مثل آئینہ وہ حیران تماشا ہے ترا
جس کی صورت ترے اے رشک قمر ہے درپیش

زلف و رخسار کا اس آئنہ سیما کے خیال
اپنی آنکھوں کے غرض شام و سحر ہے درپیش

کیوں نہ رک رک کے گریں دیدۂ تر سے اب اشک
مصحفی دل کے مرے لختِ جگر ہے درپیش

۲۵۹

بھڑکے ہے تپِ عشق کی دل میں غضب آتش
اے گریہ! چھڑک آب کہ ٹک جاوے دب آتش

کیا کام کیا تو نے مرے دل کو جلایا
کعبے کو لگاتا ہے کوئی بے ادب آتش

شاید کہیں گزرا ہے تو دامن کو جھٹک کر
دہکی نہیں سینے میں مرے بے سبب آتش

جھمکا تھا وہ اپنی ہی تو اس آتشِ دل کا
موسیٰ کو جو آئی تھی نظر وقتِ شب آتش

کس ساعتِ بد ہوگی بنا خانۂ دل کی
لگتی ہے اسی گھر کے تئیں جب نہ تب آتش

---

۱ - دیکھیے : ل ۱ ، پ -

جلنے کے سوا کام نہیں اس کو، رکھی ہے
اللہ نے پروانے کے دل میں عجب آتش

برق اس کے دمِ گرم سے کس طرح بر آوے
ہو ہر نفسِ سرد کا جس کے لقب آتش

جل جائے گا عالم مجھے مت خوف[1] میں لاؤ
ہے برق کے مانند مرے زیرِ لب آتش

کیوں کر کہوں ہجراں میں ترے اب نہیں جلتا
ویسی ہی تپش اور وہی روز و شب آتش

انگارے سے دہکے ہیں مرے سینے میں اب تک
کس روز بجھا شعلہ، ہوئی سرد کب آتش

اے مصحفی پوچھ اس کی نہ کچھ گرمی و نرمی
ظالم گہِ لطف آب ہے، وقتِ غضب آتش

۲٦۰

دانستہ کیا جس نے مرا نام فراموش
ہوتا نہیں مجھ سے وہ دلآرام فراموش

یاد آتا ہے جس وقت ترے کوچے کا جانا
ہو جاتے ہیں اُس وقت تو سو کام فراموش

ہم سے سبقِ عشق مسلم نہیں ہوتا
گر صبح کو ہے یاد تو پھر شام فراموش

اللہ رے تری شوکت و شاں، دیکھ کے جس کو
قاصد نے کیا خوف سے پیغام فراموش

---

۱ - حرف (انتخاب حسرت صفحہ ۳۸)

اک مرتبہ دیکھی جو تری چشم کی گردش
لے ہاتھ پہ ساقی نے کیا جام فراموش
میں ہوں وہ گرفتار کہ صیاد نے جس کو
کر صید کیا ہووے تہِ دام فراموش
چھڑکا ہے نمک اس نے مرے زخمِ جگر پر
ہو کیوں کہ تری لذتِ دشنام فراموش
اے مصحفی کیا بھیج کے خط یاد دلاؤں
اس نے تو کیا مجھ کو بہ ابرام فراموش

۲۶۱

جنت کی تمنا ہے نہ گلزار کی خواہش
رہتی ہے ہمیں اک ترے دیدار کی خواہش
دل دام میں زلفوں کے جو پھڑکے ہے تو پھڑکو
کام آتی ہے کیا مرغِ گرفتار کی خواہش
منہ موڑ نہ قاتل دلِ کم ذبح سے میرے
ہے اس کے تئیں اور بھی اک دار کی خواہش
جی دوڑے ہے اس کا تو نت اک تازہ ہوس پر
ہو ایک تو کہیے دلِ بیمار کی خواہش
بوسے کی طلب ہم بھی کریں اس کے لبوں سے
نکلی ہو کبھی اس سے جو دوچار کی خواہش
مت جانو موے پر گئی زاہد کی بزرگی
ہے ویسی ہی اب تک اسے دستار کی خواہش
ہے ظلم اسے مرہمِ کافور لگانا
جس زخم کو ہو مرہم زنگار کی خواہش

ہم بھی نہیں رکھتے ہیں دریغ اس سے سر اپنا
اے مصحفی ! ہے یوں ہی اگر یار کی خواہش

ردیف ص

۲۶۲

رکھتا ہوں میں تجھ سے جی سے اخلاص
ہرگز نہیں اور کسی سے اخلاص

کیا جانے وہ قدرِ صافیِ دل
ہے اس کو تو آرسیؔ سے اخلاص

دشمن کو بھی دوست جانتے ہیں
ہے اپنے تئیں سبھی سے اخلاص

دشمن تمھیں کون جانتا ہے
تم بانٹتے ہو سبھی سے اخلاص

اے مخلصِ بے ریا کسی کے
موقوف کیا ابھی سے اخلاص

ق

رکھتا ہے وہ دشمنِ محبت
یوں اور تو ہر کسی سے اخلاص

کیا جانیے کیا خطا ہے اس کی
جو ترک ہے مصحفی سے اخلاص

۲۶۳

پاس اپنے تو اے یارو نے سیم ، نہ زر خالص
یا اشکِ مصفی ہیں یا خونِ جگر خالص

تیرے لبِ شیریں کا وہ نرخ نہیں پاتی
ہر چند فروشندہ رکھتا ہو شکر خالص

کیا عیب ہمارے کو بتلاوے کوئی یارو
ہیں عاشقِ صاف اس کے رکھتے ہیں نظر خالص

قطرات سے آنسو کے ہیں تار نظر روشن
میں اس میں پروئے ہیں ازبس کہ گہر خالص

اٹھ مصحفی مسجد سے میخانے میں آیا ہے
پیمانے میں اے ساقی! مے بھر کے تو لا خالص

ردیف ض

۲۶۴

کچھ خط ہی نہیں فدائے عارض
ہے زلف بھی مبتلائے عارض

لغزش سے نظر نہیں ٹھہرتی
اللہ تری صفائے عارض

پھر گل کی طرف کبھو نہ دیکھے
بلبل کو جو تو دکھائے عارض

جوں زلف ہوں گو کہ دل پریشاں
جانے ہے تری بلائے عارض

ہر حلقۂ زلف میں ترے یار
خالی ہے ہمیشہ جائے عارض
کم حوصلہ تھا ،کسی کو جوں خال
میں دل نہ دیا سوائے عارض
منہ پیٹتا دیکھ مصحفی کو
دل نے بھی کہا کہ ہائے عارض

۲٦۵

دیکھ آئنے میں اپنی وہ بہارِ عارض
پیار کی نظروں سے ہوتا ہے نثارِ عارض
مل گئے خاک میں گل چہرہ ہزاروں ایسے
کہ نہ جھاڑا کسی نے ان کا غبارِ عارض
آئنہ صدقے گیا تھا ترے مکھڑے کے میاں
اس میں کاہے کو تھے یہ نقش و نگارِ عارض
زلف کو دیکھ کے تیری مجھے رشک آتا ہے
کہ میسر ہے اسے بوس و کنارِ عارض
گل کا یہ منہ ہے کرے حسن کا اس کے دعویٰ
مہر و مہ ہو نہ سکیں جس کے دوچار عارض
اب وے عارض کے تلے ہاتھ دھرے سوتے ہیں
کبھی گل تکیوں پہ تھا جن کے قرارِ عارض
عالم نیم رخی کو تری تصویر کی دیکھ
مل گئی خاک میں سب گل کی بہارِ عارض
کیا برے لوگ ہیں وہ بھی جو مرے گل رو کا
نگہِ گرم سے کرتے ہیں فشارِ عارض

مصحفی محو ہوں کس کا میں جو رہتی ہیں سدا
پُتلی آنکھوں کی مری آئنہ دارِ عارض

ردیف ظ

۲۶۶

کس دن لکھا تھا آپ کو میں عاشقانہ خط
جو سو سو گالیاں مجھے دیتے ہو بے نقط

بغدادِ حسن بھی ہے عجب جا کہ جس کے بیچ
دیتے نہیں خلیفہ کو یک جرعہ آبِ شط[1]

ہم سب سزائے نکہتِ بادِ بہار تھے
ایدھر بھی ہو گئی رہِ پیکِ صبا غلط

کھینچا ہے بس کہ سر بہ فلک بحرِ اشک نے
ہے نسر طائر[2] اس میں شناور بسانِ بط

وے دن گئے کہ پیتے تھے جامِ شرابِ سرخ
اپنی معاش خونِ جگر پر ہے اب فقط

افغاں کہ نامہ بر کے مجھے اضطراب سے
مہلت ہوئی نہ اتنی کہ دے لوں قلم کو قط

---

۱ - شط : (ع) دریا -
۲ - نسر طائر : (ف - لفظی معنی اڑتا ہوا) ستاروں کے ایک گچھے کا نام جس کی شکل اُس گدھ سے مشابہ ہے جو پر پھیلائے ہوئے اوپر کی طرف اڑتا ہو - (نوراللغات ، جلد ۴ ، صفحہ ۶۵۶)

محشوش[1] ہاتھ آیا تھا دیوان مصحفی
لکھتے ہوئے چلے گئے ہم بھی غلط سلط[2]

۲٦۷

رکھتا ہے بس کہ ہاتھ گریباں سے اختلاط
جوں گل ہے چاک جیب کو داماں سے اختلاط

جوں گل سوائے شبنمِ الماس ریزہا
رکھتا ہے کون سینہ فگاراں سے اختلاط

مذہب میں اپنے دوستیِ تنگ کفر ہے
کیوں کر کریں نہ گبر و مسلماں سے اختلاط

وے دن گئے کہ تھا دلِ صد چاک کو مرے
جوں شانہ اس کی زلفِ پریشاں سے اختلاط

بن سازش اس کی بزم میں پاوے نہ بار شمع
کرنا ہمیں ضرور ہے درباں سے اختلاط

امرد پرست تو نہیں اتنا میں مصحفی
پر بیش و کم ہے فرقۂ نسواں سے اختلاط

ردیف ظ

۲٦۸

عالم ہے مرے بیاں سے محظوظ
میں عشق کی داستاں سے محظوظ

---

۱ - محشوش : بالفتح ؛ سوختہ شدہ و آلودہ و مکروہ - (غیاث اللغات ص ۳۰۳)

۲ - غلط - پ

سینے پہ لگی سناں جو اس کی
دل خوب ہوا سناں سے محظوظ

کیا جانے وہ لذتِ قفس کو
جو مرغ ہو آشیاں سے محظوظ

تو ساتھ نہ ہو تو ہم نہ ہوویں
سیرِ گل و گلستاں سے محظوظ

ہم لذتِ زخم پر مریں ہیں
وہ ہوتے ہیں امتحاں سے محظوظ

بلبل کی فغاں تو بے اثر ہے
کیا ہووے گل اس فغاں سے محظوظ

اک زخم بھی کارگر نہ آیا
ہوں کشتے ترے کہاں سے محظوظ

ق

جو مردہ پسند لوگ ہوویں
اے مصحفی رفتگاں سے محظوظ

میں عیسئی وقت ہوں تو ہرگز
ہوں وے نہ مری زباں سے محظوظ

ردیف ع

۲٦۹

میں کیا گریہ دن اور رات شروع
پھر ہوا موسمِ برسات شروع

میری تربت پہ کوئی شعر پڑھو
نہ کرو مصحف و آیات شروع

یار مل کر ووں ہی جاتا ہی رہا
کرنے پائے بھی نہ ہم بات شروع

میں گیا بزم میں اس کی تو بہ غیر
کیں وہیں اس نے اشارات شروع

دیکھیں پایان محبت کیا ہو
ہیں ابھی عشق کی آفات شروع

عشق کی پڑھتے ہیں جو شخص حدیث
وے نہیں کرتے ہیں مشکوٰت[1] شروع

مصحفیؔ دیکھیے کیا ہو اس نے
کی ہے غیروں سے ملاقات شروع

۲۷۰

ہر اک کی معاش کی ہے اک وضع
تدبیر و تلاش کی ہے اک وضع

ہے سرو چمن اگرچہ خوش ڈول
پر تیری تراش کی ہے اک وضع

اب تک دم آخری میں میرے
نالے کی خراش کی ہے اک وضع

ہے گل کا قماش سرخ اور زرد
بلبل کی قماش کی ہے اک وضع

اے مصحفیؔ ! دیکھ ماہ نو میں
اس زین کی قاش[2] کی ہے اک وضع

---

۱ ۔ مشکوٰۃ ۔ مشہور کتاب حدیث ۔

۲ ۔ قاش : ابرو باشد در ترکی و ازیں ماخوذ است قاش خربزہ (شمس اللغات ، ص ۱۲۱ ، ج ۲)

۲۷۱

جن کے مکاں چمن ہیں وے لوٹیں بہارِ شمع
ہم غم زدوں کی بزم میں کب ہے گزارِ شمع

تاریک گو ہو راہِ عدم، جاویں گے چلے
کچھ وے نہیں ہیں ہم جو کریں انتظارِ شمع

کیا صبح ہوتے بجلی پڑی اس پہ کیا ہوا
کیوں سرد ہو گیا نفسِ شعلہ بارِ شمع

صحبت اگر یہی ہے تو اس انجمن کے بیچ
کچھ گل کھلا رہے گا دلِ داغ دارِ شمع

ہے رشک مجھ کو اس کے نصیبوں پہ کیا کہوں
پروانہ کس طرح سے ہوا ہے نثارِ شمع

بے داغ ایک تارِ گریباں نہیں مرا
کر سوختہ میں ان کو بنایا ہے تارِ شمع

ہر شب تصورِ رخِ پُر نُور میں ترے
تا صبح میری آنکھیں رہیں ہیں دوچارِ شمع

منعِ قلق بہ تیغ بھی عاشق کو ہے محال
کچھ سر کٹے سے کم نہ ہوا اضطرارِ شمع

رو کش نہ مجھ سے دشمنِ کم مایہ ہو سکے
کیا آگے آفتاب کے ہے اعتبارِ شمع

لے کر گیا ہوں داغِ سہی قامتاں بہ خاک
کیجو مرے مزار پہ روشن قطارِ شمع

دیکھا تھا اس کو پردۂ فانوس سے کہیں
تھمتی نہیں ذرا مژۂ اشک بارِ شمع

شوخی تو دیکھ ہاتھوں سے مکھڑا چھپا لیا
لے کر گیا میں رات جو اس کو دوچارِ شمع
پروانہ سر پٹک کے لگن ہی میں مر گیا
ایسے کہاں نصیب کہ ہو ہم کنارِ شمع
دیکھا ہے جب سے اس مہِ تاباں کو **مصحفی**
کچھ زرد ہو گیا ہے تبھی سے عذارِ شمع

ردیفِ غ

۲۷۲

باندھے ہے جب کمر سے مرا خوش خرام تیغ
کرتی ہے خونِ بے گنہاں گام گام تیغ
یوں بے دریغ ذبح کیا کس کو جو تری
تا قبضہ بھر رہی ہے لہو سے تمام تیغ
لڑنے لگیں ہیں پھر تری آنکھیں ہر ایک سے
چلتی ہے دوستوں میں پھر اب صبح و شام تیغ
کیا جانے کس کو قتل کیا آج، مضطرب
آتا ہے ہاتھ میں وہ لیے بے نیام تیغ
صیاد نے کیا ہے عجب ظلم اختراع
کرتا ہے جاے دانہ نہاں زیرِ دام تیغ
اس کی ہر ایک وضع کے کشتے ہیں ہم کہ ہے
دستِ کشیدہ خنجر و طرزِ سلام تیغ
کیا رحم تجھ کو میری جوانی پر آ گیا
لی وقتِ قتل تو نے جو کل تھام تھام تیغ
کیا جانے کس کے خوں کا وہ پیاسا ہے **مصحفی**
رکھنے لگا ہے ہاتھ میں اب پھر مدام تیغ

۲۷۳

کبھی جو غصے کے وقت اس کے ہاتھ آئی تیغ
تو اس نے کھینچ کے میرے ہی اک لگائی تیغ

اگر یہ ہاتھ ہیں تیرے تو ایک دن ہم کو
دکھا رہے گی ترے ہاتھوں کی صفائی تیغ

نہ بچ کے آیا کوئی اس کے آبرو[1] مژگاں سے
کسی کے تیر لگا اور کسی نے کھائی تیغ

اسے بھی سخت تمنائے سرخ پوشی تھی
بھلا ہوا کہ مرے خوں میں اب نہائی تیغ

وہ خانہ جنگ پھکیتوں میں ہے بڑا ہتھ چُھٹ
سر اس کا دو ہی کیا جس کے اک لگائی تیغ

میں چاند روزوں کا دیکھے تھا شب کھڑا سر بام
کہ اتنے میں ترے ابرو نے لا دکھائی تیغ

وہ بیچ چوک کے کل **مصحفی** سے بگڑا تھا
لپٹ کے یاروں نے ہاتھ اس کے سے چھٹائی تیغ

۲۷۴

جب اس نے قبضہ پکڑ ہاتھ میں اٹھائی تیغ
قیامت ایک غریبوں کے سر پہ لائی تیغ

ہمارے ساتھ بڑی اس نے کج ادائی کی
تری کمر پہ میاں جس نے کج بندھائی تیغ

میں شب جو سر بہ فلک کھینچنے کا قصد کیا
تو کہکشاں نے مجھے دور سے دکھائی تیغ

---

۱ - مژہ سے : ل ۱ ، ۲ ('ابرو و مژہ سے' صحیح ہوگا ۔ فائق)

تو سادگی تو ذرا دیکھ میرے قاتل کی
کہ قتل کر مجھے دامن میں کل چھپائی تیغ
میں ہاتھ چوم لیے اس کے دوڑ کر ووں ہی
جب اس نے سر پہ مرے پیار سے لگائی تیغ
اٹھایا سر جو میں گاہے تو دست قاتل سے
چمک کے سر پہ مرے برق سی کچھ آئی تیغ

ق

سنا ہی ہوگا یہ قصہ کہ مر گیا قابیل
جب اس غریب کے ہابیل نے لگائی تیغ
مقام عشق میں ایسے ہی خون ہوتے ہیں
عجب نہیں ہے جو بھائی پہ کھینچے بھائی تیغ
کٹے وہ کیونکہ نہ دل میں کہ مصحفی شب دوش
میں خالی دے گیا وار اس نے جب چلائی تیغ

۲۷۵

مرے سینے کا بن سرخی نہیں داغ
برنگ لالہ ہے یہ آتشیں داغ
فلک پر بھی ترے خال جبیں نے
کیا ہے ماہ کو اے مہ‌جبیں! داغ
ہوئے تھے جل کے خاکستر جہاں ہم
عجب کیا ہے وہاں کی ہو زمیں داغ
تری بند حنا کا کشتہ ہے دل
تبھی تو یہ کہیں خوں ہے کہیں داغ
برنگ لالہ جس پہلو سے دیکھو
ہمارے دل کا ہے پہلو نشیں داغ

دھلایا دست و تیغ اس نے تو کیا ہیچ
رکھے ہے خوں کے اب تک آستیں داغ

مرا دل مصحفیؔ خاتم بنا ہے
ہم اس خاتم پہ نیلم کا نگیں داغ

۲۷۶

آتا ہے عجب دھج سے وہ کاندھے پہ دھرے تیغ
کیا جانے علم قتل کو اب کس کے کرے تیغ

بیٹھے ہیں ہوس کشتہ کئی آج سر راہ
جی دینے پہ، مت لائیو ظالم تو ورے تیغ

قاتل جو لگاتا ہے تو ٹک ہٹ کے لگانا
ڈرتا ہوں ترا خون میں دامن نہ بھرے تیغ

اے صید دل اس کوچے سے جاوے گا کدھر کو
مژگاں کے ورے تیر ہیں ابرو کی پرے تیغ

اے **مصحفی**! اس گل کی نہ ہو طبع شگفتہ
جب تک کہ مرے خوں میں وہ رنگیں نہ کرے تیغ

ردیف ف

۲۷۷

تھے جو جنوں زدہ گئے زنجیر کی طرف
ہم کو قضا جو لائی تو شمشیر کی طرف

ہر اک کشش میں اس کی کھنچا جا ہے جی مرا
دیکھوں کہاں کی کہ ترے تیر کی طرف

ہاتھوں سے اپنے اب کے بن آیا جو کچھ تو ہم
پیکِ دعا کو کھینچیں گے تاثیر کی طرف

جب کر چکا تمام تو پھر آہ رہ گیا
نقاش دیکھ کر تری تصویر کی طرف

قاصد جواب خط کا مرے خاک لائے گا
روتا گیا ہے اس بت بے پیر کی طرف

مشتاقِ دید میں ہی نہیں تیرے تیر کا
تکتی ہے چشم صید بھی رہ گیر کی طرف

دلّی پہ رونا آتا ہے کرتا ہوں جب نگاہ
میں اس کہن خرابے کی تعمیر کی طرف

سب عقدے کھول دیجیو اس کے تو اے صبا !
جاوے کہیں[1] جو زلف گرہ گیر کی طرف

یوں قتل کر نہ ڈالیے باتوں میں میری جاں
ٹک آدمی کی دیکھیے تقصیر کی طرف

جب لعل لب سے[2] اپنے تو ہوتا ہے درفشاں
رہتا ہوں دیکھ میں تری تقریر کی طرف

'مانی' نے ہاتھ سے قلم صنع رکھ دیا
خطِ بتاں کی دیکھ کے تحریر کی طرف

اپنی ہی تیغ کاری کی تعریف اس نے کی
دیکھا نہ سخت جانیِ نخچیر کی طرف

رسوا کریں ہیں یار مجھے ورنہ **مصحفی**
اپنا مزاج تو نہیں تشہیر کی طرف

---

۱ - کبھی : ل ۲ -
۲ - ہو ہے تو اپنے گہر فشاں : ل ۱ ، ۲ -

۲۷۸

دیکھا ہے جب سے اس بت خود کام کی طرف
خاطر کو میل ہی نہیں آرام کی طرف

ہم اس شکار گاہ کے صیاد ہیں ، جہاں
آیا نہ پر بھی اڑ کے کبھی دام کی طرف

اوروں نے جا خُموں سے منہ اپنے بھڑا دیے
کم بخت[1] ایک ہم ہی گئے جام کی طرف

گردش تمھاری چشم کی دیکھیں کدھر کو ہو
تکتی ہے ساری بزم اسی جام کی طرف

پروانہ وار تو جو نہ آیا تو جل گیا
میں دیکھ کر چراغِ سر شام کی طرف

یہ آئنے میں آنکھ ہی پھرنے پہ کی نگاہ
دیکھا مری بھی گردشِ ایام کی طرف

آغازِ خط میں حسن کا کھاتے نہیں فریب
مدِ نظر جنھوں کو ہے انجام کی طرف

ترکیب والے اور بھی دلتی میں ہیں ولے
غالب ہے دلبرانِ خوش اندام کی طرف

جو اس گلی سے گزرے ہے گزرے ہے بار بار
در کی طرف گہے تو گہے بام کی طرف

میرے نوشتے پر نہ ہنسو ، دیکھو ٹک میاں
اپنے رقیب کے بھی سرانجام[2] کی طرف

---

۱ - کم ظرف : ل ۲ -
۲ - میاں نام : ل ۲ -

دیکھا جو پختہ میوہ کوئی میں نے مصحفی
دل لے گیا مجھے طمعِ خام کی طرف

۲۷۹

زلفیں رہیں مکھڑے پہ کھل ، اک اس طرف اک اس طرف
موتی رہے کانوں میں ڈھل ، اک اس طرف اک اس طرف

میں ہوں وہ میکش اے مغاں مجلس میں جس کی حوریاں
کف پر لیے ہیں جام مُل اک اس طرف اک اس طرف

ساعد کا میرے پشت و رو کہنی تلک سب داغ ہے
کھاتا رہا ہوں بس کہ گل اک اس طرف اک اس طرف

گر تیری یکتائی کرے شمشیرِ غیرت کو علم
ہو جاویں ووں ہی جزو و کل ، اک اس طرف اک اس طرف

جاؤں کدھر اے مصحفی ! تیغیں نکالے ہاتھ میں
ابرو رہیں قاتل کے تل ، اک اس طرف اک اس طرف

۲۸۰

افعیِ سیاہ ہے تری زلف
یا مری اک آہ ہے تری زلف

سنبل پہ پڑے ہے آنکھ کس کی
تاپیشِ نگاہ ہے تری زلف

رخسار ترا ہے گل ولیکن
اس گل کی گیاہ ہے تری زلف

گردِ گلِ مار حلقہ زن ہے
یا ہالۂ[1] ماہ ہے تری زلف

---

۱ - اصل و پ : حالہ -

کیوں کر کوئی اس سے بچ کے نکلے
مارِ سرِ راہ ہے تری زلف

دل چاکی و خستگی پہ میری
باشانہ گواہ ہے تری زلف

آنکھ اس سے بندھی ہے مصحفی کی
زنجیرِ نگاہ ہے تری زلف

۲۸۱

ساتھ ساقی کے گیا اپنا تو مے پینے کا لطف
اس سے مرنا ہی بھلا اب کیا رہا جینے کا لطف

سبزۂ نوخیز خط کا حسن کچھ پنہاں نہیں
لعل سے لب سے ترے پیدا ہے اس مینے کا لطف

تو نے منھ پھیرا اور اس کا نور سا جاتا رہا
تھا تری صورت ہی تک اے یار آئینے کا لطف

ہم تو عاشق پیشہ ہیں کیا جانیں ان باتوں کو آہ
ایسے معشوقوں کے پوچھا چاہیے کینے کا لطف

صبح کی مانند ہے چاکِ گریباں تک بہار
مصحفی! پنہاں نہیں اس شوخ کے سینے کا لطف

ردیف ق

۲۸۲

کس سے کہیے آہ! کیا ہوتا ہے عشق
کچھ نہ پوچھو بد بلا ہوتا ہے عشق

ماجرائے عشق تو مجھ سے نہ پوچھ
سخت کافر ماجرا ہوتا ہے عشق

کام بیگانے سے کچھ اس کو نہیں
آشنا سے آشنا ہوتا ہے عشق

نظریں کس پرہیز سے کرتی ہیں سیر
جب تلک باہم چھپا ہوتا ہے عشق

فسق کو کہتے نہیں ہم لوگ عشق
یعنی عشق باصفا ہوتا ہے عشق

گو کہ بے عشقی میں گزرے سال و ماہ
عاشقوں سے کب جدا ہوتا ہے عشق

عشق مت کر عشق مت کر مصحفی
مان اے ناداں! برا ہوتا ہے عشق

۲۸۳

کھیل جاتے ہیں جان پر عاشق
جان دیتے ہیں آن پر عاشق

کوئی ان گالیوں سے ٹلتے ہیں
ہم ہیں تیری زبان پر عاشق

خواری آن عاشقوں کی وے جو ہوے
تجھ سے نا قدردان پر عاشق

تازہ آفت تو ایک یہ ہے کہ ہم
ہوے اس نوجوان پر عاشق

جان دینے کو سود جانتے ہیں
ہم ہیں اپنی زبان پر عاشق

اس قدر گرتی ہے، کہیے تو یہ برق
ہے مرے آشیان پر عاشق ؟

مصحفیؔ گر تو مرد کامل ہے
دل نہ رکھ اس جہان پر عاشق

۲۸۴

کسی پر میں نہ یاں از خود کیا عشق
کچھ آپھی آپ پیدا ہوگیا عشق

یہ سب چہلیں ہیں اس کی ہی طرف سے
تکلف بر طرف کیا حسن، کیا عشق

کیا رسوا عبث یاروں نے واللہ
مجھے اک دیکھنے کا اس سے تھا عشق

کیا بندہ بتوں کا مجھ کو اس نے
ہے یارو سخت کافر ماجرا عشق

نہیں دل بستگی ہرگز کسو سے
مگر ہے مصحفیؔ اک شعر کا عشق

۲۸۵

عشق میں اس کے ہوے ہیں بس کہ ہم رسوائے خلق
رات دن اکثر اٹھایا کرتے ہیں ایذائے خلق

خلق گر[۱] مجھ کو برا کہتی ہے تیرے عشق میں
گو کہے میرے تئیں بھی کب ہے اب پروائے خلق

ہائے جس کوچے میں نالے کی ہمیں رخصت نہ تھی
اب اسی کوچے میں ہے آٹھوں پہر غوغائے خلق

ایک یوسف جلوہ گر ہے مصر کے بازار میں
تس پر اس کے ساتھ ہے یہ گرمیِ سودائے خلق

---

۱ - تب : پ

مصحفی کے سر پہ رہیو سایہ تیری زلف کا !
آفتاب حشر میں جس دن کہ ہووے جاے خلق

ردیف ک

۲۸۶

وے شخص جو کہتے ہیں کہ ہے ذات خدا ایک
دیکھیں تو بتاں کو بھی بھلا آ کے ذرا ایک

ان خانگی معشوقوں سے نسبت نہیں اس کو
وہ خانہ برانداز تو ہے طرفہ بلا ایک

ایمان سا جاتا رہے ہے شیخ کا ووں ہی
ہوتی ہے جو پانچوں میں نماز اس کی قضا ایک

اس کوچے میں آئے تھے کفن باندھ کے سر سے
جو یاں سو ان میں سے تو جیتا نہ بچا ایک

قاتل ہے تجھے تیغ کا گر اپنی بھروسا
تا دو ہی کرے مجھ کو تو ایسی ہی لگا ایک

شاید کہیں سر کھینچا مرے سروِ رواں نے
جو آج گلستاں کی طرف فتنہ اٹھا ایک

جب مصحفیِ ریختہ گو ہو گیا خاموش
مذکور ہوا سب میں کہ اس فن میں وہ تھا ایک

۲۸۷

روتے روتے سو گیا ہے یہ دلِ رنجور ٹک
اے فغاں اس وقت تو تو مجھ کو رکھ معذور ٹک

زخم پر میرے نمک چھڑکا مرے جرّاح نے
کیا غضب ہوتا جو رکھتا مرہمِ کافور ٹک

اب تلک خمیازہ کھینچے ہیں پڑے اس باغ میں
سو گئے تھے ہم بہ‌زیر سایۂ انگور ٹک

آئنہ کیا جس کو دل چاہے تمھارا دیکھیے
پر میاں رکھیے ہماری بھی طرف منظور ٹک

اب تلک نرگس کی آنکھیں ہیں خجالت سے جھکی
وا ہوئی تھیں باغ میں وہ نرگس مخمور ٹک

بوسے لے لے بے ادب کھو دیتے ہیں رونق تمام
آوے ہے اس طفل کے چہرے پہ جوں ہی نور ٹک

مرد و زن کا حشر ہے کوچے میں اس کے مصحفی
ماجرا کہیے گا کم ہونے تو دے یہ شور ٹک

۲۸۸

کہاں ہم اور وہ رونا سحر تک
یہ باتیں ہو چکیں بس چشمِ تر تک

ادھر آ دیکھ چشمِ خوں فشاں میں
بہارِ لالہ ہے داغِ جگر تک

وہ اب تلوار کھینچے کیوں نہ آوے
دریغ اس سے نہیں یاں ہم کو سر تک

چہ جائے غیر یا رب اس گلی میں
مجھے ہے رشک اپنے نامہ بر تک

نہ اڑ جاویں گے اب تو چھوڑ صیاد
رہے دام و قفس میں بال و پر تک

چہ جائے زلف اس آئنہ رو کو
خیالِ سایہ ہے موے کمر تک

گو ہے مصحفی کوے بتاں میں
کوئی اب ہم سے پہنچا جاہے گھر تک

۲۸۹

شب شوق لے گیا تھا ہمیں اس کے گھر تلک
پر غش سا آ گیا وہیں پہنچے جو در تلک

گر ہم کو لگ گئی کبھی ہیں ہچکیاں تو ہم
آٹھ آٹھ آنسو روے ہیں دو دو پہر تلک

ڈرتا ہوں میں یہ گم نہ کرے آپ کو کہیں
پھر جعد[1] کو ہوئی ہے رسائی کمر تلک

پروانہ کیا اڑے ہے چراغاں میں ، تو نہیں
پہنچا جو کوئی شعلہ ترے بال و پر تلک

صحراے کشتگاں میں ترے کل گیا تھا میں
دیکھوں تو لالہ زار ہے مدِ نظر تلک

پھیلاؤ بحر اشک کا اپنے میں کیا کہوں
پہنچی ہے موجِ گریہ مری بحر و بر تلک

وے دن کدھر گئے کہ میں لکھ لکھ کے خطِ شوق
جاتا تھا آپ گریہ کناں نامہ بر تلک

تیزی میں نوکِ نشترِ مژگاں کی کیا کہوں
دل میں اگر چبھی تو وہ پیری جگر تلک

شب اس کی بزم میں جو گئے ہم تو مصحفی
ایسے جمے کہ واں سے نہ اٹھے سحر تلک

---

۱ - جعد : گھنگریالے بال ، چوٹی

۲۹۰

لاوے تو لاوے اس کے تئیں میرے گھر تلک
پہنچا تو ہے یہ نالہ مقامِ اثر تلک

کالے کی لہر ہووے خجل جس کے سامنے
اللہ رے تیری زلف کا چھٹنا کمر تلک

گو دل میں بال ہے ترے ہو جائے گا درست
پہنچا اگر یہ شیشہ کسی شیشہ گر تلک

نکلی ہے تیری تیغ تغافل، عجب ہے یار
گر موجِ خوں نہ گزرے دو عالم کے سر تلک

ہو[1] جائیں گے پتلیوں ہی پہ آنسو توے کی بوند
گر کام کر گئی تفِ دل چشمِ تر تلک

آنسو وہ لعلِ بیش بہا ہے کہ جوہری
قیمت میں جس کی دیتے ہیں لعل و گہر تلک

اپنا چراغِ عمر سرِ شام ہو گیا
جلنے کا اس کے کام نہ پہنچا سحر تلک

جاتا ہے گر تو یار کے کوچے میں مصحفی
چل، میں بھی تیرے ساتھ ہوں اس رہ گزر تک

ردیف گ

۲۹۱

کہتی ہے نماز صبح کی بانگ
اٹھ صبح ہوئی ہے کچھ دعا مانگ

---

۱ - 'ہو جائیں گے' سے مصرع ساقط الوزن ہو جاتا ہے - 'ہوجائیں' سے وزن درست ہو جاتا ہے - (فائق)

دیکھا میں نے چہار دانگِ عالم
پر ہاتھ لگا نہ کچھ بھی اک دانگ[1]

سیمیں بدن اس کا چاندنی میں
ڈرتا ہوں پگھل نہ جاوے جوں رانگ

ٹوٹا جو ہمارا شیشۂ دل
پہنچے گی فلک تک اس کی گلبانگ

بہروپ ہے یہ جہاں کہ جس میں
ہر روز نیا بنے ہے اک سانگ

کرتا ہوں سوال جس کے در پر
آتی ہے یہی صدا کہ پھر مانگ

دلّی میں پڑیں نہ کیوں کہ ڈاکے
چوروں کی ہر ایک گھر میں ہے تھانگ[2]

اے شوخ یہ خون مصحفی ہے
چل بچ کے، نہ آتے جاتے یوں لانگ[3]

۲۹۲

اس نے دیکھا صاف کیا آس دیدۂ پرخوں کا رنگ
کچھ مکدر سا نظر آیا مجھے جیحوں کا رنگ

اس قدر کاہے کو چہرہ اس جواں کا زرد تھا
عشق لیلیٰ نے کیا ہے ہائے یہ مجنوں کا رنگ

---

۱ ۔ دانگ: (ہ) درم کا چوتھائی حصہ ۔
۲ ۔ تھانگ: (ہ) چوروں کی کمین گاہ ۔
۳ ۔ لانگنا: (ہ) پھلانگنا، کسی چیز کے اوپر سے اس طرح گزرنا
کہ اس پر پاؤں نہ پڑے ۔

لالۂ خودرو کی جا کر دیکھ ٹک اس کے بہار
جیسے کندن سا جھمکتا ہے پڑا ہاموں[1] کا رنگ

جس طرح ابر سیہ سے جلوہ فرما ہو شفق
یوں مسی سے ہے نمایاں اس لبِ میگوں کا رنگ

کب حنائے بستہ کے باندھے سے حاصل ہو وہ لطف
گو الٹ کر یار پھر باندھیں مرے مضموں کا رنگ

نیم‌بسمل کی طرح خوں میں تڑپ کر رہ گیا
آخر آخر یہ ہوا پیارے ترے مفتوں کا رنگ

گرچہ سو سو بار دھویا اس نے آبِ گرم سے
دامنِ[2] قاتل سے پر چھوٹا نہ میرے خوں کا رنگ

آہ پر لختِ جگر کو کر دیا تونے جو نصب
مصحفی کیا تھا یہی اس مصرعِ موزوں کا رنگ

۲۹۳

رکھتی ہے جو عارض کی ترے جلوہ گری رنگ
ویسا تو کہاں پاوے میاں حور و پری رنگ

دیکھا ہے تجھے جلوہ کناں جب سے چمن میں
ہر گل کا اڑاتی ہے نسیم سحری رنگ

روکش ترے ہونٹوں سے جو ہوتا ہے وہ شاید
ہے تشنۂ خوں اپنا عقیقِ جگری رنگ

جو نالہ کہ آغشتہ بہ‌خوں سینے سے نکلا
پایا نہ میں اس میں بھی بجز بے‌اثری رنگ

---

۱ - ہاموں : (ع) میدان ، جنگل ، ریگستان ۔
۲ - خنجر قاتل : ل ۱، ۲، ۳ ۔

تربت پہ مری ہم‌نفساں عود جلانا
یعنی ہوں میں مقتولِ لباسِ اگری رنگ

یارو دمِ آخر بھی مرا یاس کے مارے
کیوں زرد نہ ہو، جیسے چراغِ سحری رنگ

بیداد ہے دینا اسے نسبت رگِ گل سے
رکھتی نہیں ہرگز تری نازک کمری رنگ

گزرا نہیں گر دل سے وہ خونی جگراں کے
رکھتی ہے ترے تیر کی پھر کیوں یہ سری رنگ

عارض پہ ہوا خط کا غبار آکے نمایاں
اب کیوں کہ نہ ہو حسن کا تیرے سفری رنگ

اللہ رے اس تیری بنا گوش کا جلوہ
رکھتا نہیں ایسا کوئی گل برگ تری رنگ

تا دامنِ قاتل نہ ہو آلودۂ تہمت
زخموں نے چرایا ہے یہ خونِ جگری رنگ

گر دیکھیے جوں شمعِ سحر بشرے کو ان کے
ہے بزم نشینانِ جہاں کا سفری رنگ

ہم سنگ[1] کروں اس کا اگر لختِ جگر کو
ہو جاوے سبک ووں ہی عقیقِ جگری رنگ

اے مصحفی! جو گل کہ اُگا خاک سے میری
لایا نہ وہ آخر کو بجز بے ثمری رنگ

ردیف ل

۲۹۴

امڈے ہیں نین سے آج بادل
بھر جاویں گے روتے روتے جل تھل

---

۱ - ہم سنگ کرنا: (ف) برابر کرنا، تولنا۔

اے عشق ! جہاں ہے یار میرا
مجھ کو بھی اسی جگہ تو لے چل

یارب کہ نہ چین سے وہ سووے
جس نے کہ کیا ہے مجھ کو بیکل

نت اپنی تو بوریے پہ گزری
دیکھا نہ بہخواب فرشِ مخمل

گر قتل کرے ہے عاشقوں کو
مجھ کو بھی تو ذبح کر لے اول

کیا فکر کریں کہ ہے ہمیشہ
دل منتشر و حواس مختل

سیدھا ہوا بارے مار کھا کر
نکلے ہی نہ تھا کبھی ترا بل

اے مصحفی ! اب سزا کو پہنچا
اس کوچے میں تو پھر آئیو کل

۲۹۵

دامن کے تئیں ذرا اٹھا چل
یعنی یہ ہے عاشقوں کا مقتل

ہے عشق وہ بحرِ بے سروبن
آخر ہے نہ جس کا کچھ نہ اول

کچھ اینٹھے ہی جاے ہے وہ ہم سے
اللہ رے تیری زلف کا بل

صندل کا درخت ہے ترا قد
اور ہاتھ ہیں جیسے شاخ صندل

کیا سرمے کی کچھ سیاہی کم تھی
آنکھوں میں دے آئے ہو جو کاجل

یہ حضرت مصحفی کا سر ہے
پاؤں کے تلے تو اس کو مت مل

۲۹۶

چپ ، بس بہت ہوئی تری فریاد مبتذل
اب آپ کو نہ کر دلِ ناشاد مبتذل

آیا نہ مرغ تازہ کبھی[1] تیرے دام تک
کھینچا ہے کوئی تونے تو صیاد مبتذل

آگے صفاے عارض و قد کے ترے میاں
ہے حسن و جلوۂ گل و شمشاد مبتذل

بیداد یہ بڑا ہے کہ پاؤں میں خلق کے
ہوتا ہے تیرا کشتۂ بیداد مبتذل

اے خوں نہ جوش کیجیو اس نوبہار میں
صد جا ہوا ہے نشترِ فصّاد مبتذل

ہو مرغ دل نہ طائر رنگ حنا کی طرح
ہاتھوں میں تیرے طفل پریزاد مبتذل

یاروں کی فکر تازہ کی عالم میں دھوم ہے
مضمون باندھتے نہیں استاد مبتذل

اور ہی ادا ہے تیغ لگانے میں یار کے
ہے وضع قتل کی تری جلاد مبتذل

پہنچے ہے کب وہ داد کو عاشق کی دوستاں
ہوتا نہ خوب شیوۂ بیداد مبتذل

---

۱ - کہیں ل ۱ - کوئی ل ۲ -

دنیا نہ جائے دید ہے موند آنکھیں مصحفی
پاتا ہوں میں بہت یہ غم آباد مبتذل

۲۹۷

آ کر ہماری خاک پہ اس نے چڑھائے گل
آخر کو جذب عشق نے یاں بھی کھلائے گل

گر یہ روش ہے تیری تو دامن کی جھونک سے
پامال ناز ہوویں گے سب تختہ ہائے گل

ہے دیدنی بہار جنوں کی مرے کہ میں
ٹکڑے جگر کے رکھے ہیں سر پر بجائے گل

آیا تھا رات بند کھلے کون باغ میں
جو آج چاک چاک ہے جیبِ قبائے گل

بھڑکے نہ کیوں کہ فصل بہار آتش جنوں
دامن جھٹکتی آتی ہے ہر دم ہوائے گل

خوبان ہفتہ دوست کے ملنے سے در گزر
آتی ہے اب کے رنگ میں بوے وفائے گل

ہم کو چمن میں جانے سے کیا ربط مصحفی
نے آشنائے بلبل و نے آشنائے گل

۲۹۸

گو نہ ہاتھ آئے ہمارے ترے رخسار کا پھل
ہم نے نظروں سے چنا گلشن دیدار کا پھل

بند کر لب کہ نتیجہ ہے دعا۔کا دشنام
دوستی چھوڑ کہ یاں دشمنی ہے پیار کا پھل

میوۂ خانۂ (؟) اس حسن ز بس شیریں سے
اس کے خواہندہ نہیں کھاتے ہیں بازار کا پھل

غیر از سیب زنخداں نہیں درکار مجھے
باغباں تجھ کو مبارک رہے گلزار کا پھل
گو کہ وہ تلخ تر از طعمِ سمِ قاتل ہو
کام عشاق میں میٹھا ہے غمِ یار کا پھل
دیکھتا تو ہے مری تب کو ولے یہ ڈر ہے
ہاتھ کہیں جاوے پھپھولوں میں نہ غمخوار کا پھل
مصحفی قبضے میں رکھوں گا میں اس ابرو کو
زور ہی ہاتھ لگا ہے مرے تلوار کا پھل

۲۹۹

کر دیا اس کی کمر نے ہم کو بیمار خیال
بیٹھے بیٹھے ہوگئے ہیں ہم گرفتار خیال
گر خیال اس کا کبھی آیا ہے اپنے خواب میں
خواب میں بھی ہم رہے ہیں ناز بردار خیال
یاد ایاسے کہ میں راتوں کو جب بیدار تھا
تھی مری آنکھوں کی پُتلی ، خال رخسار خیال
وہ برہمن زادہ ہووے کیوں کہ یار اپنا کہ ہے
باندھنا مشکل کمر سے اس کی زنار خیال
جس گھڑی رفتار کا تیری تصور بندھ گیا
پھر رہی آنکھوں ہی میں پھرتی وہ رفتار خیال
دیکھیے سودائے کاکل سے بچے گا کیوں کہ دل
بے طرح پیچھے پڑا ہے اس کے آزار خیال
اس کے آنے کا بھی اب وہ بے وفا مانع ہوا
ہم غنیمت جانتے تھے جس کا دیدار خیال

۲۵۰

ہو چکے وہ دن کہ وہ رشک قمر تھا روبرو
مصحفی اب میں ہوں تنہا اور شبِ تارِ خیال

۳۰۰

دھویا گیا تمام ہمارا غبارِ دل
گریے نے دل سے خوب نکالا بخار دل

اتنا نہیں کوئی کہ خبر اس کی آکے لے
کب سے بجھا پڑا ہے چراغِ مزار دل

دل جس گھڑی کہ ہونے لگے صدقے یار کے
اُس وقت اپنی جان ہی کیجے نثار دل

صبر و قرار کب کا ہمارا وہ لے گیا
سمجھے تھے جس کو مایۂ صبر و قرار دل

تیر و کماں کو لے کے وہ نکلا ہے ہاتھ میں
اس بت کو پھر ہوئی ہے ہوائے شکار دل

کہتے ہیں داغ عشق کسے ہم کو کیا خبر
یک قطرہ خون گرم تو ہے ہم کنار دل

ہونٹوں تک آتے آتے ہوئی وہ بھی سرد آہ
اک آہ سرد تھی جو مری غم گسار دل

مانند لالہ اس چمن دہر میں مرا
یہ داغ تازہ ہے سببِ افتخارِ دل

مجبور ہوں میں کیوں کہ کروں ضبط گریہ آہ
نے اختیارِ چشم ہے، نے اختیارِ دل

دل داغ غم سے جل کے ہوا خاک یا نصیب
لائی یہ رنگ تیرگیِ روزگارِ دل

آتا ہے جی میں پہلو میں دل کو چھپا رکھوں
یاں تک کہ وہ کیا ہی کرے انتظار دل
راز دل اپنا کس سے کہوں ہائے مصحفی
ملتا نہیں کوئی مجھے تو رازِدار دل

۳۰۱

یوں پڑا رہتا ہے اُس ابروے خم‌دار میں بل
جیسے ہوتا ہے پرانی کسی تلوار میں بل
پیچ پر پیچ ہی کھاتا ہے جو دیکھے ہے اسے
ہیں بڑے بس کہ پڑے پیٹی و دستار میں بل
لپٹی ہی جاتی ہے کچھ اس کے بدن سے کافر
اس برہمن بچے کے بس کہ ہے زنار میں بل
جو سہی سرو گلستانِ خوش اندامی ہیں
ہر قدم چلتے ہوئے کھاتے ہیں رفتار میں بل
دل الجھتا رہا تا صبح ہمارا شب کو
پڑ گیا اس کے جو پھولوں کے ذرا ہار میں بل
پیچ پگڑی کے تری رشک سے بل کھاتے ہیں
جب سے دیکھے ہیں ترے طرۂ طرار میں بل
اینٹھی ہی جاتی ہے کچھ زلف تری عاشق سے
تب تو پڑتا ہے میاں اس کے ہر اک تار میں بل
ہاتھ اے ہملہ نہ رکھ اس پہ کہ میں ڈرتا ہوں
پڑ نہ جاوے کہیں موے کمرِ یار میں بل
مصحفی ! جب کہ وہ مستانہ قدم رکھتا ہے
کیا غضب پڑتے ہیں اُس کیفی میخوار میں بل

ردیف م

۳۰۲

جب واقفِ راہ و روشِ ناز ہوے تم
عالم کے میاں خانہ بر انداز ہوے تم

نسبت تمھیں کیا تازہ نہالانِ چمن سے
اب نامِ خدا سروِ سرافراز ہوے تم

میں تم سے نہ بولوں گا کبھی اے لبِ تشنہ
اس بن بہ تبسم بھی اگر باز ہوے تم

وہ خاک مرقع ہوئی اے دیدۂ خوں بار
جس خاک کے صفحے پہ چمن ساز ہوے تم

مرغانِ چمن کرتے ہو کیوں ہرزہ درائی
کیا قہر ہوا کچھ جو خوش آواز ہوے تم

پہنے سے میاں جامۂ گل دوز کے بر میں
طاؤس صفت اور بھی طناز ہوئے تم

اے مصحفی! مرغان چمن رہ گئے خاموش
جب باغ میں جا زمزمہ پرداز ہوئے تم

۳۰۳

ہرچند ہے وہ نورِ نظر رو بروے چشم
تس پر بھی چین دیتی نہیں جستجوے چشم

تم اس میں اپنا پھول سا مکھڑا نہ دیکھیو
آتی ہے آئنے سے میاں مجھ کو بوے چشم

جب دیکھتا ہوں گل کو تو اس سو کمر بغیر
چبھتی ہے آنکھ میں رگِ گل مثلِ موے چشم

جھمکیں ہیں آب اشک میں گل برگِ لختِ دل
جوے چمن سے کم نہیں اپنی بھی جوے چشم
بن دیکھے روے خوب کے رہتے نہیں کبھی
کیا کیجیے یہی پڑی اپنی تو خوے چشم
پیارے جو سو طرح کا ادا فہم ناز ہو
سمجھے تو سمجھے وہ ہی تری گفتگوے چشم
یعنی کہ اس کی چشم کو دیکھا ہی کیجیے
ہے مصحفی مری تو یہی آرزوے چشم

۳۰۴

بے نام و نشاں بہت رہے ہم
پردے میں نہاں بہت رہے ہم
کچھ بات چلی تھی شمع رو کی
شب گریہ کناں بہت رہے ہم
اب جاتے ہیں اس جہاں کو، تم میں
اے اہل جہاں بہت رہے ہم
شب گھر سے وہ ماہ رو نہ نکلا
در پر نگراں بہت رہے ہم
اس بت کی کمر کبھو نہ دیکھی
چندے بہ گماں بہت رہے ہم
کیوں سوے عدم ابھی سے جاویں
دنیا میں کہاں بہت رہے ہم
تم جاؤ چلے کہ تم سے پیچھے
اے پیش رواں بہت رہے ہم

مژگاں کی صفوں میں کل مقابل
با تیر و سناں بہت رہے ہم
جاتا ہے اچٹ دل اپنا ووں ہی
ٹک جم کے جہاں رہے ہم
اب چلیے کہیں کو لکھنؤ سے
اے مصحفی ! یاں بہت رہے ہم

۳۰۵

ایک سے آنکھیں لڑا بیٹھے ہیں ہم
اِن دنوں پھر جی چلا بیٹھے ہیں ہم
جب بہار آئی ہے گل کے سامنے
کر گریباں چاک جا بیٹھے ہیں ہم
دیکھ کر آشفتہ اس کی زلف کو
ڈر کے مارے منہ چھپا بیٹھے ہیں ہم
بے حواسی سے شب اس کی بزم میں
حالِ دل اپنا سنا بیٹھے ہیں ہم
بن بلائے در پہ تیرے بارہا
جب ہوئی ہے صبح آ بیٹھے ہیں ہم
چھیڑ مت ہردم نہ آئینہ دکھا
اپنی صورت سے خفا بیٹھے ہیں ہم
دیکھ کر آنکھوں کو اس کی مصحفی
ان دنوں سرمہ سا کھا بیٹھے ہیں ہم

۳۰۶

جب تک کہ میں ہوں رہیو مرے روبروے چشم
مت مجھ سے منہ چھپائیو اے آرزوے چشم

دیکھا ہے جب سے رخنۂ دیوار کو ترے
رہتا ہے آفتاب کا اودھر ہی روے چشم
کب چھوٹتا ہے دامنِ مژگاں سے داغِ خوں
جب تک نہ موج گریہ کرے شست و شوے چشم
جانا میں تیرے رخنۂ دیوار سے کہ یار
تجھ کو بھی چین دیتی نہیں جستجوے چشم
سرخی سی اب تلک نظر آ جاے ہے مجھے
اے گریہ تو نے خوب نہ کی شست شوے چشم
یاں تک کیا میں گریہ کہ خوباں کے عشق میں
ساتھ آبرو کے اپنی گئی آبروے چشم
نرگس نہیں یہ تربت یوسف پہ **مصحفی**
تھا خوب روے خاک پر اس کی علوے چشم

۳۰۷

یوں چلتے ہیں لوگ راہ ظالم
کوئی چال ہے یہ بھی آہ ظالم

اوروں کی طرف تو دیکھتا ہے
ایدھر بھی تو کر نگاہ ظالم

ہے راست تو یہ کہ میں نہ دیکھا
تجھ سا کوئی کج کلاہ ظالم

کچھ رحم بھی ہے، تری جفا سے
اک خلق ہے داد خواہ ظالم

کس واسطے بولتا نہیں تو
کیا مجھ سے ہوا گناہ ظالم

اے مصحفی دل کہیں نہ دیجے
ہوتی ہے بری یہ چاہ ظالم

۳۰۸

ہے خطِ یار شب کو نیا لکھ رکھیں گے ہم
قاصد تو صبح آئیو، جا لکھ رکھیں گے ہم

مارے صفا کے دل میں ٹھہرتا نہیں وہ حسن
کاغذ اوپر یہ حسن و صفا لکھ رکھیں گے ہم

ہیں یادگارِ عالمِ فانی یہ دونوں چیز
اس کی جفا اور اپنی وفا لکھ رکھیں گے ہم

پر مبتذل ہوا ہے تو اے شوخ بعد ازیں
ہرجائیوں میں نام ترا لکھ رکھیں گے ہم

آتا نہیں سمجھ میں کہ کہتے ہیں کس کو عشق
اک پرزے پر یہ حرف جدا لکھ رکھیں گے ہم

عنابِ اشک سے تپِ دل دور ہو گئی
کتنی مفید ہے یہ دوا لکھ رکھیں گے ہم

کرتا نہیں اسے قلم انداز مصحفی
یہ ریختہ ہوا ہے نیا لکھ رکھیں گے ہم

۳۰۹

غنچے نے ترے لب سے لیا وام تبسم
اور آنکھوں سے سیکھا گلِ بادام تبسم

لاکھوں کو کیا صید تری جنبشِ لب نے
گلشن میں ہزاروں کا ہوا دام تبسم

زلفوں میں اچنبھا نہیں کچھ اس کی بنا گوش
یاں کرتی ہے نت صبح تہِ شام تبسم

گل رشک سے جلتے ہیں جو کرتا ہے چمن میں
چولی کے مسکنے میں وہ اندام تبسم

جس گھر میں ہو خورشید رخِ یار کا جلوہ
موجود ہے واں تا بہ لبِ بام تبسم

کون آج تری بزم میں آیا ہے جو ساقی
ہنستی ہے صراحی، کرے ہے جام تبسم

انداز نزاکت ہے جو اس غنچہ دہن کا
کیوں کر نہ رگِ گل پہ رکھے نام تبسم

اس زیرلب خندہ کے کشتوں میں ہوں جس کا
نزدیک ادا فہموں کے ہے نام تبسم

اے مصحفی میرے دلِ ناشاد کی خاطر
ایجاد کیا اس نے بہ دشنام تبسم

۳۱۰

سننے پائے نہ دہن اس کے سے دشنام تمام
جنبشِ لب ہی میں اپنا تو ہوا کام تمام

تو وہ گل ہے کہ گلستانِ جہاں میں پیارے
محو ہیں تیری ہی سج دھج کے گل اندام تمام

میں ہوں اس کفر کے صدقے کہ بہ ایں حسن سیاہ
لے گئی زلف تری رونقِ اسلام تمام

بے تکلف تری آنکھوں سے اسے کیا نسبت
کیوں کہ سوزن زدہ ہے دیدۂ بادام تمام

کوئی صیاد نہیں سوے چمن رو کرتا
اس برس ٹوٹے پڑے ہیں قفس و دام تمام

میں وہ گردن زدنی ہوں کہ تماشے کو مرے
شہر کے لوگ کھڑے ہیں بہ سرِ بام تمام

کہو ساقی سے کوئی جاوے جو میخانے میں
کہ دعا دیتے ہیں تجھ کو یہ مے آشام تمام

اتنا بے قدر تو ہوں میں کہ کسی نے ہرگز
اس کے منہ سے نہ سنا ہوگا مرا نام تمام

مصحفی اتنی سمّیت ہے کہاں کالے میں
زہر کی گانٹھ ہے وہ زلفِ سیہ فام تمام

۳۱۱

جوں شمع داغِ غم نے جلایا بدن تمام
نکلی نہ دل سے پر ہوسِ سوختن تمام

وہ مرغِ نیم بسملِ نازِ بتاں ہوں میں
رنگیں ہے جس کے خون سے صحنِ چمن تمام

ہیں کشتے اس کی تیغ کے کتنے پر اس طرح
لوہو میں شوربور ہے کس کا کفن تمام

مژگانِ چشمِ یار کی خنجر زنی نہ پوچھ
ہیں معرکے میں عشق کے وے صف شکن تمام

اس کے بدن سے حسن ٹپکتا نہیں تو پھر
لبریزِ آب و رنگ ہے کیوں پیرہن تمام

شیریں بہت چڑھی تھی سر اس کے سو آخرش
کھا آپ زخمِ تیشہ ہوا کوہ کن تمام

از بس کہ دل رکھے ہیں وہاں کتنے مار کر
لوہو سے بھر رہا ہے وہ چاہِ ذقن تمام

ہم کو قسم ہے یار کی لکنت کی **مصحفی**
گر اس کے منہ سے ہم نے سنا ہو سخن تمام

۳۱۲

ہوتا نہیں ہے یار کا جور و ستم تمام
اس مجھلے[1] میں کاش کہ ہو جاویں ہم تمام

کاغذ نہ آیا واں سے کبھی ہائے اے ندیم
خط لکھتے لکھتے گھس بھی گیا یاں قلم تمام

سودا نہ کیوں کہ کیجیے ابروے یار سے
تیغ ولایتی کی طرح ہے وہ خم تمام

اس بت کدے میں ہے کوئی تجھ سا بھی جلوہ گر
حیراں ہیں جس کی شکل کے نت یہ صنم تمام

سو بار تو نے وعدہ کیا اور نہ پھر ملا
تیری تو یار جھوٹی ہی نکلیں قسم تمام

واماندگاں کی رہ سے کبھی پھر بھی کر گزر
چشمِ پُر انتظار ہیں نقشِ قدم تمام

وہ شخص دل گداختہ ہوں میں کہ **مصحفی**
ٹپکے ہے گفتگو سے مری درد و غم تمام

۳۱۳

وہ دن گئے کہ ہم کو کبھی تھا ریا سے کام
کیا کیجیے کہ اب تو پڑا ہے خدا سے کام

---

۱ ۔ المجھلہ : سبب نادانی [صفحہ ۱۰۳ مصباح اللغات] ۔ مجھلا ۔ ہ ۔ اسم مذکر (پورب) بکھیڑا ۔ کسی معاملے کا دشوار ہو جانا ۔ جھمیلا [نوراللغات جلد ۴ ، ص ۲۹۹] ۔

پیدا کیا ہر ایک کو اک کام کے لیے
اُس کو جفا سے کام ہے ، ہم کو وفا سے کام
باد صبا سے پیش ہے واں اپنی رفتگی
تس پر بھی ہائے ہم کو ہے باد صبا سے کام
اتنا جو ہم سے رہتے ہو بےگانہ میری جان
شاید پڑا ہے تم کو کسی آشنا سے کام
ٹک ان بتوں کی چشم کی گردش تو دیکھیو
خانہ خراب کرتے ہیں کس کس ادا سے کام
خائف ہیں تند خوئی سے تیری جو اہل ہوش
تو دیکھ تو کہ لیتے ہیں کس التجا سے کام
اپنی مرادیں مانگنی ساری گئے ہیں بھول
شام و سحر ہے اب ہمیں تیری دعا سے کام
خالی کروں ہوں ریختہ کہہ دل کو **مصحفی**
تحسیں سے مدعا ہے ، نہ کچھ مرحبا سے کام

۳۱۴

یا تو گل دیتے تھے چن کر خویش و بیگانے کو ہم
یا ترستے ہیں قفس میں باغ تک جانے کو ہم
مے اگر پی ہم نے بن ساقی تو خونِ دل پیا
لائے گردش میں تو اپنے سر کے پیمانے کو ہم
یار دامن سے ترے کوئی[1] شعلہ بھڑکا چاہیے
جوں خس و خاشاک پھر آندھی ہیں جل جانے کو ہم

---

۱ - 'کوئی' بروزن فع ۔

اپنا سر رکھنا قدم پر تیرے یاد آتا ہے یار
دیکھتے ہیں جب کہ پائے شمع پروانے کو ہم

کچھ تو اے شیریں لبو ! انصاف بھی درکار ہے
بوسہ لینے کو رقیب اور گالیاں کھانے کو ہم

فوجِ طفلاں بر قفا اور اشکِ گلگوں در جلو
روز ہی اک شان سے جاتے ہیں ویرانے کو ہم

شمع آسا قصّہ سوز دل اپنا ہے دراز
صبح کر دیویں اگر چھیڑیں اس افسانے کو ہم

مصحفی[1] ہرگز کسی کی بات کو سنتا نہیں
کب تلک سمجھاویں یارب ایسے دیوانے کو ہم

۳۱۵

کیا کریں جا کے گلستاں میں ہم
ہیں بہ کنج قفس فغاں میں ہم

جانتے آپ سے جدا تجھ کو
کرتے گر فرق جسم و جاں میں ہم

ہیں تجلّیِ ذات کے تیری
ایک پردہ سا درمیاں میں ہم

گل کا یہ رنگ ہے تو اب اک دن
آگ رکھ دیں گے آشیاں میں ہم

واں تغافل نے اپنا کام کیا
یاں رہے مہر کے گماں میں ہم

---

۱ - دل کی نا فہمی سے اپنا جی تو اب گھبرا گیا : ل ۱ ، ۲ -

آسماں کو نشانہ کرتے ہیں
تیر رکھتے ہیں جب کماں میں ہم
مر کے نکلے قفس سے خوب ہوا
تنگ آئے تھے اس مکاں میں ہم
گر یہی آہ ہے تو دیکھو گے
رخنے کر دیں گے آسماں میں ہم
شاخِ گل کے گلے سے لگ لگ کر
روتے ہیں موسمِ خزاں میں ہم
باغ تک جاتے ہاں اگر پاتے
طاقت اس جسمِ ناتواں میں ہم
مصحفی عشق کر کے آخر کار
خوب رسوا ہوئے جہاں میں ہم

۳۱۶

کچھ اس قدر نہیں سفرِ ہستی و عدم
گر پاؤں اٹھائیے تو یہ عرصہ ہے دو قدم
شیخی تو دیکھ راہِ گلستاں کو لے گیا
ٹکڑے جگر کے رات میں دامن میں کر بہم
ملنے کا ہم سے تو نہیں اے آرزوے جاں
اک روز ہو چکیں گے اسی آرزو میں ہم
وہ آفتاب چہرہ کہیں ہو گیا تھا صبح
ہیں اس چمن میں سبزۂ مژگاں ہنوز نم
چھوٹے نہ دام زلف سے اس صید بند کے
سر کو پٹک پٹک کے موے طائرِ حرم

شبنم سے آنسوؤں کی مرے دیکھیو صفا
بلبل تجھے بہ‌پاکیِ دامانِ گل قسم
کب اعتدال قد کو ترے پہنچے ہے میاں
ہر چند سرو بھی ہے بہ‌خوش قامتی علم
کیوں کر نہ حرف اس کے بھلا پیچ دار ہوں
لکھتا ہے مصحفی صفتِ زلفِ خم بہ خم

۳۱۷

صیاد نے ہمیں نہ کیا صید، ہے ستم
آئے تھے شوق دام میں اڑ آشیاں سے ہم
کاغذ پہ میری چشم سے آنسو ٹپک پڑے
جب کر چکا میں نامہ بہ صد آرزو رقم
اگلی پڑے ہے اب تو تری تیغ خوش غلاف
آگے تُو اس قدر تو نہ تھا مائلِ ستم
کیا سر اٹھاویں اب کہ مہِ نو کو دیکھ کر
کھوکے میں تیغ ابرو کے مارے پڑے ہیں ہم
بے صرفہ کیجیو نہ گریباں کو میرے چاک
ناموسِ عشق کی ہے تجھے اے میاں قسم
نومید مصحفی سے نہ ہو یارو وقت نزع
تم نے سنا نہیں ہے کہ اک دم ہزار دم

۳۱۸

نقش نگیں ہے دل میں تو اپنے بتاں کا نام
گو یاد ہووے ان کو نہ مجھ خستہ جاں کا نام
ہوتا ہے دل شگفتہ کب اس بن، مرے حضور
آ کر کے لو ہزار کوئی گلستاں کا نام

بتلائیو کہ بھول گیا ہوں میں بوجھ کر
یارو کسی کو یاد ہے اس دل ستاں کا نام
عنقا کی طرح کوچے میں عزلت نشیں ہوں لیک
مشہور روزگار ہے مجھ بےنشاں کا نام
یاں خار و خس کے آتشِ گل ہے سراغ میں
مرغِ چمن تو لیجیو مت آشیاں کا نام
جانا تھا میں بہار ہے، کل باغباں سے
منھ زرد ہو گیا مرا سنتے خزاں کا نام
سر دے چکا نہ مصحفی اس بات پر میاں
مت لیجو ہر کسی سے کبھی امتحاں کا نام

۳۱۹

جب تک کہ تری گالیاں کھانے کے نہیں ہم
اُٹھ کر ترے دروازے سے جانے کے نہیں ہم
جتنا کہ یہ دنیا میں ہمیں خوار رکھے ہے
اتنے تو گنہگار زمانے کے نہیں ہم
ہو جاویں گے پامال، گزر جاویں گے جی سے
پر سر ترے قدموں سے اٹھانے کے نہیں ہم
آنے دو اسے جس کے لیے چاک کیا ہے
ناصح سے گریباں کو سلانے کے نہیں ہم
جب تک کہ نہ چھڑکے گا گلاب آپ وہ آکر
اس غش سے کبھی ہوش میں آنے کے نہیں ہم
جاویں گے صبا باغ میں گلگشتِ چمن کو
پر تیری طرح خاک اڑانے کے نہیں ہم

اے مصحفی خوش ہوگا نہیں ہم سے وہ، جب تک
سر کاٹ کے نذر اس کی بھجانے کے نہیں ہم

۳۲۰

سر اپنے کو تجھ پر فدا کر چکے ہم
حق آشنائی ادا کر چکے ہم

تو سمجھے نہ سمجھے ہمیں ساتھ تیرے
جو کرنی تھی اے بے وفا کر چکے ہم

خدا سے نہیں کام اب ہم کو یارو
کہ اک بت کو اپنا خدا کر چکے ہم

میں پوچھا مرا کام کس دن کرو گے
تو یوں منھ پھرا کر کہا ، کر چکے ہم

گھرس[1] لے تو اب ان کو چہرے میں اپنے
تماشائے زلف دو تا کر چکے ہم

تو جاوے نہ جاوے جو کرنی تھی ہم کو
سماجت تری اے صبا کر چکے ہم

نہ بولیں گے پیارے تری ہی سنیں گے
تو دشنام دے اب دعا کر چکے ہم

کبھو کام اپنا کسی سے نہ نکلا
بہت خلق کی التجا کر چکے ہم

لڑی مصحفی آنکھ جس سے کہ اپنی
پھر آخر اسے آشنا کر چکے ہم

---

۱ ۔ گھرسنا ۔ ھ ۔ گھسیڑنا ، کسی چیز میں اٹکا دینا ۔ [نوراللغات ، ج ۴ ، ص ۱۲۵]

۳۲۱

وہ چاندنی رات اور وہ ملاقات کا عالم
کیا لطف میں گزرا ہے غرض رات کا عالم

جاتا ہوں جو مجلس میں شب اس رشک پری کی
آتا ہے نظر مجھ کو طلسمات کا عالم

برسوں نہیں کرتا تو کبھی بات کسو[1] سے
مشتاق ہی رہتا ہے تری بات کا عالم

کر مجلس خوباں میں ذرا سیر کہ باہم
ہوتا ہے عجب ان کے اشارات کا عالم

دل ان کا نہ لوٹے کبھی پھولوں کی صفا پر
شبنم کو دکھا دوں جو تری گات کا عالم

ہم لوگ صفات اس کی بیاں کرتے ہیں ورنہ
ہے وہم و خرد سے بھی پرے ذات کا عالم

وہ کالی گھٹا اور وہ بجلی کا چمکنا
وہ مینہ کی بوچھاریں وہ برسات کا عالم

دیکھا جو شب ہجر تو رویا میں کہ اس وقت
یاد آیا شبِ وصل کی اوقات کا عالم

ہم **مصحفی** قانع ہیں بہ خشک و تر گیتی
ہے اپنے تو نزدیک مساوات کا عالم

۳۲۲

کیا وصل کی شب کا میں کہوں رات کا عالم
وہ رات تھی یارب کہ طلسمات کا عالم

---

۱ - کسی : ل ۱ ، ۲ -

ہر چند کہ سیمیں بدناں خوب ہیں سارے
پر سب سے جدا ہے یہ تری گات کا عالم

اوقات بسر خونِ جگر کھا کے کروں ہوں
عالم سے جدا ہے مری اوقات کا عالم

کیا کام ہے دل پھیرنا اس رشک پری کا
تسخیر میں یاں اپنی ہے جنات کا عالم

اے مصحفی چل تو بھی قطب[1] کو کہ کہیں ہیں
آتا ہے بہت چھڑیوں میں میوات کا عالم

ردیف ن

۳۲۳

ایک عالم میں کیا تُو در بدر میرے تئیں
بیش ازیں اے عشق اب رسوا نہ کر میرے تئیں

دن میں سو سو بار جانا اس کے گھر میرے تئیں
نت وطن ہی میں رہے ہے اب سفر میرے تئیں

دل گیا اس کی گلی میں ، ظلم مجھ پر کر گیا
اپنے جانے کی نہ کی اس نے خبر میرے تئیں

روبرو غیروں کے آنا ، یہ کوئی انصاف ہے
منھ کو پردے میں چھپانا دیکھ کر میرے تئیں

وائے بے صبری کہ رک کر جب کبھی روتا ہوں میں
ہچکیاں لگ جاتی ہیں دو دو پہر میرے تئیں

چپ ہی رہنے دو مجھے پوچھو نہ کوئی میری بات
کیوں کہ رونا آئے ہے ہر بات پر میرے تئیں

---

۱ - مراد مزار بختیار کاکی المعروف قطب صاحب واقع مہرولی دہلی -

بعد مدت کے لگی ہے صبح ہوتے میری آنکھ
چھیڑ مت سونے دے اے بادِ سحر میرے تئیں
رہ سکا ہرگز نہ دل بن دیکھے اس کے مصحفی
شوق نے آخر بنایا نامہ بر میرے تئیں

۳۲۴

بوے گل لائی ہے آخر شور پر میرے تئیں
صبح گلشن میں نہ کرنا تھا گزر میرے تئیں
چندے اک آسودگی سے کیا ہی لگ جاتی تھی آنکھ
اب لگی دکھ دینے پھر باد سحر میرے تئیں
ہاے[1] کوئی[2] پیچھے یہ میرا دشمن جانی نہ ہو
اپنے سایے سے بھی اب لگتا ہے ڈر میرے تئیں
کرکے مجھ سے اختلاط آخر کو پچھتائے ہی تم
آپ نے عاشق نہ جانا تھا مگر میرے تئیں
خوبیِ قسمت تو دیکھو ہوگیا ان سے بھی بیر
عمر جن لوگوں میں کرنی ہے بسر میرے تئیں
مجھ کو ہے صیاد سے شکوہ کہ اس بے درد نے
موسم گل میں کیا بے بال و پر میرے تئیں
سرمہ آسا خاک میں اے مصحفی میں مل گیا
کھا گئی کیا جانیے کس کی نظر میرے تئیں

۳۲۵

از بس کہ نہیں قرار جی میں
سو گزریں ہیں باتیں یار جی میں

---

۱ - شب : پ
۲ - بروزن فع

خط ہو کے ندان منھ پر آیا
تھا اس کے جو کچھ غبار جی میں
جوں ناوک غمزہ اس نے پھینکا
لگتے ہی ہوا دوسار جی میں
بے ہے کہ بھرے ہیں سو ملولے[1]
اس میرے امیدوار جی میں
میں دیکھ کے تجھ کو رو دیا جب
کچھ تیرے بھی آیا پیار جی میں
سن ایک ہی سخن کدھر چلا تو
باتیں ہیں ابھی ہزار جی میں
سوزن سے کوئی نکالے کیوں کر
مژگاں کے چبھے ہیں خار جی میں
اک بار تری گلی میں آؤں
آتا ہے یہ بار بار جی میں
میں تجھ سے کہی سب اپنے دل کی
اب تو بھی نہ رکھیو یار جی میں
اے مصحفی درد کا ادب کر
اچھے ہے جو کچھ سو مار جی میں

٣٢٦

کوئی مے بند کرے ، کوئی پری شیشے میں
مخترع ہم ہیں کہ آتش ہے بھری شیشے میں

---

۱ - ملولا (ہ) عو ، مذکر - ملال ، حسرت ، پچھتاوا ، ارمان -
[نوراللغات ، جلد ۴ ، ص ۴۵۸]

سبز جامے میں ترا لطفِ بدن گر دیکھے
دخترِ رز نہ کرے جلوہ گری شیشے میں
لختِ دل پھرتے ہیں یا ڈالی گئی ہے لا کر
برگِ گل آج نسیم سحری شیشے میں
اس نے مانگی تھی مے سرخ ولیکن میں نے
بھر دیا بھول کے خونِ جگری شیشے میں
ٹکڑے ٹکڑے جو تڑق کر یہ ہوا ، تھی ساقی
بند کس[1] کی ہوسِ جامہ دری شیشے میں
موم ہو جائے وہیں دیکھے اگر پتھر بھی
دخترِ رز کی یہ جادو نظری شیشے میں
خم کے خم ہو گئے خالی مرے مے پینے سے
نہ نمی جام میں اب ہے نہ تری شیشے میں
مصحفی آج تو ساقی کی خوشامد ہے ضرور
بھر کے لایا ہے مئے بے خبری شیشے میں

۳۲۷

اور اگر پھول و پان[2] دیتے ہیں
ہم تمھیں اپنا جان دیتے ہیں
ایک شب رہ ہمارے پاس اے بت
ہم خدا درمیان دیتے ہیں
جان لینے میں اضطراب ہے کیا
لیجیے مہربان ، دیتے ہیں

---

۱ - کب کی : ل ۲ -
۲ - ''پھول و پان'' میں واو عاطفہ سہو کاتب معلوم ہوتا ہے - بغیر حرف عطف ''پھول ، پان'' درست ہے - (فائق)

ہم نے چاہا بہت کہ بیٹھیں ولے
بیٹھنے آسماں دیتے ہیں
وے ہمیں ہیں کہ دست دشمن میں
اپنا تیر و کماں دیتے ہیں

ق

ہم تو بیرون باغ ہی کب کے
مصحفی اپنا[۱] جاں دیتے ہیں
بخت اس کے کہ جس کو گلشن میں
جائے یک آشیاں دیتے ہیں

۳۲۸

پردہ اٹھا کے مہر کو رخ کی جھلک دکھا کہ یوں
باغ میں جا کے سرو کو قد کی لچک دکھا کہ یوں
آتش گل چمن کے بیچ جب ہمہ سو ہو شعلہ زن
اپنے لباس سرخ کی اس کو بھڑک دکھا کہ یوں
جو کوئی پوچھے جان من شوخی و جلوہ کس طرح
لمعۂ برق کی طرح ایک جھمک دکھا کہ یوں
شیشے کے بیچ دخت رز کرتی ہے شوخ چشمیاں
تو بھی ٹک اپنی چشم کی اس کو بھڑک دکھا کہ یوں
نظریں ملا دے گر کوئی تجھ سے کبھی تو جان من
اس کے تئیں تو دور سے آنکھیں تنک دکھا کہ یوں
کبک و تدرو گر کریں آگے ترے خرام ناز
اپنے خرام ناز کی ان کو لٹک دکھا کہ یوں

---

۱ - اپنی : ل ۱ ، ۲ -

راتوں کا تیرے جاگنا گر کوئی پوچھے **مصحفی**
چشم ستارہ باز ہیں ، اس کو فلک دکھا کہ یوں

۳۲۹

اور سب تم سے ورے بیٹھے ہیں
ایک ہم ہیں کہ پرے بیٹھے ہیں

پھٹ چکا جب سے گریباں ، تب سے
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

شیشۂ مے کی طرح اے ساقی
چھیڑ مت ہم کو، بھرے بیٹھے ہیں

قتل کا کس کے ارادہ ہے جو آپ
ہاتھ قبضے پہ دھرے بیٹھے ہیں

مصحفی یار کے گھر کے آگے
ہم سے کتنے نگھرے بیٹھے ہیں

۳۳۰

دنیا میں تیری شکل کا ہووے سو کوئی[1] انساں کہاں
یہ چشم کی گردش کدھر ، یہ شوخیِ مژگاں کہاں

دل جو تماشا دوست تھا پاتا نہیں اس کی خبر
کیا جانے ہو کر رہ گیا وہ غم زدہ حیراں کہاں

دیکھ اس کو جوں ہی غش کیا یہ بھی نہ جانا ہم نے پھر
ساقی کجا ، مے کس طرف ، مجلس کدھر ، جاناں کہاں

بیمار تیرے عشق کا چنگا ہو پیارے کس طرح
یہ تو مرض ہے لا دوا ، اس درد کا درماں کہاں

---

۱ - بروزن فع -

عیش و طرب یک سو ہوا غم آ کے ہم‌پہلو ہوا
منہ بند کر بیٹھے ہیں ہم اب وے لب خنداں کہاں
رنگینیِ عشق اور ہی رکھتی ہے آب و تاب کچھ
رونا مسلم ابر کا، پر چشم خوں افشاں کہاں
اس دم کہ[1] ساقی وقفہ ہے دے لے تو کوئی جام مے
کیا جانے لے جاوے مجھے، پھر گردش دوراں کہاں
شمشیر ابرو کی ترے کرتے خریداری ولے
سودا زدوں کو ہم سے اب سر ہے تو پھر ساماں کہاں
گلیوں کے اندر دھوم ہے میرے جنوں کی ہر طرف
اس عشق شہر آشوب کو اب کیجیے پنہاں کہاں
میری طرح جامے میں تم ہرگز نہ ٹھہرو اک گھڑی
دیکھا ہے لیک اے دوستو! تم نے اسے عریاں کہاں
یہ تو گماں ہرگز نہ تھا تیری خرد پر **مصحفی**
دل تو نے اب جا کے دیا افسوس اے ناداں کہاں

۳۳۱

ایک دو گالیاں اس شوخ کی کھا رہتے ہیں
اپنا جو روز[2] مقرر ہے سو پا رہتے ہیں
مثل خورشید ترے کو سے ہم اے غیرت‌ماہ
شام کو جاویں تو پھر صبح کو آ رہتے ہیں
رہنے والوں نے ترے کوچے کے کیا دیکھا ہے
مجھ سے کس واسطے وے آنکھ ملا رہتے ہیں

---

۱ - تو، ل ۲ -
۲ - روز (ف) روزینہ -

بس کہ وہ طفل کچھ ان روزوں میں کھل کھیلا ہے
بند جامے کے بھی گر دیکھو تو وا رہتے ہیں
دن کے ہوتے تو کہاں بار ہمیں اس کو میں
پر کبھی چوری چھپے رات کو جا رہتے ہیں
نہیں معلوم کہ کیا ہم سے ہوئی ہے تقصیر
آپ کچھ اب تو نہایت ہی خفا رہتے ہیں
مجھ کو یہ سوچ ہے، جیتے ہیں وے کیوں کر یارب
اپنے معشوقوں سے جو شخص جدا رہتے ہیں
جی، رہو یا نہ رہو اس کی گلی میں جانا
مصحفی ہم کوئی ان باتوں سے کیا رہتے ہیں

۳۳۲

آنسوؤں سے بس کہ یاں رہتا ہے کارِ آستیں
سلکِ گوہر ہو گیا ہے تار تارِ آستیں
دیکھتا ہے جب اسے اس دیدۂ خوں بار پر
حلق بسمل ہو نہیں سکتا دوچارِ آستیں
جس طرح ہوں شاخ گل پر غنچۂ گل خوش نما
اس کے ساعد پر ہے تکموں سے بہارِ آستیں
روتے روتے جا رہے ہم حلقۂ گرداب میں
اک ذرا یوں ہی کیا تھا کل فشارِ آستیں
دیکھ کر طوفاں کو میرے اشک کے اے **مصحفی**
ابرِ دریا بار ہوتا ہے نثار آستیں

۳۳۳

ابرو سے کہہ میاں نہ کرے تیغ رانیاں
منہ موڑ دیں گی ورنہ مری سخت جانیاں

عشق بتاں میں کس کے کہوں کیا کیا حصول
تھیں میرے تئیں خدا کو یہ شکلیں دکھانیاں

ہم لطفِ سیرِ باغ کو کیا جانیں ہم صفیر
ہم نے تو کیں قفس میں سدا پرفشانیاں

نظارہ دوست ہے یہ دل اتنا کہ نت اسے
وہی[1] دیدہ بازیاں ، وہی آنکھیں لڑانیاں

پاؤں میں خار، چشم میں نم، دل پہ داغ غم
رکھتا ہوں تیرے عشق کی کتنی نشانیاں

اے مصحفی ! تو عشق میں رسوا بھی ہو چکا
پر بے حیا ! گئیں نہ تری شعر خوانیاں

۳۳۴

جس طرح سب جہان میں کچھ ہیں
ہم بھی اپنے مکان میں کچھ ہیں

لخت دل کچھ گرے ہیں دامن میں
مژۂ خوں فشان میں کچھ ہیں

یہ جو بسمل پڑا تڑپتا ہے
حسرتیں اس کی جان میں کچھ ہیں

ہے زمیں فتنہ گر ابھی شاید
گردشیں آسمان میں کچھ ہیں

کم نہ جانو انھیں یہ طفلِ سرشک
دیکھو گے ایک آن میں کچھ ہیں

تم جو نت امتحاں کرو ہو مرا
خوبیاں امتحان میں کچھ ہیں

---

۱ - بروزن فع -

مصحفی دے تو داغِ دل کی خبر
پھول اس گلستان میں کچھ ہیں

۳۳۵

ہم سے کیا کرو نہ میاں تم ٹھٹھولیاں
سنتے بھی ہو جو بولتے ہیں لوگ بولیاں

ہم اس تمام ناز کے کشتوں میں ہیں کہ ہائے
مر مر گئی ہیں جس کی اداؤں پہ بولیاں

ٹک کسمسائے ہوتی ہیں سو سو جگہ سے چاک
ان خوش چھبوں کی ہائے رے یہ تنگ چولیاں

ہم دل یہ کف نہادہ تبھی اس کے گرد تھے
وہ جن دنوں کہ کھیلے تھا لڑکوں میں گولیاں

اک ہم ہی خالی ہاتھ چلے اس چمن سے ہائے
گل چیں تو پھول لے گئے بھر بھر کے جھولیاں

اس غش کے بیچ **مصحفی** ٹھنڈا ہی ہو گیا
اس نے تو اپنی آنکھیں بھی ہے ہے نہ کھولیاں

۳۳۶

حیراں ہوں اپنے کام کی تدبیر کیا کروں
جاتی رہی ہے آہ سے تاثیر، کیا کروں

شورِ جنوں ہوا ہے گلوگیر کیا کروں
ہے[۱] ٹوٹی جاتی پاؤں کی زنجیر کیا کروں

ناگفتنی ہے حالِ دلِ ناتواں مرا
آتی ہے شرم میں اسے تقریر کیا کروں

---

۱ - ٹوٹی ہی جا ہے : ل ۲ -

دل مانگتا ہے مجھ سے ، مجھے بھی دیے بنی
اتنی سی چیز پر اسے دل‌گیر کیا کروں

دیکھا جو مجھ کو نزع میں ، قاتل نے یوں کہا
اس جاں بہ لب پہ کھینچ کے شمشیر کیا کروں

بن دیکھے اس کے دل کو تسلی نہیں مرے
نقاش اس کی لے کے میں تصویر کیا کروں

اے یار درد دل کی مرے بات ہے کڈھب
مت[1] پوچھو تم سے اس کی میں تقریر کیا کروں

پوچھا میں مصحفی سے ہوا کیوں تو در بہ در
بولا کہ یوں ہی تھی مری تقدیر کیا کروں

۳۳۷

اب تک کی سہے تری جفا کون
تجھ ساتھ کرے میاں وفا کون

تو شوق سے گالیاں دے ہم کو
ان باتوں کا مانے ہے برا کون

یہ عقدۂ دل ہے سخت عقدہ
دیکھیں تو کرے ہے اس کو وا کون

سو بار گیا میں اس کے در پر
پوچھا نہ کسی نے یہ بھی تھا کون

کس واسطے پھر کے تیغ باندھی
جیتا ہوا اب بھلا رہا کون

جی جائے تو ہے چلا ، ولیکن
معلوم نہیں کہ لے چلا کون

---

۱ - مت پوچھ تیرے رو برو تقریر کیا کروں : ل ۲ -

ہم بہہ کے چلے ہیں بحر غم میں
اب ہاتھ پکڑ رکھے تھا[1] کون

ہر چند سب آشنا ہیں لیکن
اس وقت میں اپنا آشنا کون

ہے مصحفی اور بزم خوباں
اس بزم میں اس کو لے گیا کون

۳۳۸

کیا کہیے کہ کیا ہے یہ دلِ زار بغل میں
اک حق نے دیا ہے ہمیں آزار بغل میں

آتا ہے یہی دل میں جو ملتا ہے وہ تنہا
لے بھاگیے کافر کو کہیں مار بغل میں

تسبیح پہ دیں داروں کی مت بھول کہ یہ لوگ
خرقے کے تلے رکھتے ہیں زنّار بغل میں

سامان مرے قتل کا کچھ کم نہیں اس پاس
خنجر جو کمر میں ہے تو تلوار بغل میں

میں حسرت آغوش میں مر مر ہی گیا ہائے
اک رات بھی آیا نہ مری یار بغل میں

اے مصحفی! مت آپ سے اس دل کو جدا کر
شیشے کے تئیں رکھتے ہیں مےخوار بغل میں

۳۳۹

عاشق ہو مصحفی بھی گر اس کا عجب نہیں
آتا ہے دوڑ دوڑ جو یہ بے سبب نہیں

---

۱ - بٹھا : ل ۲ -

۲۷۹

ہر دم پکارتے ہو کنایے سے کیا میاں
جاؤ جی بیٹھو 'او بے' ہمارا لقب نہیں

کیا تجھ سے شوخ چشم سے آنکھیں ملائیے
آنکھوں میں تیری شرم نہیں ، کچھ ادب نہیں

جوں ہی کسی نے بات کہی ہم نے رو دیا
وہ حوصلہ کہ تھا ہمیں آگے ، سو اب نہیں

کیا بیٹھے منھ میں پانی چواتے ہو دوستو
دیکھو گے ایک دم میں کہ یہ جاں بہ لب نہیں

پڑھتے ہیں تیرے واسطے ہم اسم یاعزیز
اے دوست ! سیم و زر کی ہمیں کچھ طلب نہیں

اک بات پر ہی اس سے تسلی کروں میں دل
پر کیا کروں کہ بات بھی کہنے کا ڈھب نہیں

شب قدر و شب برات سے کیا ہم کو فائدہ
دنیا کے بیچ وصل ہی کی جب کہ شب نہیں

بن حکم کیوں کہ بزم میں اس کی قدم رکھوں
عاشق تو ہوں میں **مصحفی** پر بے ادب نہیں

۲۸۰

آتا ہے کس کو پیارے راتوں کو خواب تجھ بن
وہی[1] نت کی آہ و زاری وہی اضطراب تجھ بن

کیوں کر پیوں میں پیارے جام شراب تجھ بن
ہر قطرہ سے گلو میں ہے زہرناب تجھ بن

اے میری جان سچ کہہ کیدھر تو چھپ رہا ہے
سر پیٹتے پھریں ہیں یاں شیخ و شاب تجھ بن

---

۱ - بروزن فع -

پڑھنے کا حرف کیا ہے ، از بہر فال کھولی
کھولی کبھی جو ہم نے پیارے کتاب تجھ بن
گہہ سینہ کوٹتا ہوں ، گہہ سر کو پھوڑتا[1] ہوں
یاں سو خرابیاں ہیں خانہ خراب تجھ بن
یا رب وہ قطرہ مجھ کو الماس ہو کے لگیو
گر میں کبھی پیا ہو یک قطرہ آب تجھ بن
کب مصحفی کو پیارے جینا بھلا لگے ہے
جو دم ہے زندگی کا سو ہے عذاب تجھ بن

۳۲۱

نہ تنہا ہم ہی مثل گل گریباں چاک رہتے ہیں
جو تیرے ملنے والے ہیں سبھی غم ناک رہتے ہیں
ہر اک دورے میں حسن و عشق کا ہنگامہ برپا ہے
تکلف بر طرف گردش سے کب افلاک رہتے ہیں
اگر جامہ نہیں تو خاک ہی پنڈے کو مل بیٹھے
کوئی آزادہ تن وابستۂ پوشاک رہتے ہیں
ز بس ہم کو نہایت شوق ہے امرد پرستی کا
جہاں جاویں وہاں اک آدھ کو ہم تاک رہتے ہیں
گلی کوچوں میں پی پی مے انھیں بدمستیاں کرنی
کوئی بدمستیوں سے مردم بے باک رہتے ہیں
ہزار آلودہ دامن ہوں نہیں ڈر ان کو محشر کا
جنھوں کے دست و دل ریو[2] و ریا سے پاک رہتے ہیں

---

۱ - پیٹتا ہوں : ل ۲ -
۲ - ریو : مکر ، حیلہ -

پڑا ہے شیخ صاحب کو مزہ لکڑی چبانے کا
کوئی یہ منہ میں اپنے بن کیے مسواک رہتے ہیں
کسی کو وہ نہاں گل رو تو کیا بو بھی نہیں دیتا
ہزاروں دیر و مسجد میں رگڑتے ناک رہتے ہیں
جوابِ نامہ کب لکھتا ہے وہ اے **مصحفی** ہم کو
عبث خط بھیج کر ہم منتظر بر ڈاک رہتے ہیں

۳۴۲

آتشِ غم میں بس کہ جلتے ہیں
شمع ساں استخواں پگھلتے ہیں
وہ ہی دست اور وہی گریباں چاک
جب تلک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں
دیکھ تیرے صفائے صورت کو
آئنے منہ سے خاک ملتے ہیں
جوششِ اشک ہے وہ آنکھوں میں
جیسے اس سے کوئیں آبلتے ہیں
دیکھ عارض کو تیرے گلشن میں
سینکڑوں رنگ گل بدلتے ہیں
شوخ چشمی بتاں کی مجھ سے نہ پوچھ
کہ یہ نظروں میں دل کو چھلتے[1] ہیں
دیکھیو شیخ جی کی چال کو ٹک
اب کوئی دم میں یہ پھسلتے ہیں

---

۱ - چھلنا : دھوکے سے لے لینا ، فریب دینا ، جل دینا ۔

بن لیے کام دل کا اس کسُو سے
مصحفی ہم کوئی نکلتے ہیں

۳۴۳

دن کو تو سن لو میری میں کچھ بات اگر کہوں
ہاں اس کا ڈر نہیں ، نہ سنو رات اگر کہوں

ہر بیت میں کنایہ ہے ، ہر شعر میں ادا
پھر دور کیا ہے درس "اشارات"[1] اگر کہوں

چپ ہی بھلی ہے ، فائدہ کیا ہے ، سنے ہے کون
میں اپنے دردِ دل کی حکایات اگر کہوں

کہتا ہے ہوکے چیں بہ جبیں چل بے دور ہو
میں اس سے گاہے بھر ملاقات اگر کہوں

آنکھیں جھکی ہی رہتی ہیں ، کچھ ان کو مصحفی
برجا ہے ابرِ موسمِ برسات اگر کہوں

۳۴۴

عاشق کو ترے چاہیے کیا ہار گلے میں
بانہوں کے تئیں ڈال دے اے یار گلے میں

اللہ رے نزاکت کبھی کھاتا ہے اگر پان
ہوتی ہے وہیں پیک نمودار گلے میں

یہ تو کہو کس کے ہو میاں خون کے پیاسے
جو ڈالے ہوئے پھرتے ہو تلوار گلے میں

لازم ہے کہ مقتل کی طرف تب مجھے لے جائیں
جب طوق ہو مانند گنہگار گلے میں

---

۱ - شرح "اشارات" از ابن سینا ۔

ہے دل میں کروں یار کے کوچے میں گدائی
سیلے[1] کے تئیں ڈال کے اک بار گلے میں

جب زور سے زاہد کے میں اک دھول لگائی
سر پر سے اتر آ رہی دستار گلے میں

اے **مصحفی**! کیا مجھ کو کہیں اہل مذاہب
تسبیح گلے میں ہے، نہ زنار گلے میں

۳۴۵

کیجیے ظلم سزاوارِ جفا ہم ہی ہیں
کھینچیے تیغ کہ مدت سے فدا ہم ہی ہیں

تفتہ دل، سوختہ جاں، چاک جگر، خاک بہ سر
کیا کہیں مصدرِ صدگونہ بلا ہم ہی ہیں

نہیں موقوف دعا اپنی تو کچھ بعدِ نماز
بیٹھتے اٹھتے جو مانگیں ہیں دعا، ہم ہی ہیں

یہ بھی کوئی[2] طور ہے ٹک جلوہ دکھا چھپ جانا
اور بھی لوگ ہیں، ترسانے کو کیا ہم ہی ہیں

وہ جو کہلاتے تھے زیں پیش ترے یاروں میں
جانِ من اب تو ہمیں بھول گیا ہم ہی ہیں

نہ برہمن کی مشیخت ہے نہ رہبان کی قدر
اب تو اس میکدے میں نامِ خدا ہم ہی ہم

عشوہ و ناز ترا ہم سے یہی کہتا ہے
نہیں کرتے جو کبھی تیر خطا ہم ہی ہیں

---

۱ - سیلا : پگڑی -
۲ - بروزن فع -

بے نواؤں کی طرح آکے ترے کوچے میں
وہ جو کر جاتے ہیں اک روز صدا ہم ہی ہیں
آدھی رات آئے ترے پاس یہ کس کا ہے جگر
چونک مت اتنا کہ اے ہوش ربا ہم ہی ہیں
مصحفی ٹل گئے سب معرکۂ عشق کے بیچ
وہ جو ٹھہرے رہے ہیں ایک ذرا ہم ہی ہیں

۳۴۶

آتا ہے یہی جی میں فریاد کروں روؤں
رونے ہی سے ٹک اپنا دل شاد کروں روؤں
کس واسطے بیٹھا ہے چپ اتنا تو اے ہم دم
کیا میں ہی کوئی نوحہ بنیاد کروں روؤں
یوں دل میں گزرتا ہے، جا کر کسی صحرا میں
خاطر کو ٹک اک غم سے آزاد کروں روؤں
اس واسطے فرقت میں جیتا مجھے رکھا ہے
یعنی میں تری صورت جب یاد کروں روؤں
اے مصحفی! آتا ہے یہ دل میں کہ اب میں بھی
رونے میں تجھے اپنا استاد کروں روؤں

۳۴۷

اب میرے تیرے اور ہے کیا یار درمیاں
الّا کہ قصرِ تن کی ہے دیوار درمیاں
تھا دل میں آئنے کے تئیں توڑ ڈالیے
اتنے میں آ گیا رخِ دل دار درمیاں
زلفوں سے اس کی ہم نے جو سودا کیا کبھی
دو دو پہر تلک رہی تکرار درمیاں

۲۸۵

مر جاوے گر رقیب تو جاوے خلش تمام
اس گل کے میرے ہے یہی اک خار درمیاں

حلقوں کو تیری زلف کے اُس وقت دیکھیے
جس وقت ہو وہ چاند سا رخسار درمیاں

کل اس کی میری نظروں میں تلوار چل گئی
مارا گیا سو مفت دلِ زار درمیاں

ہم روزِ عیش دیکھ چکے صبح حشر بھی
یوں ہی رہا جو وعدۂ دیدار درمیاں

کیا اس کی چشم مست کی دیتا نہ کچھ[1] بھی داد
ہوتا جو کوئی مردمِ ہشیار درمیاں

بگڑا ہی تھا وہ مجھ سے ولے خیر یہ ہوئی
اہل محلہ آ گئے دو چار درمیاں

کب وہ جواب نامے کا بھیجے گا **مصحفی**
قاصد کو کیوں کرے ہے عبث خوار درمیاں

۳۴۸

از بس کہ چشمِ تر نے بہاریں نکالیاں
مژگاں ہیں اشکِ سرخ سے پھولوں کی ڈالیاں

کیا جانے ہے وہ طرۂ مقطوع کس کے ہاتھ
آنکھوں میں کاٹتا ہوں میں نت راتیں کالیاں

خط آئے پر بھی یار کا بدلا نہیں مزاج
وہ ہی ادا و ناز ہے ویسی ہی گالیاں

صیاد چاہتا ہے جو بلبل کی زندگی
کنجِ قفس میں رکھ تو گلوں کی پیالیاں

---

۱ - دیتا نہ کوئی داد ، ل ۲ -

کیا اعتماد یاں کے دلا عزل و نصب کا
ایدھر تغیریاں تو اُدھر ہیں بحالیاں

آنکھوں کا جوشِ اشک سے اب یاں وہ حال ہے
جیسے کہ سیمِ خام سے پُر ہوں کٹھالیاں

میرا یہ طفل دل تبھی حلقہ بہ گوش تھا
اے شوخ! جن دنوں تری زلفیں تھیں بالیاں

امرد پرست جان نہ کیوں دیں کہ **مصحفی**
دل مرد ہو کے لیتی ہیں یہ چہرے والیاں

۳۴۹

اپنی تو ہجر ہی میں کٹیں راتیں کالیاں
بانہیں گلے میں یار نے کب آکے ڈالیاں

اس کی کمر تو کاہے کو پتلی ہے اس قدر
یہ ہم سے شاعروں کی ہیں نازک خیالیاں

اودھر سے شوق دید ہے اتنا کہ ہر طرف
دیواروں میں ہیں رخنے تو غرفوں میں جالیاں

لوہو بھرا ہے ہاتھ حنائی نہ بوجیو
از بس کہ اس نے کتنوں کی جانیں نکالیاں

کرتی ہیں خون سینکڑوں تجھ کو بتاؤں کون
پاؤں کی سرخیاں ترے ہونٹوں کی لالیاں

کل کر رہا تھا غیر سے نظروں میں گفتگو
پر دیکھتے ہی کچھ مرے آنکھیں چرالیاں

اے **مصحفی**! تو ان سے محبت نہ کیجیو
ظالم غضب ہی ہوتی ہیں یہ دلی والیاں

۳۵۰

اوروں کی دیدہ بازیاں نظروں میں ٹالیاں
دیکھا جو ہم نے اس کو تو آنکھیں نکالیاں

میرے جنوں کے خوف سے ہر صبح باغ میں
جوں شاخ بید کانپیں ہیں پھولوں کی ڈالیاں

دیوانہ کون رقص کرے ہے جو ہر طرف
لڑکے بجاتے پھرتے ہیں گلیوں میں تالیاں

طوطی شکر شکن ہے لب یار کچھ تو بول
کیدھر گئیں وہ اب تری شیریں مقالیاں

معشوق تنگ چشم ملا ہم کو ہم نشیں
باور نہیں تو دیکھ لے برقعے کی جالیاں

دل میں خیال زلف سے طوفاں نہ کیوں کہ ہوں
اکثر گھٹائیں اٹھتی ہیں ایدھر سے کالیاں

کرتی ہیں خون سیکڑوں عاشق کے مصحفی
جس وقت پان کھاتی ہیں یہ چونے والیاں

۳۵۱

کچھ ہماری بھی تمھیں فکر ہے اب یا کہ نہیں
جوں ہی یہ بات کہی اس سے تو بولا کہ نہیں

اپنا سا ہم نے تو اس دل کو بہت سمجھایا
اس کی خاطر میں بھی کیا جانے کچھ آیا کہ نہیں

وائے قسمت کہ جو کی وصل کی گا ہے درخواست
در جواب اس نے یہی نامے میں لکھا کہ نہیں

دسترس ہی جو نہ ہو اس پہ تو ناچاری ہے
کون سی ورنہ مرے دل میں تمنا کہ نہیں

وہ ابھی برق کی سی جھمکی دکھا جاتا رہا
مصحفی غرفے سے تو نے اسے دیکھا کہ نہیں

۳۵۲

دل ! تری بےقراریاں کیا تھیں
رات وہ آہ و زاریاں کیا تھیں

تیرے پہلو میں اس کی مژگاں سے
برچھیاں یا کٹاریاں کیا تھیں

سرمہ دینے میں اس کی آنکھوں کی
کیا کہوں آب داریاں کیا تھیں

اپنا عاشق نہ تھا تو آئنے میں
نظریں وے پیاری پیاریاں کیا تھیں

جی کے دشمن بھلا یہ بتلا تو
میرے دشمن سے یاریاں کیا تھیں

اپنی قسمت میں آہ کس سے کہوں
ذلتیں اور خواریاں کیا تھیں

مصحفی گر نہ تھا تو عاشق زار
پھر تو یہ جاں نثاریاں کیا تھیں

۳۵۳

سدا خمیازہ ہی کھینچا سدا کرتے رہے آہیں
نہ سوئے ڈال کر اک شب گلے میں یار کے باہیں

قیامت تو غضب یہ ہے کہ یارو جس کو ہم چاہیں
وہ اپنے روبرو ڈالے گلے میں غیر کے باہیں

غنیمت جان گلگشتِ چمن زاہد ، بہشتوں میں
کہاں یہ سبزہ ، یہ آبِ رواں ، یہ تاک کی چھائیں

سرِ رہ روک کر گر اس کا ہم بیٹھے تو کیا حاصل
کوئی آتا ہے اس رستے سے وہ ، اُس کی ہیں سو راہیں
نشاں ہرگز نہ دلّی میں رہا صاحب کمالوں کا
ہوئیں با خاک یکساں کیسی کیسی ہائے درگاہیں
عجائب رسم ہے ہیہات اقلیمِ محبت کی
وہ الٹا دشمنی کرتا ہے ہم سے جس کو ہم چاہیں
تو کس کی یاد میں اے **مصحفی** جوں ابر روتا ہے
کہ بجلی کی طرح کوندیں ہیں اے ظالم تری آہیں

۳۵۴

کہتے ہیں مہر و وفا جس کو جہاں میں وہ نہیں
وہ جو اک چیز ترحم تھی بتاں میں وہ نہیں
اتنا پرہیز عبث کرتے ہو تم عاجز سے
تم جو کچھ سمجھے ہو سو اپنے گماں میں وہ نہیں
بہہ گیا آنکھوں سے دل آب ہو ، کیا جانے کدھر
اشک تو ہیں مژۂ اشک فشاں میں وہ نہیں
لالہ پژمردہ ، گل افسردہ ، ہے نرگس بیمار
رنگ اس باغ کا ایامِ خزاں میں وہ نہیں
وہ جو اک ناز خرامش میں تری نکلے ہے
خوش خرامی روشِ آب رواں میں وہ نہیں
مصحفی بےرخیِ گل سے سبھی نالاں ہیں
کون سا مرغِ چمن ہے کہ فغاں میں وہ نہیں

---

۱ - قافیہ ''چھائیں'' عیوب قافیہ میں سے ہے - متقدمین اسے عیب نہیں جانتے تھے - (فائق)

۳۵۵

کون کافر یہ کہے دیدار کی خواہش نہیں
جی تو چاہے ہے ولیکن یار کی خواہش نہیں

حال پر اس تشنہ جاں کے اک نگاہِ لطف ہو
مجھ کو ساقی ساغرِ سرشار کی خواہش نہیں

کیا دکھاتے ہو ہمیں مژگان و ابرو دم بدم
یاں کسی کو خنجر و تلوار کی خواہش نہیں

اس پہ یہ موے پریشاں بس ہیں سائے کے لیے
اس سرِ شوریدہ کو دستار کی خواہش نہیں

جب تلک ہیں تازہ و تر داغ سینے کی صفا (؟)
ہم اسیروں کو گل و گلزار کی خواہش نہیں

فائدہ کیا ہے کہ اب صحرا سے آویں سوے شہر
دین و دنیا سے گئے گھر بار کی خواہش نہیں

ہو چکا دل سیر جینے سے بہت اے **مصحفی**
اب بجز مُردن کچھ اس بیمار کی خواہش نہیں

۳۵۶

یا نہ ہوتی تھی کبھی اک مژہ تر پانی میں
یا پڑے بہتے ہیں اب لختِ جگر پانی میں

آج بے طرح تُو روتا ہے چلا اے قاصد
میرا مکتوب کہیں کیجو نہ تر پانی میں

کیوں نہ اس رشک سے میں ڈوب مروں یارو وہ شوخ
جاتا ہے پیرنے کو شام و سحر پانی میں

گریہ یاں تک میں کیا ہے کہ کھڑے ہیں احباب
کوئی تا زانو کوئی تا بہ کمر پانی میں

جھاڑے بال اس نے نہا کر تو گریں یوں بوندیں
تو کہے ٹوٹ پڑی سلکِ گہر پانی میں

آسماں پر وہ دکھاوے وہیں دن کو تارے
جھانکے ہو کر عرق آلودہ اگر پانی میں

بیچ دریا کے بھی ہوتی نہیں کم سوزشِ دل
گرچہ رہتے ہیں کھڑے[1] دو دو پہر پانی میں

گر چہ عاشق کو نہیں مانعِ نظارۂ یار
سچ ہے ماہی کو سب آتا ہے نظر پانی میں

ہم نہ کہتے تھے کہ اے **مصحفی** تو اتنا نہ رو
عاقبت ڈوبا ہی ان آنکھوں کا گھر پانی میں

۳۵۷

کھولی زلف اس نے جوں ہی تا بہ کمر پانی میں
تھرتھری پڑ گئی ہر لہر آپر پانی میں

رنگ گریے کا نہیں ایک ترے عاشق کے
آستیں خوں میں تو رومال ہے تر پانی میں

سیرِ دریا کو جو اس بن میں کبھی جاتا ہوں
لہریں تلوار سی آتی ہیں نظر پانی میں

داغِ دل وہ نہیں جو سینے سے منفک ہووے
شست و شو کیجیے تا حشر اگر پانی میں

طرح مچھلی کی پڑا پیرے ہے یہ طفلِ سرشک
ہائے مطلق نہیں لگتا اسے ڈر پانی میں

کشتۂ عشق کے مٹتا ہے کوئی خوں کا نشاں
باندھ کر پوٹ ڈبو دیویں اگر پانی میں

---

۱ - پڑے : ل ۲

ابھی سر پیٹ چلے جاویں گے سب ماہی گیر
مر کے بالوں کو پریشان نہ کر پانی میں

یہ وہ آنکھیں ہیں کہ گھڑیال کے پیالے کی طرح
رہتی ہیں گریے سے اب آٹھ پہر پانی میں

مصحفی آج جو آنکھوں سے گرے آنسو گرم
آتشِ دل نے کیا شاید اثر پانی میں

۳۵۸

ٹک سمجھ کر تو نہانے کو اتر پانی میں
شکل آغوش ہے ہر ایک لہر پانی میں

دیدۂ تر میں عجب کیا ہے جو لہراوے وہ زلف
سانپ کا بھی کہیں[۱] ہوتا ہے گزر پانی میں

کبھی دیکھی بھی ہے دریا پہ چراغاں کی بہار
یوں جھمکتے ہیں مرے لختِ جگر پانی میں

دیدۂ تر سے ہو جو ہائے رموزِ فلکی
ماہِ نو گم ہو تو دیکھیں ہیں بشر پانی میں

گریے کے ہاتھوں سے کیا دل کی پھر آبادی ہو
طرح یونان کی ڈوبا یہ نگر پانی میں

اشکِ جاری کے مرے منع کی اب وہ ہے مثال
جیسے بہتے کو کہے کوئی، ٹھہر پانی میں

بحرِ گریہ سے نہ نکلیں کبھی یہ چشمِ پُر اشک
نت رہیں جوں صدفِ پُر ز گہر پانی میں

جھلکے ہے یوں وہ بدن جامۂ شبنم سے تمام
شوخیاں جیسے کرے عکسِ قمر پانی میں

۱- کبھی : ل - ۲

شعلہ رو آگے ترے حسن کے ہو کر کے عرق
شمع خجلت سے ہوئی جاتی ہے تر پانی میں
ہم نے کیا دیکھا کہ جس دن سے کھلیں یہ آنکھیں
فرطِ گریہ سے رہیں آٹھ پہر پانی میں
قلزمِ عشق کا ڈوبا کوئی ہاتھ آتا ہے
سیکڑوں جال بھی واں ڈالیں اگر پانی میں
آئی رو اشک کی ناگہ تو وہیں بیٹھ گئے
ہم سے کچھ ہو نہ سکا فکرِ دگر پانی میں
مصحفی اتنا بھی بے صرفہ نہ رو خانہ خراب
ایک عالم کے تئیں غرق نہ کر پانی میں

۳۵۹

جو کھولے بال اپنے وہ بتِ بے پیر پانی میں
عجب کیا ہے پریشانی کرے تاثیر پانی میں
مصور گر ترے چہرے کی دیکھے رنگ آمیزی
ڈبووے لے کر اپنے کاغذِ تصویر پانی میں
فلاطوں گریہ کیا کرتا ہے یوناں کی خرابی پر
یہاں ایسی ہزاروں بہہ گئیں تعمیر پانی میں
یہ دریا یا کہ اک رزمیہ صورت نگاراں ہے
کہ لہروں سے کھنچی ہیں جا بجا شمشیر پانی میں
مجھے دم لینے کب دیتا ہے یہ طوفان گریے کا
کروں کیا بن نہیں آتی ہے کچھ تدبیر پانی میں
مہوس رنگ کندن سا ترا گر اک جھلک دیکھے
بہا دے پھاڑ کر سب نسخۂ اکسیر پانی میں

بھنور سے عکسِ مہ نے گرد اپنے خط سا کھینچا ہے
پڑھے جیسے پری خواں دعوتِ تسخیر پانی میں
وہ مچھ خشکی رواں کی سختیِ منزل کو کیا جانے
جو ماہی کی طرح کرتا ہو نت شب گیر[1] پانی میں
مرا دریائے نیلِ گریہ اس شورش سے جاتا ہے
کہ پیلِ مست کھینچے جس طرح تصویر پانی میں
اگر اے ماہیِ دریائے خوبی تجھ کو ٹک دیکھے
نہ پھینکے بار دیگر جال ماہی گیر پانی میں
مشبک کر دیا ہے بس کہ اس کو تیری پلکوں نے
نظر آتا ہے عکسِ ماہ جوں کفگیر پانی میں
نہ دیکھی ایک دن صورت یہ اس نے گرچہ پلکوں سے
میں خوں رو رو کے کھینچیں سیکڑوں تحریر پانی میں
صفا اس کی بنا گوش اور موتی کی میں کیا لکھوں
ملا رکھا ہے ہم رنگی سے اس نے شیر پانی میں
نہ اس کی ناوکِ مژگاں کا کشتہ اک فقط میں ہوں
ہوئے ہیں مردمِ آبی تلک نخچیر پانی میں
نہ تھا میں **مصحفی** اتنا گنہگار اس کا کیا کہیے
ڈبویا مجھ کو چشمِ تر نے بے تقصیر پانی میں

۳۶۰

ہماری طرف آپ کم دیکھتے ہیں
وے[2] آنکھیں نہیں اب جو ہم دیکھتے ہیں

۱- شب گیر : سفر -
۲ - وہ : ل ۱ -

تو آوے نہ آوے ولے ہم تو ہر شب
ترى راہ تا صبح دم دیکھتے ہیں

بہت جھوٹے وعدے کیے تو نے ہم سے
بھلا یہ بھی تیری قسم دیکھتے ہیں

ہمیں جستجو کس کی درپیش آئی
عرب ڈھونڈتے ہیں، عجم دیکھتے ہیں

بہت دیکھا دنیا کو، جاتے ہیں یارو
ذرا اب تو ملکِ عدم دیکھتے ہیں

یہی خط نویسی ہے ہردمَ کی اس کو
تو ہاتھ[1] اپنے اک دن قلم دیکھتے ہیں

بھروسا ہے کیا دم کا یعنی کہ یاں کی
ہوا مختلف دم بہ دم دیکھتے ہیں

پڑے ہے نظر عیب ہی پر انھوں کی
ہنر **مصحفی** یار کم دیکھتے ہیں

۳٦۱

یا تو رہتا تھا وہ رخ شام و سحر آنکھوں میں
یا[2] اب اک جھپکی کو ترسے ہے نظر آنکھوں میں

جس پہ کی ایک نظر ہوگیا وہ دیوانہ
اس پری زاد کی جادو ہے مگر آنکھوں میں

لے گیا آنکھ ملا دل کو مرے سب کے حضور
کر گیا وہ بتِ کافر تو ہنر آنکھوں میں

---

۱ - تو اس سر کو اک دن قلم دیکھتے ہیں : ل ۲ -
۲ - یا کہ اب : ل ۲ -

رنگ گریے کا ہم ان آنکھوں کو دکھلا دیں گے
آن جھمکا جو کوئی لختِ جگر آنکھوں میں

کرکے صورت کو تری یاد میں اے لختِ جگر !
اتنا رویا ہوں کہ آیا ہے جگر آنکھوں میں

اک گھڑی یاد سے بھولا نہ خیالِ رخِ دوست
یاں وہی شکل رہی آٹھ پہر آنکھوں میں

ہم سے ساغر کشیِ شب کا تم اخفا نہ کرو
نشہٗ مے کا ہے اب تک بھی اثر آنکھوں میں

میں نظر بھی نہ کروں ان پہ کبھی گر مہ و سال
پُتلیاں بن کے رہیں شمس و قمر آنکھوں میں

گر یہ آنکھیں ہیں تو اک روز بلا لاویں گی
اس قدر جان مری سرمہ نہ کر آنکھوں میں

قطعہ

مصحفی کسبیوں کا منھ نہ تک اے خانہ خراب
ورنہ ریجھے گا اگر کر گئیں گھر آنکھوں میں

ہیں یہ وے لوگ کہ دل کے تئیں لے جاتے ہیں
بہ کنایت ، بہ اشارت ، بہ نظر آنکھوں میں

۳٦۲

عشق[1] ہے ، آفت و بلا تو نہیں
اس کا مارا کوئی جیا تو نہیں

---

۱ - ہے یہ عشق : ل ۲

دل کی تڑپوں میں آن نکلے ہے
دیکھیو کشتۂ ادا تو نہیں
پوچھتا کیا ہے حال دل کا مرے
او میاں تجھ سے کچھ چھپا تو نہیں
تو جو اس کی گلی میں جاتا ہے
کہیں اے دل تری قضا تو نہیں
یعنی عاشق ہو اور ہرجائی
اب تلک ہم نے یہ سنا تو نہیں
یوں جو تو منہ پھرائے[1] بیٹھا ہے
کیوں میاں مجھ سے کچھ خفا تو نہیں
بات پر اس کی میں جو بولا کیا ؟
کہا : کچھ ذکر آپ کا تو نہیں
کس طرح سجدہ کیجیے اس کو
ہے وہ بت بت ہی ، کچھ خدا تو نہیں

ق

شیشۂ دل کو بیچتے ہیں ہم
اک نگہ پر ، گراں بہا تو نہیں
سودا اچھا ہے گر میاں صاحب
لے چکو تم تو کچھ برا تو نہیں
مصحفی سچ تو کہہ،تو رووے ہے کیوں
کچھ کسی نے تجھے کہا تو نہیں

---

۱ - تھتھائے : ل ۱

۳۶۳

قرآں میں نے کسی کی ہم فال دیکھتے ہیں
اپنے ہی چاک دل کا احوال دیکھتے ہیں

سروِ رواں کی اپنے ہم چال دیکھتے ہیں
ہوتا ہے ایک عالم پامال، دیکھتے ہیں

کیا کیا ہمارے دل میں آتا نہیں جب اس کی
لپٹی ہوئی کمر سے اک شال دیکھتے ہیں

فتنے نے جن سے آگے ہرگز قدم نہ رکھا
ان[1] محشروں کو اس کے دنبال دیکھتے ہیں

بہتے ہیں اس گلی میں ہر سو لہو کے نالے
رنگِ زمانہ اور ہی اس سال دیکھتے ہیں

معشوق سادہ رو پر دل دے گزرتے ہیں ہم
نے زلف دیکھتے ہیں، نے خال دیکھتے ہیں

یا دل کو دیکھتے تھے پہلو میں اپنے ہر دم
یا ہم اب اس کی جاگہ اک بھال دیکھتے ہیں

اے مصحفی تجھے کیا رونے کی خو پڑی ہے
آنکھوں پہ تیری اکثر رومال دیکھتے ہیں

۳۶۴

مستی میں تفِ دل سے اگر نالہ کروں میں
ہر لب گروِ ساغرِ تبخالہ[2] کروں میں

---

۱ - محشر کو ان کے اکثر دنبال دیکھتے ہیں : ل ۱
۲ - تبخالہ : چھالا

گر سحر طرازی کے اوپر آؤں تو ووں ہی
جو نقش کہ کھینچوں اسے گوسالہ کروں میں
اے لختِ جگر تیری مدد ہووے تو شاید
مژگاں کے حوالے کوئی پرکالہ کروں میں
سینہ مرا داغوں سے گلستان ہوا ہے
ہے وقت کہ سیرِ چمنِ لالہ کروں میں
اے مصحفی اتنا بھی غنیمت ہے جو گاہے
دل خوش بہ سخن سازیِ دلا"لہ کروں میں

۳٦۵

کیوں کہ ہر گل کے تئیں چاک گریباں دیکھوں
ہائے ان آنکھوں سے یہ رنگِ گلستان دیکھوں
کیا مصیبت ہے کھلے آنکھ تو رونا آوے
اور جو جھپکے تو وہیں خوابِ پریشاں دیکھوں
خط تو لکھا ہے پہ تدبیر بتا اے قاصد
صورتِ یار کو میں بھی کسی عنواں دیکھوں
کاش سوتا ہی رہوں میں کہ نہیں چاہتا دل
ہر سحر اٹھ کے رخِ گبر و مسلماں دیکھوں
درِ جنت پہ بھی زنہار نہ رکھوں میں قدم
گر ذرا چیں بہ جبیں صورتِ رضواں دیکھوں
یہ بھی قسمت تھی کہ جب اس کی گلی میں جاؤں
تلخیِ[1] غیر و ترش روئیِ درباں دیکھوں

---

۱ - تلخی و کبر و : ل ۲ -

لا رکھو آگے مرے کوئی مرقع ہی ذرا
تا میں اس میں تو بہم صورتِ یاراں دیکھوں

کہتے ہیں جس کے تئیں وصل کا دن ، دنیا میں
میں بھی وہ دن کبھی اے گردشِ دوراں دیکھوں

چشمِ تر گوشہ بہ امیدِ ترحم کھولوں
تو جو آوے نہ نظر صورتِ حرماں دیکھوں

ہائے جن آنکھوں سے دیکھا ہوں میں روے شبِ وصل
کیوں کہ ان آنکھوں سے روے شبِ ہجراں دیکھوں

ہر بنِ موپہ مرے داغ تھا ، دل میں اس کے
نہ یہ آیا کہ تماشاے چراغاں دیکھوں

ہائے وہ دل کہ جسے میں نے بغل میں پالا
اب اسے یوں ہدفِ ناوکِ مژگاں دیکھوں

مصحفی شہر سے دل سخت بتنگ آیا ہے
جی میں آتا ہے کہ ٹک جا کے بیاباں دیکھوں

۳۶۶

دنیاے دوں کی اپنے تئیں چاہ ہی نہیں
شکرِ خدا کہ آرزوے جاہ ہی نہیں

یاروں کو کیا دکھاؤں گا گریے کا اپنے رنگ
لختِ جگر تو اشک کے ہمراہ ہی نہیں

کرنے ہلاک تشنہ لبی مجھ کو لے گئی
اس سر زمین میں کہ جہاں چاہ ہی نہیں

یا تیرگی سے روے ہوا ہو گیا سیاہ
یا آسماں پہ ہجر کی شب ماہ ہی نہیں

۳۰۱

بیٹھے ہیں چپکے ، کس سے سرِ حرف وا کریں
اس بزم میں کسی سے ہمیں راہ ہی نہیں

لکھا ہے اس نے خط میں ہر اک شخص کو سلام
اک اس میں نامِ بندۂ درگاہ ہی نہیں

اتنے بخود گئے ہیں کہ اس انجمن کے بیچ
کوئی کسی کے حال سے آگاہ ہی نہیں

اے دل شبِ فراق سے مت ڈھونڈھ روشنی
یہ ہے وہ شب کہ جس کی سحرگاہ ہی نہیں

ملنے کی تیرے ہم کو بہت آرزو ہے یار
پر کیا کریں کہ مرضیِ اللہ ہی نہیں

اے[1] مصحفی ہر اک کو سخن کا غرور ہے
طرزِ سخن سے پر کوئی آگاہ ہی نہیں

۳٦۷

ہے لت سرِ شوریدہ مرا چاکِ قفس میں
بے تاب ہوں نظارۂ گلشن کی ہوس میں

کم‌عمری میں‌جو دیکھے ہے حسن اس کا کہے ہے
یہ طفل غضب ہووے گا دوچار برس میں

جوں شانہ نہ چھوڑے گا کبھی ہاتھ سے ان کو
زلفوں کے تری بال اگر آ گئے بس میں

---

۱ - اے مصحفی سخن کا ہر اک کو غرور ہے : ل ۲ -

اغلب ہے کہ فریاد سے یک لحظہ نہ چپ ہو
اس دل کو اگر تعبیہ[1] کر دیجے جرس میں

مژگاں پہ مری لختِ جگر جھمکیں ہیں جیسے
دیکھا نہیں یوں ربط کہیں شعلہ و خس میں

جوں شمع سحر اتنا نہیں عمر کا وقفہ
یاں کام ہے اپنا تو تمام ایک نفس میں

اے مصحفی! افسوس ہے ان لوگوں سے شطرنج
جو فرق نہیں کرتے کبھو پیل و فرس میں

۳٦۸

اب مرغِ دل اپنا تو ہے صیاد کے بس میں
خواہی اسے ہاتھوں میں رکھے خواہ قفس میں

دیکھا نہ کبھی تو نے میاں آنکھیں اٹھا کر
ان کو جو موے جنبشِ مژگاں کی ہوس میں

پھرتا ہے ادھر زلف میں شانہ تو ادھر دل
اک لاگ چلی جاتی ہے جوں دزد و عسس[2] میں

نیّات اگر یہ ہیں تو دیکھو گے ، زمانہ
اس سے بھی بتر ہووے گا اک آدھ برس میں

کیا جانیے کیدھر کو گیا محملِ لیلیٰ
وہ ہوش ربائی نہیں آوازِ جرس میں

---

۱ - تعبیہ : (ع) مذکر ، آراستہ کرنا ، پنہاں کرنا ، کسی چیز کا کسی چیز میں اس طرح مل جانا کہ معلوم نہ ہو ۔
(نوراللغات ، ج ۲ ، ص ۲٦۱)

تعبیہ : بہ معنی آراستن و بہ معنی ساختن چیزے کہ قدرے غریب نماید ۔ (غیاث اللغات ، ص ۱۰۲)

۲ - عسس : (ع) کوتوال ۔

گر ناخنِ فریاد کرے عقدہ کشائی
سو زمزمے پنہاں ہیں مرے تارِ نفس میں

اے مصحفی ! مشکل ہے غزل ایک سی کہنا
اک بیت کہیں اچھی بھی ہو جاتی ہے دس میں

۳۶۹

نہ ہردم، ہرگھڑی اس ذلت و خواری پہ روتا ہوں
میں تھا[1] آزردہ دل ، اپنی گرفتاری پہ روتا ہوں

الٹ کر گر پڑا ساغر مرا کل دستِ ساقی سے
تبھی تو طالعوں کی میں نگوں ساری پہ روتا ہوں

مجھے وقتِ وداعِ دوست داراں یاد آتا ہے
میں نت ناچار ہو کر اپنی ناچاری پہ روتا ہوں

مرا دل زلفوں کے حلقوں سے ہرگز بچ نہیں سکتا
میں اس بیمار کی پُر پیچ بیماری پہ روتا ہوں

زمانہ سیم و زر سے مصحفی ایسا تھا کب خالی
نہ اپنی مفلسی ، عالم کی ناداری پہ روتا ہوں

۳۷۰

جو عاشق ہیں مضموں نیا باندھتے ہیں
ہر اک بات میں چٹکلا باندھتے ہیں

جو کرتے ہیں زلفوں کو اس کی حمائل
گلے سے وہ اپنے بلا باندھتے ہیں

میں کب سرمہ آنکھوں میں اس کی دیا ہے
یوں ہی یار اک توتیا[2] باندھتے ہیں

---

۱ - ہوں : ل ۲ -
۲ - توتیا باندھنا : الزام دینا -

خدا جانے نکلیں گے کب گھر سے باہر
ابھی وے تو بندِ قبا باندھتے ہیں

غلط ہے کہ زلفوں سے اس کی بندھا ہے
مرے دل پہ یہ افترا باندھتے ہیں

فلک کی خبر کب ہے ناشاعروں کو
یوں ہی گھر میں بیٹھے ہوا باندھتے ہیں

بلا پُر خرد ہیں یہ خوں‌خوار لڑکے
کہ چہرے میں زلفیں ملا باندھتے ہیں

گلی میں تری آنے جانے سے اے گل
جو ہم ہیں تو پائے صبا باندھتے ہیں

وہی ایک معنی ہیں اس نُہ ورق میں
کہ جس کو بہ چندیں ادا باندھتے ہیں

ہم اس باغ سے اب تو رختِ سفر کو
بہ تکلیفِ بانگِ درا باندھتے ہیں

جو جیتے ہیں تو **مصحفی** آشیانہ
کسی شاخِ گل پر پھر آ باندھتے ہیں

۳۷۱

اگر اے برقِ عالم سوز یہ ہیں تیری اچپلیاں[1]
تو ہم کو ٹھہرنے دیں گی نہ یک جا دل کی بےکلیاں

گل اپنے دورِ پیراہن پر[2] اس گلشن میں نازاں تھا
پہ ششدر رہ گیا دیکھیں جو کُرتے کی ترے کلیاں

---

۱ - اچپلیاں : (ہ) شوخیاں ۔
۲ - پہ : ل ۱ ، ۲ ۔

٣٠٥

کوئی ہندوستاں میں کم کسی کی داد کو پہنچا
موے لاکھوں ہی عاشق اور ہزاروں بستیاں جلیاں

قیامت ماجرا اس ناچ میں گزرا سحر ہوتے
کہ اک عالم کو کافر لولیاں[1] پامال کر چلیاں

ملایا خاک میں یوں نو خطوں کو رشکِ عارض نے
کسو نے لے کے جیسے چینٹیاں[2] تلووں تلے ملیاں

بچا شمشیرِ ابرو اور کمندِ زلفِ پُر چیں سے
نہ پوچھو کیسی کیسی آفتیں سر سے مرے ٹلیاں

نہیں آساں ملا اے مصحفی دیدار عصمت[3] کا
پھرا ہوں ڈھونڈتا مدت تلک میں شہر کی گلیاں

٣٧٢

آرام سے اک دن کبھی ہم بیٹھے نہ گھر میں
رکھا تری خواہش نے ہمیں روز سفر میں

صدقے ہوں میں پیارے ترے دانتوں کی چمک کے
سو ہووے ہے شفاف کہاں سلکِ گہر میں

کیا تو بھی مری طرح سے عاشق ہے کسی کا
اے لالہ! بتا کیوں ہے ترے داغ جگر میں

اے لختِ جگر روز تری راہ تکوں ہوں
رکھا نہ قدم تو نے کبھو دیدۂ تر میں

---

١ - لُولی : (ف) ناچنے والی -
٢ - چیونٹیاں - (موجودہ املا)
٣ - نام محبوبۂ مصحفی -

وعدہ نہ کیا وصل کا ، باتیں ہی بنائیں
گر ہم سے کبھی مل بھی گیا راہ گزر میں

اے آئنہ ہرچند کہ تو سادہ نما ہے
پر تیری نظر بازیاں ہیں اپنی نظر میں

اے مصحفی ! اتنا بھی کوئی سووے ہے غافل
اٹھ صبح ہوئی صرفہ ہے کیا خوابِ سحر میں

۳۷۳

شاید کہ ہم سے پھر نگہیں یار کی پھریں
کچھ ان دنوں میں آنکھیں لگیں یار کی پھریں

دل کی طرف کو پلکیں جوں ہی یار کی پھریں
نوکیں جگر میں پیرتیاں خار کی پھریں

کس کا بیان تجھ سے کروں تیرے عشق میں
کیا کیا نہ حالتیں کہ دلِ زار کی پھریں

کہہ کس سے رفتگی ہوئی پیدا کہ ان دنوں
طرزیں تمام ہیں تری رفتار کی پھریں

لایا کبھی نہ رو بہ شفا عشق کا مرض
سو صورتیں اگرچہ اس آزار کی پھریں

لوٹے مزے اسی نے یہاں ، جس ذبیح کے
چھریاں گلے پر آس بتِ خونخوار کی پھریں

گہہ سرخ ، گاہ زرد ہوا سب ہوا کا رنگ
کیا کیا ہوائیں اب کے چمن زار کی پھریں

ٹھہرا نہ ایک وضع پہ تیرا مزاج ، شوخ
سو وضع بندشیں تری دستار کی پھریں

دل گم ہوا مرا تو تری زلف کی لٹیں
سینے میں دوڑی دوڑی طرح مار کی پھریں
مژگاں کی فوج نے وہیں گھوڑے اٹھا دیے
باگیں جدھر کو ٹک نگہِ یار کی پھریں
کس کی مریض ہے یہ کہ کچھ دیکھتا ہوں میں
آنکھیں چمن میں نرگسِ بیمار کی پھریں
گر آ گیا زمانہ کبھی فربہی پہ ٹک
دیکھو گے صورتیں در و دیوار کی پھریں
کافر تو ہو گئے تری زلفوں کو دیکھ کر
از بس کہ نیتیں اولی‌الابصار کی پھریں
اے مصحفی! زمانہ بہ‌یک وضع ہی رہا
کج خوئیاں[1] نہ چرخِ ستم گر کی پھریں

۳۷۴

پیچھے لگی وہ زلفیں دلِ زار کے پھریں
یاں تک کہ آخرش کو اُسے مار کے پھریں
من بعد مرگ میرے، مرے دل کی خواہشیں
اک عمر گرد آرزوے یار کے پھریں
رم‌خوردہ صید کون ہے وہ جس کے شوق میں
زلفیں تری کمندیں بغل مار کے پھریں
مارِ سیاہ زلف کو دیکھا جو حلقہ زن
نظریں نہ گرد اس گلِ رخسار کے پھریں
صیاد کی یہ خو ہے تو اس صید گاہ میں
چھریاں گلے پہ دیکھیو دو چار کے پھریں

۱ - بدخوئیاں : ل ۲-

کیا کیا نہ ماہ پارہ تری آرزو کے بیچ
پردے میں منہ چھپائے شبِ تار کے پھریں
دم عشق کا بھریں تھیں جو دو چار حسرتیں
وہ پاس بھی نہ آ دل بیمار کے پھریں
تھا قصدِ سیرِ عرش ان آہوں کو شب ولے
جب واں تلک پہنچ نہ سکیں ہار کے پھریں
گر اس نے گل رکھا کبھی چہرے پہ، بلبلیں
جوں پیچ گرد چہرۂ گلنار کے پھریں
کیا کیا نہ حور چہرہ کہ بالوں کو کھول کر
گردِ مزارِ **مصحفیِ** زار کے پھریں

۳۷۵

نے محرمِ قفس ، نہ شناسائے باغ ہیں
ہم اپنی بے نصیبی کے ہاتھوں سے داغ ہیں
اک دن اب اس چمن سے اٹھالیں گے آشیاں
بلبل کے چہچہوں سے بہت بے دماغ ہیں
لائے ہیں پائے چرخ جو انجم سے آبلہ
یہ ایسے کس کی راہ میں گرمِ سراغ ہیں
ہاتھوں سے جل رہا ہوں میں کس کے جو **مصحفی**
سینے کے داغ جیسے کہ روشن چراغ ہیں

۳۷۶

کب ہیں نرگس کی یہ ایں شوخ ادائی آنکھیں
اس نے تیری سی کہاں پائیں ہوائی آنکھیں
ایک تو ہر مژہ اس شوخ کی رو گرداں ہے
تس پہ ہر لحظہ بتاتی ہیں رکھائی آنکھیں

سخت دیکھا میں الم ان سے بہت بہتر تھا
پھوٹ جاتیں جو مری روز جدائی آنکھیں

سادگی ان کی مجھے ذبح کرے ہے یارو
بس کہ اس شوخ کی رکھتی ہیں صفائی آنکھیں

بے بصر ہوتے ہیں محتاج عبث عینک کے
کام آتی نہیں زنہار پرائی آنکھیں

کھول کر آنکھیں ذرا سیرِ جہاں کر کہ یہاں
ذرے ذرے میں دکھاتی ہیں جدائی آنکھیں

ایک دن اس کی کفِ پا سے ملی تھیں میں نے
ہو گئی ہیں مری اس دن سے حنائی آنکھیں

حسن گو پردہ نشیں ہووے پرکھ جاتے ہیں
جن نظر بازوں کی رکھتی ہیں رسائی آنکھیں

یارب اپنی بھی کبھی رخنۂ دیوار کی طرح
حرمِ وصل میں کر گئی تھیں رسائی آنکھیں

ایک دن در پہ کھڑے اس کو کبھی دیکھا تھا
تب سے دیدار کی کرتی ہیں گدائی آنکھیں

مصحفی کو نہ رہی طاقتِ نظارہ دریغ
اس نے سیں[1] دیکھ تری تنگ قبائی آنکھیں

۳۷۷

حرکات[2] اس کی سے نکلیں ہیں ادائیں لاکھوں
کیوں نہ دوں اس کے تئیں دل سے دعائیں لاکھوں

---

۱ - ”ہیں دیکھیں“ یا ”جوں دیکھیں“ - فائق
۲ - آن میں اُس کی نکلتی ہیں ادائیں لاکھوں
کیوں نہ دوں دل سے بھلا اُس کو دعائیں لاکھوں
(تذکرۂ سرور)

کوچۂ[1] زلف میں اک رات میں جا نکلا تھا
دوڑیاں اٹھ کے مرے پیچھے بلائیں لاکھوں

باز آتے نہیں ہم تو بھی زباں کاری سے
گرچہ اس عشق میں پاتے ہیں سزائیں لاکھوں

شیشۂ دل کو مرے یار نہ پتھر پہ پٹک
ورنہ نکلیں گی ابھی اس سے صدائیں لاکھوں

ناز بردارِ بتاں ہم تو رہے تا لبِ گور
مرتے مرتے بھی سہیں ان کی جفائیں لاکھوں

ہوجے ہرگز نہ دلا عفوِ خدا سے نومید
بخش دیتا ہے وہ اک دم میں خطائیں لاکھوں

مصحفی خوابِ عدم سے کوئی اب اٹھتا ہے
گو آسے آن کے عیسیٰ سے جگائیں لاکھوں

۳۷۸

کیوں نہ لوں وصل کی شب تیری بلائیں لاکھوں
میں ترے[2] واسطے مانگی ہیں دعائیں لاکھوں

وائے قسمت کہ شفا مجھ کو میسر نہ ہوئی
گرچہ کی ہیں مرضِ دل کی دوائیں لاکھوں

بیٹھے بیٹھے جو میں شب سینے پہ ناخن مارا
پردۂ دل سے مرے نکلیں صدائیں لاکھوں

---

۱ - کوچۂ زلف میں اک رات مرا دل جو گرا
چمٹیاں اس سے وہیں اٹھ کے بلائیں لاکھوں
(تذکرۂ سرور)

۲ - میں نے اس واسطے: سرور

کشتہ[1] ہوں اس کی میں برہم زدنِ مژگاں کا
گردشِ چشم میں ہیں جس کی ادائیں لاکھوں

مصحفی رنگِ گل اک وضع پہ کس طرح رہے
روز اس باغ میں چلتی ہیں ہوائیں لاکھوں

۳۷۹

وہی آہ و فغان و زاریاں ہیں
وہی راتیں وہی بیداریاں ہیں

نہ نامِ عشق لے ناداں کہ اس میں
بہت رسوائیاں اور خواریاں ہیں

میں حیراں ہوں کہ کیوں ہنسنے میں گل کے
ترے ہنسنے کی وضعیں ساریاں ہیں

کہیں ہیں جس کو خوباں پان کھانا
ہمارے حق میں وے خوں خواریاں ہیں

مرے ان نونہالوں نے بدن پر
زبس پھولوں کی چھڑیاں ماریاں ہیں

جدا جس نقش کو دیکھوں ہوں اس میں
ہزاروں رنگ اور گل کاریاں ہیں

ق

محل کی رنڈیوں کا کیا کروں ذکر
جہاں[2] گرم ان کی صحبت داریاں ہیں

وہی ٹھٹے وہی چہلیں ہیں باہم
وہی چیخیں وہی کلکاریاں ہیں

---

۱ - کشتہ میں اس کی ہوں : سرور
۲ - زبس : پ ، ل (ا - ب)

نہ پوچھ اے مصحفی احوال دل کا
کہ اس دل کو کئی بیماریاں ہیں

۳۸۰

نہ تنہا دل میں سو نشتر چھپے ہیں
تہِ ہر مو یہاں خنجر چھپے ہیں

زمیں کو کھودیے تو اس کے نیچے
ہزاروں سردلیں[1] اور در چھپے ہیں

فقیروں کو بہ چشم کم نہ دیکھو
کہ ان میں اولیا اکثر چھپے ہیں

کہے تھی دایہ طفلی میں وہ بھوں دیکھ
ابھی اس تیغ کے جوہر چھپے ہیں

اگر سینے کو میرے چاک کیجے
تو اس میں مثل گل دفتر چھپے ہیں

نہ چادر پھولوں کو تو سرسری دیکھ
کہ رعنا قد بہ پس چادر چھپے ہیں

جھلکتا ہے وہ رخ برقعے سے سارا
چھپانے کب پری پیکر چھپے ہیں

کیا تھا دفن ہم کو جس جگہ واں
انگارے زیرِ خاکستر چھپے ہیں

بہ ہر سو مصحفی کا تذکرہ ہے
کوئی ایسے سخن پرور چھپے ہیں؟

---

۱ - سردل: (ہ) مذکر۔ چوکھٹ کے اوپر کا بندو، چوکھٹ کے اوپر کی لکڑی جس میں کواڑ کی بالائی چول رہتی ہے۔
(نوراللغات، ج ۳، صفحہ ۲۵۴)

۳۸۱

چتیں پلکوں کی جب اٹھا دی ہیں
اس نے آنکھیں ہمیں دکھا دی ہیں

تہِ پا آ گئے ہیں گر تیرے
تہِ دل سے تجھے دعا دی ہیں

میرے پیچھے بلائیں زلفوں کی
بیٹھے بیٹھے ابھی لگا دی ہیں

سرِ فرہاد پر نہیں موقوف
عشق نے گردنیں کٹا دی ہیں

اس نے کل دیکھتے ہی میری طرف
کیا ہی نظریں تلے جھکا دی ہیں

چل بے ناصح کہ میں گریباں کی
پھاڑ کر دھجیاں اڑا دی ہیں

قصر دل کا خراب ہے، غم نے
اس کی سب صورتیں مٹا دی ہیں

یوں[1] بھڑکتے ہیں استخواں میرے
تو کہے لکڑیاں جلا دی ہیں

شاہدِ گل سے آج نرگس نے
بے طرح انکھڑیاں ملا دی ہیں

ق

شہہ نہ تو مصحفی کے وصف ہیں یہ
کیا ہی بیتیں مجھے لکھا دی ہیں

۱۔ ب و ل ۱ میں نہیں۔

اس نے ایسی تو سینکڑوں غزلیں
موت کے ریلے میں بہا دی ہیں

۳۸۲

خورشیدِ اوجِ خوبی ، ماہِ سپہرِ احسان
شمشیر جنگ یعنی مرزا محمدی خاں

بزش میں تیغ جس کی ہے جیسے برقِ خاطف
بخشش میں ہاتھ جس کا ہے جیسے ابرِ نیساں

جوں گل شگفتگی میں باغ و بہار ہے وہ
مجلس تمام اس کی ہے اس لیے گلستاں

اس کے جلوس سے ہے سب پالکی کی زینت
اس برجِ قوس کا ہے وہ آفتابِ تاباں

ق

کیا زرق و برق اس کی پوشاک کی بتاؤں
اک دن میں جا جو نکلا سوے حریر دوزاں

زربفت و مہر و مہ کو مقراض کر رہے تھے
تا قطع کر سئیں وے اس کی سنجافِ داماں

کیوں کر نہ ہر طرف سے تحسیں بلند ہووے
ہو **مصحفی** سا شاعر جس بزم میں غزل خواں

ق

جب مدح کہہ چکا میں دل نے مجھے کہا یوں
کاے طوطیِ نواسنج وے بلبلِ خوش الحاں

اک مجھ کو اس زمیں میں اپنی غزل سنا[1] دے
سنتے ہی جس کو ہوویں سب سامعین حیراں

---

۱ - سنا تو : پ ، ل ۱ ، ۲ -

تب دل سے یوں کہا میں کیا چاہیے بہت خوب
اتنے میں لب تک آیا یہ مطلعِ نمایاں

۳۸۳

گر اس روش سے ہو تو سوے چمن خراماں
لے آنکھوں سے لگاوے گل تیرا طرفِ داماں

گردش میں چشم کی تھی گردش فلک کی ساری
دل ہل گئے ہزاروں جوں ہی ہلے وہ مژگاں

خوں گشتہ دل کو میرے مت چشمِ کم سے دیکھو
یہ لعل بھی کسی کا تھا تکمۂ گریباں

شرمندہ ہو ستارے آنکھیں لگے چرانے
مکھڑے کو چاندنی میں آیا جو کر[1] زر افشاں

یہ بھی کوئی روش ہے اے جامہ زیب ادھر دیکھ
ہاتھوں سے تیرے گل کا ٹکڑے ہوا گریباں

اب تک حواس میرے یارو ہوے نہیں جمع
میں سر کے بال اس کے دیکھے تھے کل پریشاں

اس گل کی تنگ پوشی گر ہے یہی تو اک دن
کچھ گل کھلا رہے گا یہ اختلاطِ چسپاں

یہ شاعری نہیں کچھ بے شک کہ ساحری ہے
اے مصحفی ! وہ سمجھے اس کو جو ہو زباں داں

۳۸۴

ہم نہ وہ تاب و تواں رکھتے ہیں
کانپتے پاؤں وہاں رکھتے ہیں

---

۱ - کرکے افشاں : پ

یہ نہ جانو نہیں عاشق پیشہ
ہم بھی اک آفتِ جاں رکھتے ہیں
خوش قداں اور بھی خوش جلوہ ہیں لیک
پاؤں اس دھج سے کہاں رکھتے ہیں
مجھ میں اور اس میں ہے اک الفت صاف
بدگماں اور ہی گماں رکھتے ہیں
عشق ہے ہم کو کہ اب تک تجھ سے
اپنی خواہش کو نہاں رکھتے ہیں
بولتے آپ نہیں ہم سے کبھی
منہ میں کہنے کو زباں رکھتے ہیں
مصحفی گر وہ لگاوے کوئی تیر
ہم دل اپنے کا نشاں رکھتے ہیں

۳۸۵

ملا چاہو تم تو بہانے بہت ہیں
جگہیں سیکڑوں ہیں ٹھکانے بہت ہیں
حدیثِ سرِ زلف کیا کوئی سمجھے
کہ اس بات کے شاخسانے بہت ہیں
تہی دست جانے کا یاں سے نہ غم کھا
زمیں کے تلے تو خزانے بہت ہیں
بھڑکیو سمجھ کر ٹک اے آتشِ گل
کہ اس باغ میں آشیانے بہت ہیں
کہوں غیر مجلس میں کیا تجھ[1] سے دل کی
کہ یاں لوگ اپنے بگانے بہت ہیں

۱ - اپنے : ل ۲ -

کوئی میں نکلتا ہوں دریاے غم سے
ابھی اس میں جھکجھولے کھانے بہت ہیں

نہیں آدمیت کا دلیؔ میں چرچا
جدھر دیکھو بھڑوے زنانے بہت ہیں

لگا تیر کوئی جسے چاہے پیارے
کہاں ہاتھ میں لے نشانے بہت ہیں

بتوں کے تحشم کا کیا ذکر کیجے
خدائی ہے یاں کارخانے بہت ہیں

تری زلف کس کس کے پاؤں پڑے گی
ہے زنجیر اک اور دوانے بہت ہیں

زمانے کا دیکھا ہے میں نے بہت کچھ
مجھے یاد ایسے زمانے بہت ہیں

زمانے کا شکوہ نہ کر[۱] ہم سے ہمدم
سخن اور کہہ کچھ فسانے بہت ہیں

اٹھ اے مصحفی کیا یہی در ہے تجھ کو
پٹکنے کو سر آستانے بہت ہیں

۳۸۶

ہے بسا گل عذار آنکھوں میں
کیا سماوے بہار آنکھوں میں

جیسے شیشے میں مے جھلکتا ہے
رنگِ رخسارِ یار آنکھوں میں

رات جاگا ہے تو کہاں جو تری
اب تلک ہے خمار آنکھوں میں

---

۱ - مجھ سے ہردم : پ - مجھ سے ہمدم : ل ۱ ، ۲ -

دمِ شمشیر سا چمکتا ہے
سرمہ ان آبدار آنکھوں میں

کام کر جاتی ہیں تری آنکھیں
چپکے چپکے ہزار آنکھوں میں

اس نے اک جھانولی[1] سے دکھلا دی
گردشِ روزگار آنکھوں میں

لال ڈوروں سے اس پری رُو کے
ہے قیامت بہار آنکھوں میں

تیرے ہاتھوں سے آ رہی ہے جان
اے دلِ بے قرار آنکھوں میں

ق

رات ازبس کہ کر رہا تھا ہجوم
شوقِ دیدارِ یار آنکھوں میں

تارے گن گن کے مصحفی کاٹی
میں شبِ انتظار آنکھوں میں

۳۸۷

یارِ بن شغل مے و جام کے نزدیک نہیں
عمر گزری کہ میں اس کام کے نزدیک نہیں

اک طرف شمع کہ یاں تیرگیِ طالع سے
نورِ مہ اپنے در و بام کے نزدیک نہیں

تہمتِ بوسۂ عاشق کے ہوں آلودہ دریغ
وے لبِ سادہ کہ دشنام کے نزدیک نہیں

---

۱ - جھانولی : (ھ بروزن باولی) مؤنث - آنکھ کا اشارہ ، معشوق کی ناز بھری گردشِ چشم - (نوراللغات ، ج ۲ ، ص ۶۰م)

کیا مصیبت ہے کہ جی نکلے ہے اور اس ساعت
کوئی اس تیرہ سر انجام کے نزدیک نہیں

میوۂ پختہ کا طالب ہوں میں اس باغ کے بیچ
ہاتھ میرا ثمرِ خام کے نزدیک نہیں

کون سا طائرِ بگرفتہ اجل اے صیاد!
اس گلستاں میں ترے دام کے نزدیک نہیں

دردِ دوری کی اذیت کو وہی سمجھے گا
جو کوئی اپنے دل آرام کے نزدیک نہیں

نت دعا ہی میں رہا ہاتھ مرا یاقسمت
اب تلک زلفِ سیہ فام کے نزدیک نہیں

جب سے اے راحتِ جاں مجھ سے ہوا ہے تو جدا
دل مرا راحت و آرام کے نزدیک نہیں

مصحفی خاص تو سمجھیں ہیں بھلا رتبۂ شعر
قدر اس چیز کی گو عام کے نزدیک نہیں

۳۸۸

میں جب اس کو خنجر بہ کف دیکھتا ہوں
ہزاروں کے جی کو تلف دیکھتا ہوں

فلک گر ہنساتا ہے مجھ پر کسی کو
میں ہنس کر فلک کی طرف دیکھتا ہوں

نہ یہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے
کچھ الٹی ہوئی[۱] صف کی صف دیکھتا ہوں

---

۱ - ہی میں : ل ۲ -

ادھر کو ہے رخ کس کی مژگاں کا یا رب !
کئی دن سے سینہ حذف دیکھتا ہوں
جب آیا ہے مژگاں پہ آنسو ، میں اس[1] سے
تماشاے دُرِّ نجف دیکھتا ہوں

ترا مستِ نظارہ مارا پڑا ہے
جہاں ، خوں پر اس کے کف دیکھتا ہوں

ق

اگرچہ میں ہمت بلندی سے اپنی
گھر اپنے سارے خذف دیکھتا ہوں
ولے مصحفی ہو ہے میری تسلی
جو گاہے کلامِ سلف دیکھتا ہوں

۳۸۹

چہرہ اُتر رہا ہے نقشے بگڑ گئے ہیں
پھر ان دنوں تو تیرے لچھّن سے جھڑ گئے ہیں
ہم جن کی دوستی پر دیتے تھے جان اپنا[2]
قدرت خدا کی ہم سے وے رات لڑ گئے ہیں

تلوار سج کے جب وہ نکلا ہے گھر سے باہر
کُشتوں کے ہر گلی میں ستھراؤ پڑ گئے ہیں
تیری صفاے دنداں کے آگے ہو کے عاجز
دانتوں میں اپنے موتی تنکے پکڑ گئے ہیں

جب شہرِ دل سے پیارے تم نے سفر کیا ہے
بستے نگر ہزاروں پل میں اُجڑ گئے ہیں

---

۱ - اپنے : پ ل ۱ ، ۲ -
۲ - اپنی : پ ل ۲ -

وے جو مریض تیرے جیتے تھے کل ذرا اک
کہتے ہیں آج ان کے پھر دم آ کھڑ گئے ہیں

روتا پھروں ہوں تنہا میں قافلے میں یارو
منزل پہ میرے ساتھی مجھ سے بچھڑ گئے ہیں

جب سے پھرا ہے اس کی پلکوں کا رخ اِدھر کو
سینے میں آسماں کے سوراخ پڑ گئے ہیں

واں اس نے گر لیا ہے خمیازہ منہ پھرا کر
یاں میرے چاک دل کے ٹانکے اُدھڑ گئے ہیں

اے **مصحفی** میں روؤں کیا پچھلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

۳۹۰

دیکھا جو دستِ غیر میں اس کا مر آستیں
رویا بہت میں رکھ کے وہیں منہ پر آستیں

دستِ ستم کو تو نے جو کوتہ کیا تو پھر
خواہی دراز، خواہ تو کوتہ کر آستیں

کیا خوب دن تھے وے[1] کہ جو گلشن سے ہر سحر
چن چن کے پھول لاتے تھے ہم بھر بھر آستیں

ساعد نہ جان تو کہ وہ شوخِ دوپٹہ باز
رکھتا ہے میرے قتل کو خنجر در آستیں

تاہم نہ دیکھیں گوہرِ دنداں کی آب و تاب
ہنستے[2] بھی ہیں جو آپ تو منہ پر دھر آستیں

۱- وہ : پ -
۲- ہنستے بھی ہیں جو آپ تو رکھ منہ پر آستیں : پ ، ل۱ -

اس تیری ساعدِ ورقِ نقرہ وش کو شوخ
ایسا نہ ہو چُنت سے کرے مسطر آستیں
جس طرح کہکشاں میں ستارے ہوں جلوہ گر
یاں اشکِ خوں سے رکھتے ہیں سو اخگر آستیں
نکلا پڑے ہے کپڑوں سے وہ اس کا کیا عجب
ساعد سے مجھ پہ کھینچے اگر خنجر آستیں
اے مصحفی ! تو ایک غزل اور بھی تو ٹانک
تیرے قلم کی ہے ابھی پُر گوہر آستیں

۳۹۱

پہنے ہے بر میں جامہ وہ جب چن کر آستیں
اپنے ہمیں دکھاتی ہے تب جوہر آستیں
دل زخمی اس کے رنگِ حنا کا ہے دیکھ تو
رکھتا ہوں اشک سرخ سے شاہد در آستیں
تکمے رکھا کرو کہ میاں تنگ پوشوں کی
تکموں سے اور ہوتی ہے زیب آور آستیں
آگے ہی تیرے ہاتھوں سے ہم مر رہے ہیں جان
تو دم بہ دم چڑھائے ہے یہ کس پر آستیں
کر ذبح مجھ کو اے مرے قاتل تو شوق سے
پر بے شعور خوں میں نہ اپنی بھر آستیں
جب خاصہ کھانے بیٹھے ہے وہ اس کے خوان پر
آکر ملک ہلاتے ہیں اپنا سر آستیں
اے مصحفی ! تو کس لیے رہتا ہے گریہ ناک
آنکھوں پہ دیکھتا ہوں تری اکثر آستیں

۳۹۲

بے وفایانِ جہاں کس سے وفا کرتے ہیں
ہم لگے جاتے ہیں جو اُن سے برا کرتے ہیں

اور تو شغل کچھ آتا نہیں ہم کو لاچار
رات دن بیٹھے یوں[1] ہی گریہ کیا کرتے ہیں

تجھ سے ہم شاد بہت رہتے تھے اے کنجِ قفس
وقتِ رخصت ہے اب ہم تجھکو دعا کرتے ہیں

منہ چھپایا جو کل اس نے تو میں ہنس کر بولا
آپ کیا مجھ سے بھی پردے میں چھپا کرتے ہیں

دیکھیے صبح ہو کیا ، شام بنے کیا جی پر
ہم اسی سوچ میں دن رات رہا کرتے ہیں

جس پہ کی اس نے نظر چٹ اسے ووں ہی مارا
قدر انداز کوئی تیر خطا کرتے ہیں

ماہ و خورشید کا پھرنا نہیں دن رات عبث
آپ کو ، تجھ پہ مری جان فدا کرتے ہیں

جستجو میں تری ہم اے گلِ تر مدت سے
جوں صبا ہر طرف آوارہ پھرا کرتے ہیں

مصحفی ایک غزل اور بھی کہہ کیوں کہ میاں
قافیے تجھ سے بہت[2] خوب بندھا کرتے ہیں

۳۹۳

صبح اُٹھ ہم جو درِ خانہ کو وا کرتے ہیں
شام تک تیری ہی پھر راہ تکا کرتے ہیں

۱- ہوے : پ ل ۱ ، ۲ -
۲- میاں : ل ۲ -

بعد مرنے کے بھی ہے دائر و سائر بلبل
تب تو پر اس کے گلستاں میں اڑا کرتے ہیں

ان کو سمجھا کہ ترے کوچے کے رہنے والے
ہم پہ دن رات نت آوازے کسا کرتے ہیں

کیا نصیب ان کے بھی اچھے ہیں جو خنجر کے تلے
اپنے قاتل کی طرف دیکھ رہا کرتے ہیں

سببِ گریہ کہیں کیا یوں ہی ہم پل پل میں
خود بخود آبلہ سے پھوٹ بہا کرتے ہیں

نوبہار آئی ہے اب گل کی طرح ہم بھی نسیم
دھجیاں کرکے گریباں کو ہوا کرتے ہیں

شوق تو دیکھ کہ جس وقت تو سو جاتا ہے
ہم یہ آنکھیں ترے تلووں سے ملا کرتے ہیں

طرفہ عزت ہے ہماری بھی گلی میں تیری
گالیاں جو کوئی دیتا ہے سنا کرتے ہیں

باغ میں آ کہ ترے شوقِ ہم‌آغوشی میں
صبح اٹھ پھول بھی خمیازہ لیا کرتے ہیں

رخصتِ جنبشِ لب تو نہیں دیتا ہے ادب
دور سے ہم تجھے نظروں میں دعا کرتے ہیں

لے خبر اپنی ذرا جلد کہ یاں یاروں میں
تیغِ ابرو پہ تری خون ہوا کرتے ہیں

تھی جہاں **مصحفیِ** سوختہ جاں کی تربت
پھول لالے کے کئی واں سے اگا کرتے ہیں

۳۹۴

شب ہے اور آشنا کی باتیں ہیں
عشق کے[۱] ابتدا کی باتیں ہیں

حسن کی سر زمیں کا ہے مذکور
واں کی آب و ہوا کی باتیں ہیں

کیوں نہ ہر بات پر کوئی غش ہو
تیرے ناز و ادا کی باتیں ہیں

مجھ سے اور اتنا تلخ بولے تو
یہ بھی پیارے خدا کی باتیں ہیں

اس کی شرم و حیا کا نام نہ لو
کہ یہ شرم و حیا کی باتیں ہیں

ہم ہیں اور شب ہے اور وہی تا صبح
تیری زلفِ رسا کی باتیں ہیں

میرے نامے کو وہ نہیں پڑھتا
جس جگہ مدعا کی باتیں ہیں

یار نے **مصحفی** کا خون کیا
نہ ، غلط ، یہ حنا کی باتیں ہیں

۳۹۵

اس زلف میں عرق کے قطرے لٹک رہے ہیں
یا رات اندھیری میں (یہ) تارے چھٹک رہے ہیں

بیزاری اس چمن میں پھیلی ہے بس کہ ہر سو
گل دستِ باغباں سے دامن جھٹک رہے ہیں

---

۱ - کی : ل ۱ ، ۲ -

ہم سے ملائیاں ہیں ٹک جس نے اپنی آنکھیں
ہم اک نگہ پہ اس کی برسوں اٹک رہے ہیں

آیا ہے آخرِ شب کون اس چمن میں یا رب!
جیسے سپندِ مجمر غنچے چٹک رہے ہیں

اے **مصحفی**! وہ کوئی آتا ہے گھر سے باہر
ہم آستاں سے اس کے کیوں سر پٹک رہے ہیں

۳۹۶

بال زلفوں کے جب سنوارے ہیں
جان سے لاکھوں اس نے مارے ہیں

دشمنِ جاں ہوئے ہیں عالم کے
وے[۱] جو اک مہرباں ہمارے ہیں

اس کے اعضا کی کیا کروں تعریف
جیسے سانچے میں ڈھال آتارے ہیں

کیوں نہ چھاتی سے میں لگا رکھوں
داغ چھاتی کے مجھ کو پیارے ہیں

ق

وصل سے ان کے تو نہ ہو نومید
یہ جو کئی شب نما شرارے ہیں

مصحفی کیوں نہ ہاتھ آویں گے
ایسے کیا آسماں کے تارے ہیں

۳۹۷

کبھی جو یار کی پلکیں دو چار ہوتی ہیں
تو برچھیاں سی کلیجے کے پار ہوتی ہیں

---

۱ - وہ : پ ؛ ل ۱-

وہ دام ہے تری زلفِ ہزار خم صیاد
کہ جس کو دیکھ نگاہیں شکار ہوتی ہیں
دکھاتی ہیں ہمیں سیرِ شکوفۂ بادام
وے انکھڑیاں جو کبھو[1] پُر خمار ہوتی ہیں
میں بس کہ کانپتا رہتا ہوں وصل کی شب بھی
تری ہی زلفیں تری ہم کنار ہوتی ہیں
کب ایک جان کی عاشق کی اس کو پروا ہے
ہزار جانیں جس اوپر نثار ہوتی ہیں
بہار آئی کہاں ہے قفس میں ، اے صیاد !
یہ بلبلیں تو عبث بے قرار ہوتی ہیں
خدا کرے کہ مرے اور ترے ہوں روزِ وصال
جو چہلیں باغ میں فصلِ بہار ہوتی ہیں
انھیں کو دیکھ کے دل **مصحفی** پھسلتا ہے
جو صورتیں کہ ذرا آب‌دار ہوتی ہیں

۳۹۸

بلبل کے چہچہوں سے آزار کھینچتے ہیں
دو چار نالے ہم بھی ناچار کھینچتے ہیں
شب باز[2] کا تماشا یہ ہے جہاں جو دیکھو
پردے میں آپ بیٹھے وے تار کھینچتے ہیں

---

۱ - کبھی : ل ۲ -
۲ - شب باز : کٹھ پُتلی نچانے والا -
شب بازی : بہ موحدہ و زاے تازی - دو نوع است ؛ یکے آن کہ بھگیتہ ہا در شب بہ صور مختلفہ برآیند و امردان را بہ شکل
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ابرو کو ان کی گر ہم کہتے ہیں راست خم ہے
اس بات سے وہ کٹ کر تلوار کھینچتے ہیں

دیتے ہیں دل میں میرے پیکاں اچوک خوباں
چٹکی سے تیر کا جب سوفار کھینچتے ہیں

جو وادیِ طلب میں دن رات قطرہ زن[۱] ہیں
پائے پُر آبلہ سے کب خار کھینچتے ہیں

دشتِ جنوں سے جب میں ناگاہ اٹھ چلوں ہوں
دامن پکڑ کے میرا سب خار کھینچتے ہیں

ساقی بغیر جب ہم جاتے ہیں سیر کرنے
خمیازہ ہی چمن میں ہر بار کھینچتے ہیں

کیا نارسا ہیں طالع ان کے جو اس صنم کی
موئے کمر سمجھ کر زنّار کھینچتے ہیں

میری اور آسماں کی ہے پیل کی لڑائی
گو لوگ درمیاں میں دیوار کھینچتے ہیں

وہ ہم سے گر خفا ہیں تو ہم بھی **مصحفی** اب
لوہے کی درمیاں میں دیوار کھینچتے ہیں

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

زنان متشکل سازند ۔ و دوم آں کہ خیمہ برپا کردہ اشکالے منقوشہ صفحہ چرم و کاغذ در نظر جلوہ دہند ، و کنایہ از مکر و فریب—سعید اشرف :

تا سحر با عشق بازاں حرف‌ها در پردہ داشت
شمعِ فانوسِ خیالِ آں دلبرِ شب بازِ من

(بہار عجم ، جلد دوم ، صفحہ ۱۵۳ ، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۹ع)

۱ ۔ قطرہ زن : دوندہ و تیز رفتار ۔ (غیاث‌اللغات ۳۴۲)

۳۹۹

زبس کہ زلف کا شب تھا خیال میرے تئیں
تمام روز رہا ہے ملال میرے تئیں
حنا کی طرح کروں میں بھی اس کی پابوسی
خدا نے دی نہیں اتنی مجال میرے تئیں
ہوا وہ دشمنِ جاں مارے بدگمانی کے
کسی نے گر کبھی پایا بحال میرے تئیں
تنِ نزار سے ہوں ننگ اپنی ہستی کا
کیا ہے بخت نے چینی کا بال میرے تئیں
زبس کہ سوکھ کے کانٹا ہوا ہوں میں غم سے
کہیں ہیں لوگ زمیں کا ہلال میرے تئیں
بھلا تو ساتھ تو چلتا مرے جنازے کے
نہ آئی موت بھی روزِ وصال میرے تئیں
خدا ہی جانے یہ کیا رنگ ہے کہ صبح سے آج
وے انکھڑیاں نظر آتی ہیں لال میرے تئیں
کہے ہے کبک تری چال پر نظر کر کے
ہزار حیف نہ آئی یہ چال میرے تئیں
میں کیا سوال کروں اس سے، سخت حیراں ہوں
کہ ہائے کر نہیں آتا سوال میرے تئیں
نگاہِ لطف جو اس کی کبھی ہوئی مجھ پر
تو دل میں گزرے ہزار احتمال میرے تئیں
زبس کہ مستِ مۓ ساغرِ تصوف ہوں
نہیں خیالِ حرام و حلال میرے تئیں

قدم زمیں پہ نہ رکھے ، مجھے یہ حیرت ہے
کہ اس نے کیوں کہ کیا پائمال میرے تئیں
کبھی وہ ماہ بھی آوے گا ، اب کے گزرا ہے
اسی خیال میں مارا یہ سال میرے تئیں
یہ کیا سبب ہے جو آج اتنا منہ تھتھایا ہے
بہت خفا ہے تو لے مار ڈال میرے تئیں
اگرچہ مصحفی میں خارِ خشک ہوں لیکن
کیا ہے سایۂ گل نے نہال میرے تئیں

۲۰۰

ہم جن بتوں کی خاطر زنّار باندھتے ہیں
وے قتل پر ہمارے تلوار باندھتے ہیں
مضمونِ زلف ازبس پیچیدہ ہے ہم اس کو
سو بار کھولتے ہیں سو بار باندھتے ہیں
ساون ہمارے آگے ۔بے طرح منہ چڑھا ہے
رونے کا[1] اپنے ہم بھی اب تار باندھتے ہیں
کیا خود نما[2] ہیں یارو یہ جامہ زیب لڑکے
آئینہ رکھ کے آگے دستار باندھتے ہیں
اب تک اکڑ وہی ہے ان نازنیں بتوں کی
پٹکا کمر سے اپنی بل‌دار باندھتے ہیں
دیکھا ہے کیا جو ہردم رفتار کو تمھاری
کبکِ دری کی شاعر رفتار باندھتے ہیں

---

۱ - رونے کا ہم بھی یارو : پ ، ل ۱ -
۲ - کیا خود نما ہوے ہیں یہ جامہ زیب لڑکے : پٹنہ ، ل ۱ ، ۲ -

تلوار تیری چلتی غیروں پہ کیوں کہ دیکھیں
آنکھوں پہ اپنی پٹّی ناچار باندھتے ہیں

تقلید سے نہ ہووے نامرد مرد ہرگز
دیکھا ہے ہیجڑے بھی ہتھیار باندھتے ہیں

آگاہ وے[1] نہیں ہیں کیا فنِ شاعری سے
مضموں چرا کے میرے جو یار باندھتے ہیں

جی کیوں چلا نہ جاوے ہر شعر کی ادا پر
اے مصحفی ہم اس کی رفتار باندھتے ہیں

۲۰۱

کس مست کی لوہو سی آنکھیں نظر آئی ہیں
جو یارو مری آنکھیں پھر جوش کر آئی ہیں

ہر لحظہ قدم رکھتے پڑتی ہیں ترے پاؤں
ان روزوں تری زلفیں کچھ راہ پر آئی ہیں

جب گھر سے تو نکلا ہے بن ٹھن کے کبھی باہر
سو منتظروں کی تب امیدیں بر آئی ہیں

کہنے کو تو چھوٹی ہیں زلفیں تری پر تو نے
جب کھول دیا ہے تو وے[2] تا کمر آئی ہیں

دل یار کے چنگل میں پاتا ہوں سدا اپنا
جس دن سے تری پلکیں سینے میں در آئی ہیں

جانے کی خبر/میں نے جب/ تیرے سنی ہے تب
کچھ منہ سے نہیں نکلا پر آنکھیں بھر آئی ہیں

---

۱ - وہ : پ -
۲ - وہ : پ -

جب نام ترا نکلا منہ سے ہے مرے ، ووں ہی
پلکوں سے کئی بوندیں منہ پر اُتر آئی ہیں

اک وضع جو ہوتی تو ہم اس کا بیاں کرتے
دلّی میں ہمیں لاکھوں وضعیں نظر آئی ہیں

اب **مصحفی** حجرے سے نکلے ہے جو کم باہر
ان روزوں کہیں اُس کی آنکھیں مگر آئی ہیں

۴۰۲

مخلوق ہوں یا خالقِ مخلوق نما ہوں
معلوم نہیں مجھ کو کہ میں کون ہوں کیا ہوں

ہوں شاہدِ تنزیہ کے رخسار کا پردہ
یاخود ہی میں شاہد ہوں کہ پردے میں چھپا ہوں

ہے مجھ سے گریبانِ گلِ صبح معطر
میں عطرِ نسیمِ چمن و بادِ صبا ہوں

گوشِ شنوا ہو تو مرے رمز کو سمجھے
حق یہ ہے کہ میں سازِ حقیقت کی نوا ہوں

ہستی کو مری ہستیِ عالم نہ سمجھنا
ہوں ہست تو پر ہستیِ عالم سے جدا ہوں

ہوں سینۂ عشاق میں سوزِ جگر و دل
اور دیدۂ معشوقوں میں کیا ناز و ادا ہوں

یہ کیا ہے کہ مجھ پر مرا عقدہ نہیں کھلتا
ہر چند کہ خود عقدہ و خود عقدہ کشا ہوں

اے **مصحفی** شانیں ہیں مری جلوہ گری میں
ہر رنگ میں میں مظہرِ آثارِ خدا ہوں

۴۰۳

ازبس تری ادائیں مجھ کو کڑھاتیاں ہیں
جب دیکھتا ہوں تجھ کو آنکھیں بھر آتیاں ہیں
میں چونک چونک اٹھوں ہوں ناگن سی تیری زلفیں
جب آ کے خواب میں بھی مجھ کو ڈراتیاں ہیں
تم واں پڑے پھرو ہو گلیوں میں بے خبر سے
رفتار پر تمھاری یاں جانیں جاتیاں ہیں
کیوں کر کہ[1] میں نہ باندھوں مضمونِ تازہ ہردم
سو باتیں تیری آنکھیں مجھ کو سجھاتیاں ہیں
اے مصحفی ! تو اس کو مت دیکھ چوری چوری
کم بخت یہ نگاہیں تہمت لگاتیاں ہیں

۴۰۴

کوچے میں عافیت کے کہاں بیٹھتا ہوں میں
فتنہ اٹھے ہے ایک ، جہاں بیٹھتا ہوں میں
آتا ہے جو کوئی تری مجلس میں ، تجھ سے یار
کہتا ہے یہ ادب سے یہاں بیٹھتا ہوں میں
کیا ہوگیا ہے مجھ کو جو اس عقل و ہوش پر
تیرِ بلا کی جائے نشاں بیٹھتا ہوں میں
کیا خو بری ہے مجھ میں کہ نقشِ قدم کی طرح
ہو رہتا ہوں وہیں کا جہاں بیٹھتا ہوں میں
کہتا ہے تیرِ غمزہ یہی مجھ سے ہر گھڑی
ہاں پہلوے شکستہ دلاں بیٹھتا ہوں میں

---

۱ - کس طرح : پ

صیدِ مراد کی ہی کمیں گاہ میں مدام
راتوں کو لے کے تیر و کماں بیٹھتا ہوں میں
مضمونِ بے دماغیِ عالم پہ کر نظر
پردے میں بوے گل کے نہاں بیٹھتا ہوں میں
دل رک گیا ہے سب سے مرا اب تو **مصحفی**
دروازہ بند کر کے میاں بیٹھتا ہوں میں

۴۰۵

ہم ترے کوچے سے ناچار چلے جاتے ہیں
جی تو کرتا نہیں جانے کو ، ولے جاتے ہیں
چال چلتا ہے مری جاں جو تو اٹھکیلی سے
دل ترے پاؤں تلے مفت ملے جاتے ہیں
آنسوؤں کا مجھے اپنے ہے نہایت افسوس
خاک کے بیچ یہ موتی سے رُلے جاتے ہیں
دیکھ زخمی مجھے اس تیغ کا ڈر کے مارے
سامنے سے مرے احباب ٹلے جاتے ہیں
جی میں کیا ان کے دمِ نزع گزرتی ہوگی
یاں سے جاتے ہوے جو حسرتیں لے جاتے ہیں
کیا تماشا نظر آتا ہے انھیں حیراں ہوں
یار کیوں خاک کے پردے میں چلے جاتے ہیں
میں ہی منہ ڈھانپ کے روتا نہیں کچھ میرے لیے
آنسو واں اس کے بھی برقعے میں ڈھلے جاتے ہیں
ایک عالم کا گزرگاہ ہے دروازۂ مرگ
جس میں ہو کر کے برے اور بھلے جاتے ہیں

کیوں کہ اس آتشِ سوزاں کے مقابل رہیے
مصحفی اپنے تو تیور ہی جلے جاتے ہیں

۴۰۶

غیر کے گھر تو نہ رہ رات کو مہمان کہیں
تا نہ اس بات کا چرچا ہو مری جان کہیں

اب تلک غنچے کی گردن ہے جھکی خجلت سے
اس نے دیکھے تھے ترے گوے[1] گریبان کہیں

رازِ دل اس سے کہا میں تو ولے یہ ڈر ہے
کہ مرے راز کو کہہ دے نہ وہ نادان کہیں

اے پریشانیِ زلفِ صنمِ کافر کیش
کیجیو تو نہ مرے دل کو پریشان کہیں

دل کی بے چینی سے میں سخت بہ تنگ آیا ہوں
چین پڑتا ہی نہیں ہے اسے اک آن کہیں

دھانی جوڑے نے ترے کھیت رکھا ہے مجھ کو
سبز رنگ اتنے تو دیکھے نہیں میں دھان کہیں

منع کس واسطے کرتا ہے میں تیرے صدقے
عید کے دن تو مجھے ہونے دے قربان کہیں

دردِ دل جا کے میں کہہ لوں ابھی در کے نزدیک
ایک ساعت کو بھی اٹھ جاوے جو دربان کہیں

مصحفی ایک غزل اور ابھی لکھتا ہوں
یہ تو بیتیں کئی میں نے بہت آسان کہیں

---

۱ ۔ گوے گریباں : (ف) مذکر ۔ گریبان کا تکمہ ۔
(نوراللغات ، ج ۴ ، صفحہ ۱۰۳)

۴۰۷

بال بکھرے ہیں کہیں ، زلف پریشان کہیں
یارو از بہرِ خدا دیکھی ہے یہ آن کہیں
قتلِ عاشق پہ کمر باندھ نہ آ جانے دے
بانکپن خوب نہیں اتنا کہا مان کہیں
ایسا دیوانہ رکھے جاسے کا اپنے کیا ہوش
جس کا دامن ہو کہیں اور گریبان کہیں
کیا فسوں پڑھ کے خدا جانے کھلا دے تجھ کو
غیر کے ہاتھ سے تو کھائیو مت پان کہیں
تو تو اس شہر سے جاتا ہے ولے یہ ڈر ہے
ہووے جانے سے ترے شہر نہ ویران کہیں
خلشِ دل کے ہیں آثار برے ڈرتا ہوں
رہ گیا ہو نہ ترے تیر کا پیکان کہیں
کب تلک کوہ و بیاباں میں پھروں میں اے کاش
جستجو ہی میں نکل جاوے مرا جان کہیں
خط لکھا آپ نے میرے تئیں بے سرنامہ
خط کے لکھنے کا بھلا ہو ہے یہ عنوان کہیں
کیا کروں دردِ محبت کی دوا حیراں ہوں
مجھ کو ملتا نہیں اس درد کا درمان کہیں
آئنے میں تو بہت اپنی طرف دیکھتا[1] ہے
دل کو اپنے نہ گنوا بیٹھیو نادان کہیں

---

۱ - دیکھے ہے : ل ۱

ابر کی طرح سے آتے ہیں بھرے دیدۂ تر
مجھ کو یہ ڈر ہے کہ لاویں نہ یہ طوفان کہیں
اک ذرا خاکِ شہیداں سے سنبھل کر چلنا
دیکھیو خوں میں نہ ڈوبے زہِ[1] داماں کہیں
مصحفی کے تئیں تم قتل عبث کرتے ہو
پیدا ہوتے ہیں بھلا ایسے بھی انسان کہیں

۴۰۸

گر ہو طپنچہ بند وہ رشکِ فرنگیاں
بانکے مغل بچے نہ کریں خانہ جنگیاں
شوخی مزاج اس کے سے اب تک گئی نہیں
ویسے ہی بانکپن ہیں وہی غولہ[2] رنگیاں
بلبل کے اشکِ سرخ نے یہ کیا غضب کیا
جو تیلیاں قفس کی سبھی خوں میں رنگیاں

---

۱ - زہ : ڈوری ، فیتہ جو دامن آستیں اور گریباں کے کنارے ٹانکتے ہیں - (نوراللغات ج ۳ ، ص ۱۶۱)

۲ - غولہ : بہ فتح اول و سکون واو و فتح لام و ہاے مدورہ زدہ ، بہ معنی مردم بے عقل و خام و کودن آمدہ ۔
(ہفت قلزم ، ج ۴ ، ص ۳۰)

مؤلف فرہنگ عمید (صفحات ۸۵۲ ، ۸۵۳) بالضم غین لکھتے ہیں : بے عقل ، کودن ، بد اندام ، غولہ دنگ ہم می گویند ۔
(از فائق)

گردوں اگرچہ دن کو غزالِ سیاہ ہے
پر شب کو میرے ساتھ کرے ہے پلنگیاں

دیکھا نہ ہوگا وہ کبھی بیژن[1] نے چاہ میں
جو دن مجھے دکھاتی ہیں قسمت کی تنگیاں

عارض پہ تیرے جوششِ خطِ سیاہ ہے
یا روم پر چڑھ آئی ہے یہ فوجِ زنگیاں

کیا جانے کس سے بگڑی ہے دریا میں مصحفی
لہروں کے ہاتھوں میں ہیں جو تلواریں ننگیاں

ردیف و

۲۰۹

اس گفتگو کا اور ہی انداز ہے سنو
پردے میں 'نہ فلک کے یہ آواز ہے سنو

بسم اللہ کتابِ دو عالم ہے حرفِ عشق
اس قصے کا یہیں سے تو آغاز ہے سنو

تنہا نہ حق کو سولی پہ منصور کہہ گیا
ہر ذرے کی زباں پہ یہی راز ہے سنو

کنجِ قفس میں دیکھ کے کہتی ہے مجھکو خلق
اس مرغ کو بھی حسرتِ پرواز ہے سنو

بے اعتنائی خوب نہیں اتنی میری جاں
نالے کو ٹک سرے بھی یہ کیا ناز ہے سنو

---

۱ - بیژن : بہ اول مکسور و یاے مجہول و زاے عجمی - نام پسر گیو ، خواہر زادۂ رستم ، و عاشق منیزہ دختر افراسیاب - (شمس اللغات ، ج ۱ ، ص ۱۸۵)

مرغِ چمن تو بولے ہی ہے اس بہار میں
مرغِ قفس بھی زمزمہ پرداز ہے سنو
دیکھو نہ مصحفی کی غزل کو بہ چشمِ کم
اے یارو ! یہ تو سحر ہے ، اعجاز ہے ، سنو

۴۱۰

دل ہے لبریزِ تمنّا دیکھیو
مے سی چھلکے ہے یہ مینا دیکھیو
چشم و ابرو عالمِ تصویر ہے
اس بتِ کافر کا نقشا دیکھیو
سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں تو کہے
ان خوش اندامون کے اعضا دیکھیو
اٹھ گیا گر اس کے مکھڑے سے نقاب
تم مرا اس دم تماشا دیکھیو
مصحفی رو پاتے ہی اس شوخ کا
لگ چلا ہے اس سے کیسا دیکھیو

۴۱۱

آتا ہے کس انداز سے ، ٹک[۱] ناز تو دیکھو
کس دھج سے قدم پڑتا ہے ، انداز تو دیکھو
طاؤس پری جلوے کو ٹھکرا کے چلے ہے
اندازِ خرامِ بتِ طناز تو دیکھو
یک جنبشِ لب اس کی نے لاکھوں کو جلایا
عیسیٰ کو یہ قدرت تھی تم اعجاز تو دیکھو

---

۱ ۔ تم : سرور

کرتا ہوں میں دزدیدہ نظر گر کبھی اُس پر
نظروں میں پرکھ لے ہے نظر باز تو دیکھو

میں کنگرۂ عرش سے پر مار کے گزرا
اللہ رے رسائی مری پرواز تو دیکھو

اے وائے کہ اس سعی پر اپنی کبھی اُس سے
سازش نہ ہوئی طالعِ ناساز تو دیکھو

کیا بولنے میں اُس بتِ کافر کے ادا ہے
شیریں سخنی اک طرف، آواز تو دیکھو

ابتر ہے یہ دیوان تو میاں مصحفی سارا
انجام کی کیا کہتے ہو، آغاز تو دیکھو

۴۱۲

بہارِ گل کی خوبی ہم دل افگاروں سے مت پوچھو
مزہ گلگشت کا گلشن کے بیماروں سے مت پوچھو

ہزاروں طرح دل لینے کے تئیں آغازِ الفت میں
جو آفت ہم پر آئی ان طرح داروں سے مت پوچھو

رہائی نام ہے کس چیز کا اور کس کو کہتے ہیں
یہ بات اے دوستاں ہم سے گرفتاروں سے مت پوچھو

تجلی نام شعلہ رات اس گلشن میں دائر تھا
پڑی پھولوں پہ بجلی کس کے رخساروں سے مت پوچھو

مرا جی جانتا ہے یا میں جانوں ہوں، وہ کیا جانے
جو غم گزرے ہیں مجھ پر میرے غم خواروں سے مت پوچھو

کہا اک بار میں نے حالِ دل اپنا میاں تم سے
یہ کیا خو ہے تمھاری اتنی تکراروں سے مت پوچھو

جو کچھ ہم پر گزرتی ہے وہ پوچھو ہم سے کہہ دیں گے
خدا کے واسطے ان کبک رفتاروں سے مت پوچھو

ق

حسن کا شعر ہے میاں مصحفی کیا حسب ِ حال اپنے
سنو تم ہم سے اس کو خانماں داروں سے مت پوچھو
گئے وے دن جو رہتے تھے جہاں آباد میں ہم بھی
خرابی شہر کی صحرا کے آواروں سے مت پوچھو

۴۱۳

گر اپنا حال غم سے ترے تنگ ہے تو ہو
آنکھوں کا اشک ِ سرخ سے یہ رنگ ہے تو ہو
اپنے تو گھر میں نالہ و زاری ہے روز و شب
مجلس میں اس کی شغل ِ نے و چنگ ہے تو ہو
تیغ ِ جہاں کو نہ لگے تیری مورچہ[1]
گر دل کے آئنے پہ مرے زنگ ہے تو ہو
ہم بت کے پوجنے کو سمجھتے ہیں اپنا فخر
اس سے خدا پرستوں کو گر ننگ ہے تو ہو
کعبے کا جانا فرض نہیں ہم کو مصحفی
کعبہ جو ہم سے سیکڑوں فرسنگ ہے تو ہو

۴۱۴

(دیکھ) سر تا بہ قدم مائل بیداد ہے سرو
غم میں اس قد کے اک آہ ِ دل ِ ناشاد ہے سرو

---

۱ - مورچہ : زنگ -

قد کشاں باغ میں جس روز کہ وہ آیا تھا
ہائے وہ روز قیامت کا تجھے یاد ہے سرو

بند ہے خاکِ چمن سے رگ و ریشہ اس کا
پر غلط ہے جو یہ کہتے ہیں کہ آزاد ہے سرو

حق تعالیٰ تجھے اس باغ میں سرسبز رکھے
تیرے قدموں ہی کی دولت چمن آباد ہے سرو

جوشِ خوں کا مرے ہوتا نہیں اس پر بھی علاج
گرچہ ہر برگ ترا نشترِ فصّاد ہے سرو

رو دیا میں نے جو قُمری نے کہا وقتِ سحر
بھر کے اک آہ، ترے ہاتھوں سے فریاد ہے سرو

گرچہ ہر نخل جدا[1] باغ میں سر کھینچے ہے
پر جو دیکھا تو قیامت تری استاد ہے سرو

ہے غلط قد کو ترے سرو سے نسبت دینا
سایہ قد کا ترے اے شوخ پری‌زاد ہے سرو

کیجو آزردہ نہ قمری کو، ترے سر پر سے
اُڑ گئی وہ تو یہ خوبی تری برباد ہے سرو

قدِ نوخیز کو اس طفل کی کب پہنچے ہے
گرچہ رعنائی میں اے **مصحفی** استاد ہے سرو

۲۱۵

آج جو صبح سے تم چیں بہ جبیں بیٹھے ہو
بے جگہ رات مگر جا کے کہیں بیٹھے ہو

ہو جفا جوئیِ گردوں سے جو اتنے غافل
ایسے کس فکر میں اے اہلِ زمیں بیٹھے ہو

---

۱ - جو آ: پ، ل ۱، ۲ -

کہیں دیکھا ہے یہ غم ، تم بھی تو آخر یارو
سال ہا با غم و اندوہ قریں بیٹھے ہو

مر گیا کون سا دل سوز تمھارا عاشق
کس کے ماتم میں مری جان ! حزیں بیٹھے ہو

تم گرفتاریِ خاطر کو میاں کیا سمجھو
ابھی روزِ بدِ عاشق میں نہیں بیٹھے ہو

حلقۂ بزم کی نت زیب رہی ہے تم سے
تم جہاں بیٹھے ہو واں مثلِ نگیں بیٹھے ہو

ق

کوچۂ یار میں کل چھوڑ گیا تھا تم کو
آج دیکھا تو اسی طرح غمیں بیٹھے ہو

میں یہ جانا تھا کہیں گھر کو سدھارے ہو گے
کیا میاں مصحفی تم تب کے یہیں بیٹھے ہو ؟

۴۱۶

اپنی پیشانی پہ تم مالشِ صندل نہ کرو
دردِ سر مجھ کو نہ دو ، جی مرا بے کل نہ کرو

کیا قیامت ہے کہ تم خون کرو عالم کا
اور نظر جانبِ رنگینیِ مقتل نہ کرو

تیرہ روزی کو مری سرمہ کفایت ہے میاں
ٹک خدا سے ہی ڈرو آنکھوں میں کاجل نہ کرو

حاکمِ شہر اگر میں ہوں تو اتنا کہہ دوں
کہ کوئی شہر میں آئینے کو صیقل نہ کرو

میں بھی موجود ہوں اور تم بھی ہو ، یہ تیغ ، یہ طشت
قہر ہے اب بھی جو جھگڑا مرا فیصل نہ کرو

یا علی ! مصحفی پھر جائے بھلا کس کے پاس
اس کی مشکل کے تئیں تم بھی اگر حل نہ کرو

۴۱۷

رہنے دو مرے سینے میں پیکاں کو نہ چھیڑو
از بہرِ خدا ناوکِ جاناں کو نہ چھیڑو

ٹک رحم کرو چاکِ گریبان پہ میرے
یارو کوئی اس شوخ کے داماں کو نہ چھیڑو

اس دھوم سے آئی ہے بہار اب کے کہ ہر سُو
قدغن ہے کہ برگِ گل و ریحاں کو نہ چھیڑو

یہ وہ نہیں ناسور کہ ہو بند کسی سے
بہنے دو مرے دیدۂ گریاں کو نہ چھیڑو

خاطر کو پریشاں نہ کرو اور بھی میری
ہر لحظہ میاں زلفِ پریشاں کو نہ چھیڑو

روٹھا ہوں جو میں اس سے تو من لوں گا پھر آپھی
جاؤ کوئی مجھ تازہ پشیماں کو نہ چھیڑو

وہ فتنہ نہیں ہے کہ وہ تہمت نہ لگاوے
ہر چند کہ اُس فتنۂ دوراں کو نہ چھیڑو

اے ناصحو ! کچھ فکر کرو چاکِ جگر کا
بیہودہ مرے چاکِ گریباں کو نہ چھیڑو

زلفیں تری زاہد سے الجھتی ہیں ، تو آنکھیں
کہتی ہیں کہ اس مردِ مسلماں کو نہ چھیڑو

دُکھتا ہے یہ دل اور بھی فریاد کرے ہے
مت ہاتھ لگاؤ دلِ نالاں کو نہ چھیڑو

رہنے دو پڑا مصحفیِ خاک بسر کو
اس غم‌زدۂ بے سر و ساماں کو نہ چھیڑو

۴۱۸

زلفوں کو کیوں کیا ہے پریشان ، یہ کہو
کیا مدعا ہے اس سے مری جان ، یہ کہو

باران سے میرے اشک کو نسبت نہ دو کوئی
نازل ہوا ہے عرش سے طوفان یہ کہو

اب تک ہے انکھڑیوں میں تمھاری خمار سا
کس کے رہے تھے رات کو مہمان یہ کہو

دیر و حرم کی راہ میں حیراں ہے میری عقل
جاؤں کدھر کو گبر و مسلمان ، یہ کہو

کس پر سجی ہے تم نے میاں تیغِ خوش غلاف
ہے ایسا کس کے قتل کا سامان یہ کہو

اس خستہ دل کو دوکھتے ہو تم جو دوستو
دیکھی ہے اس کی جنبش مژگان یہ کہو

جاؤں چمن میں اب کے تو پوچھوں گلوں سے میں
کس پر ہوے ہو چاکِ گریبان یہ کہو

نکلے ہو آج آئنہ خانے سے بے حواس
نظروں میں کھب گئی ہے کوئی آن یہ کہو

نرگس کی طرح نکلے ہے اک تم سے رفتگی
اے دیدہ ! اتنے کس کے ہو حیران یہ کہو

آخر تمھارے ناز کا کشتہ ہے **مصحفی**
کیوں ہو گئے ہو جان کے انجان یہ کہو

۴۱۹

ہمارے حال پر اس کی نگاہ کیوں کر ہو
الٰہی دیکھیے عفوِ گناہ کیوں کر ہو
خدا نے تجھ کو بنایا ہے سنگ دل اے بت !
بھلا کسو کی ترے دل میں راہ کیوں کر ہو
نہ در سے جھانکے کبھی وہ[1] نہ بام پر آوے
ہماری اس کی ملاقات آہ کیوں کر ہو
جہاں کہ ہو دمِ شمشیرِ تیغِ تیز بلند
زباں بریدہ کوئی داد خواہ کیوں کر ہو
تمھیں تو غیروں سے الفت ہے ، تم ہو ہرجائی
تمھارے ساتھ ہمارا نباہ کیوں کر ہو
ہنوز ملنے کی صورت نظر نہیں آتی
اس آرزو میں بسر سال و ماہ کیوں کر ہو
یہ کیا سبب ہے میاں **مصحفی** ! بتاؤ تو
تم اس گلی میں بہ حالِ تباہ کیوں کر ہو

۴۲۰

تو کہے[2] سو بار اگر اپنی زباں سے ، دور ہو
یہ نہیں ممکن فقیر اس آستاں سے دور ہو
ہجر میں اس بے‌وفا کے مجھ پہ جو گزرے ہے ہائے
یہ وہی جانے جو اپنے دلستاں سے دور ہو

---

۱ - اور : پ
۲ - تم کہو : پ

گو کہ دن ہووے بڑا پر ایسی منزل کے تئیں
کس طرح پہنچے جو کوسوں کارواں سے دور ہو
قصۂ دردِ غریبی اُس سے پوچھا چاہیے
موسمِ گل میں جو اپنے آشیاں سے دور ہو
کل گیا تنہا اُس کے کوچے میں وہ مجھ کو دیکھ کر
غصے ہو کہنے لگا "چل بے یہاں سے دور ہو"
گو نہ اٹھے تو نہ اٹھے اُس کے چہرے سے نقاب
یہ حجابِ چشم یارب درمیاں سے دور ہو
مصحفی تو مر نہیں جاتا کہ تا اے ننگِ عشق
نام بدنامی کہیں اس دودماں سے دور ہو

۴۲۱

آپھی آ کتا کے جو تیرے آستاں سے دور ہو
تو نہ کہہ پیارے اسے اپنی زباں سے 'دور ہو'
کس طرح وہم و گماں میں آدمی کے آسکے
وہ منزہ ذات جو وہم و گماں سے دور ہو
یاس کو اس بلبلِ بے پر کی دیکھا چاہیے
آتشِ گل جس کے کچھ اک آشیاں سے دور ہو
کیوں نہ راتوں کے تئیں اے ماہ تیرا منہ تکے
جو کوئی اپنے مہ نامہرباں سے دور ہو
ہے مرے سینے میں آتش دل کے ہاتھوں سے بھری
چین سے سوؤں جو یہ دل درمیاں سے دور ہو
ایک تنکا بھی نہ ڈھونڈا پائیے افسوس ہے
آشیاں بلبل کا یوں اس گلستاں سے دور ہو

مصحفی روئے زمیں پر یوں نہیں رہنے کا لطف
آسماں کو دور کر یا آسماں سے دور ہو

۴۲۲

نہ وہ آپ آوے نہ قاصد درمیاں سے دور ہو
دل کی بےتابی مرے یارب کہاں سے دور ہو
اس بیاباں میں الٰہی قیس کا ہووے گزار
جس بیاباں میں کہ ناقہ سارباں سے دور ہو
کب روا ہے یہ کہ ایسی فصلِ گل میں باغباں
بلبلِ بے چارہ اپنے آشیاں سے دور ہو
میں جو کھینچوں ہوں بغل میں اس کو یوں بھاگے ہے وہ
جیسے کھنچ کر تیر آغوشِ کماں سے دور ہو
جس نشاں پر تیر پھینکے تک کے وہ ابرو کماں
کیا عجب داغِ سیاہی اس نشاں سے دور ہو
پان کھا کر وہ بتِ رنگیں ادا اے مصحفی
مجھ سے کل کہتا گیا یوں ، چل بے یاں سے دور ہو
اب کے گر آیا تو میں بھی منہ سے اس کے منہ لگا
ایسے بوسے لوں کہ سرخی رنگِ پاں سے دور ہو

۴۲۳

ہم[1] جی سے خفا بیٹھے ہیں آؤ نہ (نا) ادھر کو
تلوار لیے ہاتھ میں جاتے ہو کدھر کو
ڈرتا ہوں کہ گرد آپ کے دامن پہ نہ بیٹھے
ٹھکرائے ہوئے چلتے ہو اس خاک بسر کو

---

۱ ۔ آؤ نہ ادھر کاٹ لو تن سے میرے سر کو : پ

تختہ ہو چمن کا مرا ہر تختۂ دامن
دامن میں اگر جمع کروں لختِ جگر کو

کاکل کی تری یاد میں رویا ہی کروں ہوں
کھل جاتی ہے جب آنکھ مری پچھلے پہر کو

محبوبی کا از بس کہ تو محبوب ہوا ہے
لپٹے ہے تری زلف بھی اب تیری کمر کو

جب مل گیا منہ پھیر لیا اس کی طرف سے
نالے سے مرے ننگ رہا بس کہ اثر کو

یوں لختِ دل اور اشک ہیں مژگاں پہ مری جمع
اک تاگے میں جوں دیویں گرہ لعل و گہر کو

گھائلِ کا ترے داغ نگہباں ہے ، جس طرح
زخمی کے گلے باندھیں ہیں طاؤس کے پر کو

گھر جانے کا مت نام لے جی دھڑکے ہے میرا
میں خاک رہوں گا تو اگر جائے گا گھر کو

تیرے لب و دنداں کی مزے داریاں پیارے
ڈرتا ہوں کہ رسوا نہ کریں شیر و شکر کو

اے مصحفی میں آہ کی سوزن سے شبِ وصل
کرتا ہوں رفو ، چاک گریبانِ سحر کو

۴۲۴

نامِ عشق اب تو لیا اس میں بھلا ہو یا نہ ہو
خود وفا کرنی ہمیں ، اس میں وفا ہو یا نہ ہو

خوب‌رو لڑکے کا ہم کو ٹک نظر آنا ہے شرط
پھر تو دو دو باتیں کرنی آشنا ہو یا نہ ہو

وے نہیں کچھ ہم کو/ بھاگیں/دیکھ کرانبوہِ خلق
ہم کو بھی جا بیٹھنا مجلس میں جا ہو یا نہ ہو

ہائے رے زلفیں تری اور ہائے رے وہ لمبے بال
دیکھ دل ان کو گرفتارِ بلا ہو یا نہ ہو

جب کہ تو گالی سوا پیارے کرے ہرگز نہ بات
تو ہی کہہ باتوں سے تیری جی برا ہو یا نہ ہو

ڈھب کڈھب اُس کو لگانی تیغ ہر دم مصحفی
اس میں سر مقتول کا تن سے جدا ہو یا نہ ہو

۴۲۵

مجھے کر قتل ناحق آپ کو بدنام کرتے ہو
میاں کیوں کھینچتے ہو تیغ کو کیا کام کرتے ہو

دکھاتے ہو اگر گاہے سرِ دیوار سے مکھڑا
تو پھر ووں ہی نہاں جوں آفتابِ بام کرتے ہو

ستم کرتے ہو اور بیداد یہ ہم رو سیاہوں پر
کہ زلفوں کو نقابِ عارضِ گلفام کرتے ہو

نگاہیں تو بہم لڑیاں ہیں پر کچھ شرم کے مارے
نہ ہم پیغام کرتے ہیں نہ تم پیغام کرتے ہو

تمھیں اے دیدہ و دل آفریں اپنی تو کیا کہیے
خیال اک ایسے ہی وحشی کا ہر شب رام کرتے ہو

دوانا ہوں غرض میں اس تمھاری چلبلاہٹ کا
نہ مجھ کو سونے دیتے ہو نہ خود آرام کرتے ہو

جو ملنا ہے تو اک شب مصحفی سے آکے مل جاؤ
میاں جھوٹی یہ کیا ہر روز صبح و شام کرتے ہو

۴۲۶

زبس آٹھوں پہر گھیرے ہی رہتی ہے حیا تجھ کو
نہیں پاتا میں اپنے ساتھ ہر گز آشنا تجھ کو

حرم میں جاوے اے محرم تو اتنا اس سے کہہ دیجو
پسِ دیوار بیٹھا کوئی دیتا ہے دعا تجھ کو

ترا کشتہ ہوں میں اے نونہالِ باغِ رعنائی
کہ اس بوٹے سے قد پر کتنی پھبتی ہے قبا تجھ کو

مرے دل کی پریشانی کو سمجھے اپنی زلفوں سے
نہیں اتنا بھی ہوش اے دشمنِ جاں کیا بھلا تجھ کو

رہا ویسا ہی تو بیگانہ نامِ آشنائی سے
نہ لائی آہ میری بر سرِ مہر و وفا تجھ کو

بہ ایں بے پردگی ہے گر یہ تیرا بام پر آنا
تو رسوا کر رہا ہے ایک دن یا مجھ کو ، یا تجھ کو

ہمارے دل کی آسائش نہ چاہی ، ہائے کیا ہوتا
جو ساتھ اس حسن کے ٹک رحم بھی دیتا خدا تجھ کو

دیا ہاتھوں پر اس کے عاشقانہ تو نے جا بوسہ
نہ آئی شرم خونِ دل سے میرے اے حنا تجھ کو

کہیں اے مصحفی رسوا نہ ہو تو مجھ کو یہ ڈر ہے
پڑا ہے بے طرح یہ دیدہ بازی کا مزا تجھ کو

۴۲۷

جاتا تھا سرِ رہ سے چلا صبح کہیں کو
سر پیٹ لیا دیکھ کے میں ، اس کی جبیں کو

آنکھوں سے مری حسرتِ نظارہ نے تیری
کر آب بہایا نگہِ باز پسیں کو

اے دیدہ تجھے قدر ہے کیا لخت جگر کی
کیوں' ہاتھ سے کھوتا ہے سلیماں کے نگیں کو

ہرچند میں سو پردے میں تقریر سخن کی
پر کوئی نہ سمجھا مری آواز حزیں کو

اے وائے کہ آ رہتا ہے اک ٹکڑا جگر کا
جب پونچھوں ہوں دامن سے میں اس چشمِ نمیں کو

کچھ جذبِ محبت سے نہیں دور جو رقصاں
لاوے بہ حرم راہبِ بت خانہ نشیں کو

اے **مصحفی** ! رشحِ قلمِ نادرِ فن سے
ٹک اور بھی سرسبز کر اس تازہ زمیں کو

۴۲۸

گو مجھ پہ فلک تیز کرے خنجر کیں کو
جیتے تو نہ چھوڑوں گا میں اس سہر جبیں کو

یہ حسن وہ شعلہ ہے کہ گر سر کو اٹھاوے
پروانہ بناوے پرِ جبریلِ امیں کو

کیا دور ہے کچھ اس سے تری چشم کی گردش
اک پل میں جو چاہے تو الٹ دیوے زمیں کو

پیار آتا ہے جب دل میں توسوچوں ہوں یہی میں
بوسہ ترے رخسار کو دیجے کہ جبیں کو

اے شوقِ سفر اس کی خبر ہم کو بھی کیجو
گر یاں سے کوئی قافلہ جاتا ہو کہیں کو

باندھا ہے مری جاں یدِ قدرت نے خدا کی
ہر چین میں کاکل کی ترے نافۂ چیں کو

---

۱ - تو : ل ۱ ، ۲ (الف - ب)

زیبندہ ہے یوں لختِ جگر اشک کے نیچے
جیسے کہ جلا ڈانک[1] سے ہوتی ہے نگیں کو
اے مصحفی ! دلّی میں بہ اعجازِ مسیحا
خامے نے ترے پھر کے جِلایا ہے حزیں[2] کو

۴۲۹

کیا حسن سے اس کے ہو خبر اہلِ زمیں کو
سورج نے بھی دیکھا نہیں جس پردہ نشیں کو
حکاک[3] نے جب باد دیا نام ہمارا
آزردہ کیا برسرِ ہر حرف نگیں کو
کیا تاب کبوتر جو مرے نامے کو لے جائے
واں طاقتِ پرواز نہیں روح الامیں کو
گھبراتا ہے جب جی تو یہی آتا ہے دل میں
سر پیٹ نکل جائیے بستی سے کہیں کو
میں دم بخود اس کوچے سے گزرا کہ مبادا
پہچان لے دشمن مری آوازِ حزیں کو
یہ اس سے نکو تر ہے تو وہ اس سے نکو تر
رخسار کو ہم اس کے سراہیں کہ جبیں کو

---

۱ - ڈانک : وہ سنہری یا روپہلا ورق جو چمک بڑھانے کو نگیں کے نیچے رکھتے ہیں -
(نور اللغات ج ۳ ، ص ٦)

۲ - شیخ محمد علی حزیں، متوفّی ۱۱۸۰ھ -
(سرو آزاد ، ص ۲۲۵ - نتائج الافکار ، ص ۱۳۳)

۳ - حکاک : (ع) مہر کن ، حرف کھودنے والا ، نگینہ ساز -
(نور اللغات ، ج ۲ ، ص ٦۰۱)

اے مصحفی ! ہے خوف مجھے آہ کا تیری
لاوے نہ تزلزل میں کہیں عرشِ بریں کو

۴۳۰

ٹک مرے حال پر نظر تو کرو
کوئی جاؤ اسے خبر تو کرو

اور ہی انداز کا ہے یہ رونا
ابر اس طرح چشمِ تر تو کرو

صفِ مژگاں کے سامنے یارو
ہونا ہووے سو ہو جگر تو کرو

بات کہتا ہوں تم سے ، سنتے ہو ؟
ٹک میاں جان ! منہ ادھر تو کرو

سوچتے کیا ہو خوب ہووے گا
مصحفی یاں سے تم سفر تو کرو

۴۳۱

اے دل ! اک روز ہم اپنا بھی جگر دیکھیں تو
تیرِ مژگاں کا ہدف سینے کو کر دیکھیں تو

ابر سے آج مجھے دعوئ خوں باری ہے
رنگ کیا لاتے ہو اے دیدۂ تر ! دیکھیں تو

میں ادھر یار کا خواہاں ہوں اُدھر تو اے دل !
کون لے جاوے اسے کھینچ کے گھر دیکھیں تو

کب کے مشتاق ہیں ، کیسی ہے ، کدھر ہے، کیا ہے
ٹک ادھر آ تو تری ہم بھی کمر دیکھیں تو

مصحفی ! طبعِ رواں بر سر دُر ریزی ہے
اور بھی فکر ٹک اس بحر میں کر دیکھیں تو

۴۳۲

شام تک کرتی ہے تو کیوں کہ اثر دیکھیں تو
ہم بھی شیخی تری اے آہ سحر دیکھیں تو

ڈھب میں آجائے تو آجائے وہ شب چوری سے
اس کے پاؤں پہ ذرا ہاتھ کو دھر دیکھیں تو

لالہ ہے شعبدہ بازی پہ چمن میں، ہم آج
گل کھلانا ترا اے داغ جگر! دیکھیں تو

تیر مژگاں ترے سورج سے یہی کہتے ہیں
ہم ذرا آج یہ تیری بھی سپر دیکھیں تو

کرتے ہیں دعویٰ اعجازِ مسیحا لبِ یار
کیا تعجب ہے جِلا دیں کبھی مر دیکھیں تو

ہم بھی موجود ہیں اور اتنے اسیر، اے قاتل!
کون رکھتا ہے تلے تیغ کے سر دیکھیں تو

دشت میں بھی نہ ملا مصحفیِ آوارہ
کبھی آیا ہو بھلا پھر اسے گھر دیکھیں تو

۴۳۳

اوروں پہ نہ نیمچہ نکالو
یوں چاہو تو ہم کو مار ڈالو

تیار ہوا ہے قافلہ سب
پھر دیر یہ کیا ہے چلنے والو!

یہ طرفہ کہ ہم کو ہی کرو قتل
اور الٹا ہمیں سے خوں بہا لو

یوں گزریں ہیں خاکِ کشتگاں سے
دامن کو تو اپنے ٹک سنبھالو

کیا اپنی کہو ہو ٹک سنو تو
باتوں میں نہ میری بات ٹالو

تم وے ہو کہ جس کے دل کو چاہو
نظروں میں میاں وہیں چرا لو

لازم ہے کہ سب کے رو برو ہو
اور پردے میں ہم سے منہ چھپا لو

ہے مصحفی دوست‌دار آخر
روٹھا ہے تو اس کو جا منا لو

۲۳۲

ایک تو بیٹھے ہو دل کو مرے کھو ، اور سنو
تس پہ کہتے ہو دیا ہے تجھے ، لو اور سنو

مے پیو آپ ، جو دیویں مجھے تلچھٹ احباب
اُن سے کہتے ہو اسے خاک نہ دو ، اور سنو

قصہ میں اپنا تو سب تم سے کہا اے یارو !
چپکے کیوں بیٹھے ہو کچھ تم بھی کہو اور سنو

چٹکیاں لیتے ہو جب پاس مرے بیٹھو ہو
آپ نے زور نکالی ہے یہ خو ، اور سنو

ستم طرفہ تو یہ ہے کہ مجھے روتا دیکھ
ہنس کے کہتے ہو ذرا اور بھی رو ، اور سنو

ابھی دفتر ہیں بغل میں مرے اے ہم نفسو !
ایک ہی بات میں اتنا نہ رکو ، اور سنو

مصحفی ڈر نہیں میرے تئیں رسوائی سے
بات اپنی مجھے کہنی اُسی کو اور سنو

۴۳۵

بزم ہو یار ہو اور شغلِ مے و جام بھی ہو
پھر تو خطرے ہیں جو ایسے میں یہ ناکام بھی ہو

ہائے کیا صبر کروں ، میں تو موا جاتا ہوں
دلِ بے تاب کو یارب کہیں آرام بھی ہو

کیا قیامت ہے کہ آنکھ اک تو لڑے غرفے سے
تس پہ پھر محوِ تماشائے لبِ بام بھی ہو

فرقتِ یار نے یہ دن تو مجھے دکھلایا
بارے اے صبحِ فراق اب تو کہیں شام بھی ہو

ہے ارادہ ترے کوچے سے سفر کا ہم کو
ابھی اٹھ جاویں جو تھوڑا سا سرانجام بھی ہو

ذبح کر ایسے سلیقے سے تو مجھ کو کہ میاں
خونِ خنجر پیے اور اس میں مرا کام بھی ہو

ایک بوسے کے لیے کیوں ہمیں ترساتے ہو
جان جاتی ہے جو دینا ہے تو انعام بھی ہو

اس نے نامہ مرا کیوں چاک کیا اے قاصد !
ہے قسم مجھ کو اگر اس میں مرا نام بھی ہو

تو تو کیا بات ہے خط کی ترے سبحان اللہ
اگر ایسا ہی اس آغاز کا انجام بھی ہو

حیف ہے اس پہ بھی گر اس کے نہ پہنچے در تک
جب کہ عاشق میں طلب ہووے اور ابرام بھی ہو

مصحفی ! ہر گھڑی جایا نہ کرو تم صاحب
اک تو عاشق ہو اور اس کوچے میں بدنام بھی ہو

۴۳۶

دور سے اپنا نہ منہ مجھ کو دکھاؤ جاؤ
بس جی بس دیکھ لیا میں تمھیں جاؤ ، جاؤ

اس قدر آمد و شد تم کو ضرر رکھتی ہے
دوستاں ہر گھڑی اس کُو میں نہ آؤ جاؤ

'جاؤں جاؤں' ہی جو کرتے ہو تو مانع ہے کون
جاؤ ، مت جاؤ ، جو جاتے ہو تو جاؤ ، جاؤ

آپ کی آنکھوں سے میرے تئیں ڈر لگتا ہے
مجھ ستم کشتہ سے آنکھیں نہ ملاؤ ، جاؤ

تم جہاں جاتے ہو مجھ کو بھی خبر ہے صاحب
اپنے جانے کو نہ بندے سے چھپاؤ ، جاؤ

سیرِ گلشن کو اگر جاتے ہو ہمراہِ رقیب
بخشو میرے تئیں مجھ کو نہ بلاؤ ، جاؤ

ہم سے کیا منہ کو چھپائے ہوئے تم جاتے ہو
ہم نے پہچان لیا ، منہ نہ چھپاؤ ، جاؤ

آپ کی میری کسی طرح نہ[1] ہووے گی صلح
فائدہ کچھ نہیں باتیں نہ بناؤ ، جاؤ

کیا میاں **مصحفی** یاں جی کے تئیں کھوؤ گے ؟
اس کے کوچے سے کہیں رخت اٹھاؤ ، جاؤ

۴۳۷

چھیڑا ہے کس نے تجھ کو جو چیں بر جبیں ہے تو
وہ[2] کون ہے کہ جس پہ میاں خشمگیں ہے تو

---

۱ - نہیں ہوگی صلح : ل ۳ -
۲ - کس کشتنی پہ یار بتا خشمگیں ہے تو - سرو

تابِ جفائے عشق نہ لاوے گا جان من
جانے دے ، نامِ عشق نہ لے ، نازنیں ہے تو
ہاتھوں سے تیرے مجھ پہ جو عرصہ ہوا ہے تنگ
اس کا سبب یہی ہے کہ تنگ آستیں ہے تو
کیا جانے خال و خط کو بناوے تو کیا کرے
اس حسن پر تو فتنۂ روے زمیں ہے تو
گر روزِ حشر ہو تو ترے منھ پہ یوں کہوں
آ محکمے میں ، کیوں مرا قاتل نہیں ہے تو ؟
اے[1] دوزخِ فراق میں سارا ہی جل گیا
کس دردمند کا نفسِ آتشیں ہے تو
کل آسماں تلک نہ قدم رکھ سکا ، چہ خوش
اے نالہ ! آج عازمِ عرش بریں ہے تو
عرشِ بریں کے در پہ جو میں حلقہ زن ہوا
آئی صدا یہ واں سے کہ عرشِ بریں ہے تو
اے لختِ دل ! نہ رکھیو قدم پیشتر کہیں
خاتم پہ میری[2] چشم کے جیسے نگیں ہے تو
میری خبر نہ تجھ کو نہ تیری خبر مجھے
مدت سے میں کہیں ہوں میاں اور کہیں ہے تو
اے **مصحفی** ! بتا تو ترا کس نے دل لیا
دل کے لیے جو اس قدر اندوہ گیں ہے تو

---

۱ - اے دوزخ فراق جلا تیرے ہاتھ سے۔ سرور
۲ - چشم میری کے : پ

۴۳۸

جانِ ستم رسیدہ آئی ہے لب تلک تو
آنا ہے تجھ کو تو آ، جیتا ہوں اب تلک تو

کرتا بلند نالہ کیا اور شیشۂ دل
بانگِ شکست اُس کی پہنچی حلب[1] تلک تو

جوں شمع پھر سحرگہ پیارے اٹھا ہی دیجو
محفل میں تیری ہم بھی بیٹھے ہیں شب تلک تو

ہاتھوں سے میرے اے غم مت چھین جامِ عشرت
لے جانے دے یہ ساغر تو مجھ کو لب تلک تو

مت مصحفی سے پیارے کر کل کا وعدۂ وصل
رہنے کی نہیں[2] ہے باقی کچھ اس کی جب تلک تو

۴۳۹

جو غیر سے ملا ہو وہ ہم سے یار کب ہو
اور ہووے بھی تو اس سے صحبت برار کب ہو

شعلے سے اُس کے گر وہ تیری سی خو نہ دیکھے
پروانہ شمع اوپر پیارے نثار کب ہو

ہم روے کوچۂ دل بیٹھے ہیں آرزو میں
دیکھیں پھر اس طرف سے اُس کا گزار کب ہو

کھل کھل کے آئنے میں وہ گل جو منھ نہ دیکھے
آئینہ اس طرح سے باغ و بہار کب ہو

پھندے میں اُس کے میں ہی اک پھنس گیا وگرنہ
جو ہووے مرغِ زیرک وہ یوں شکار کب ہو

---

۱ - حلب: (ایشیا) - ایک ولایت شام کے شمال میں - دارالخلافہ - (جامع اللغات ج ۲، ص ۵۵۳) -
۲ - بروزن فع -

جو آئنے میں اپنی صورت کو دیکھ جھجکے
یارانِ صاف دل سے پھر وہ دو چار کب ہو

اے **مصحفی** ! مجھے تو اس نے بہت ستایا
اس بے قرار دل کو دیکھیں قرار کب ہو

۴۴۰

بیچ دنیا کے کچھ آئے نہیں گھر کرنے کو
مستعد بیٹھے ہیں ہم یہاں سے سفر کرنے کو

گو شبِ ہجر نہ ہو صبح ہمیں کیا پروا
شعلۂ آہ کفایت ہے سحر کرنے کو

ہم کہاں اور تماشائے رخِ یار کہاں
حوصلہ چاہیے ہے اس پہ نظر کرنے کو

کیا قیامت ہے کہ تو کچھ نہ کہے اور لے جائیں
تیرے کوچے سے ہمیں شہر بدر کرنے کو

ہم تو گلدستہ ہی باندھا کریں بیٹھے لیکن
چاہیے دل بھی بہم لختِ جگر کرنے کو

ظلم سے ہاتھ اٹھایا نہ کبھی قاتل نے
ٹوٹی گر تیغ تو رکھی وہ تبر کرنے کو

مصحفی گوش ادھر رکھ کہ انھیں قافیوں میں
طبع ہے فکر بہ اندازِ دگر کرنے کو

۴۴۱

اک تو آگو ہی ترستے تھے نظر کرنے کو
تس پہ پھر حکم ہوا شہر بدر کرنے کو

قاصد آتا ہے کچھ اس کُو سے بہت آزردہ
دیکھیے آیا ہے کس کس کی خبر کرنے کو

کون مدفون ہے ایسا جو ترے کوچے میں
روز آتی ہے صبا خاک بسر کرنے کو

سخت مشکل ہے کہ اُس ناوکِ مژگاں کے حضور
چاہیے روز نیا سینہ سپر کرنے کو

راہ سورج کی شبِ ہجر کہاں تک تکیے
آ جھمک تو ہی ٹک اس شب کی سحر کرنے کو

روز اے نالہ! کہے ہے تُو، کروں گا اب اثر
آگ لگ جائے کہیں تیرے اثر کرنے کو

مصحفی دل کی تسلی نہ ہوئی اس سے تو لکھ
اک غزل اور بھی اظہارِ ہنر کرنے کو

۴۴۲

آیا اُس کُو میں جو میں خاک بسر کرنے کو
دل گیا ووں ہی اسے میری خبر کرنے کو

شبِ غم میں نہ کہو کوئی جز افسانۂ زلف
یہی افسانہ کفایت ہے سحر کرنے کو

نالہ یا آہ، بِن اس کے تو گزرتی ہی نہیں
چاہیے کچھ بھی تو اوقات بسر کرنے کو

یا تو ان آنکھوں سے دریا سے پڑے بہتے تھے
یا اب اک قطرہ نہیں ہے مژہ تر کرنے کو

آئنے نے ترے مکھڑے کی بہاریں لوٹیں
ہم ترستے ہی رہے ایک نظر کرنے کو

صفِ مژگاں کے رہا خوب مقابل اے دل!
آفریں[1] تجھ کو بھی اور تیرے جگر کرنے کو

---

۱ - آفریں تجھ کو اور اس تیرے جگر کرنے کو : پ، ل۱، ۲ -

جس نے اُس کوچے میں دیکھا مجھے، اتنا ہی کہا
جا بے، کیوں آیا ہے یاں جی کا ضرر کرنے کو
وے اولی‌العزم کدھر رہ گئے جو قافلے میں
ساتھ تھے محملِ لیلیٰ کے سفر کرنے کو
مصحفی حقِ نزاکت نہ ادا ہو جب تک
ہووے مُو سی نہ زباں وصفِ کمر کرنے کو

۴۴۳

آپ آئے ہیں ہمیں رخصت اگر کرنے کو
آئے[۱] ہیں ہم بھی تو دنیا سے سفر کرنے کو
کربلا ہے یہ گلی کیا ؟ جو نہیں ملتا یہاں
ایک قطرہ بھی لبِ خشک کے تر کرنے کو
ہیں کھلے چاکِ قفس لیک گلستاں میں ہمیں
حکمِ صیاد نہیں گل پہ نظر کرنے کو
یہ چمن جائے اقامت نہیں جب[۲] تو شب سے
غنچے گٹھری ہوئے بیٹھے ہیں سفر کرنے کو
زہر کا جام پلانے سے ہمیں کیا حاصل
اک نگہ کافی ہے سو ٹکڑے جگر کرنے کو
اے فلک کس نے کہا تھا تجھے یہ تو بتلا
اس شتابی سے شبِ وصل سحر کرنے کو
ان دنوں بس کہ زمانے میں نہیں قدرِ ہنر
ہم سمجھتے ہیں ہنر، ترکِ ہنر کرنے کو

---

۱ - آئے ہم بھی تو ہیں دنیا سے سفر کرنے کو : پ ، ل (ا-ب)
۲ - تب : پ ، ل ۱ ، ۲-

وے جو مارے تھے کبوتر مرے اس نے[1] ان کے
جمع کر رکھے ہیں پر بالشِ پر کرنے کو

مصحفی یوں تو سبھی شعر و سخن کہتے ہیں
چاہیے لطفِ سخن دل میں اثر کرنے کو

۴۴۴

بعد از سالے و ماہے گر کبھو آیا کرو
تم ہمارے پاس تو[2] اک شب کو[3] رہ جایا کرو

میں تو سمجھوں گا جو سمجھاتے ہو مجھ کو ہر گھڑی
لیکن ان دزدیدہ نظروں کو بھی سمجھایا کرو

گو کوئی میری طرف سے کچھ کہے تم کو میاں !
تم کسی کی بات کو خاطر میں مت لایا کرو

سیکڑوں کا خوں کیا ہے اس تمھاری تیغ نے
چپ رہو جھوٹی نہ قبضے کی قسم کھایا کرو

دل اُلجھتا ہے ہمارا دیکھ کر اس وضع کو
بال زلفوں کے بہت بھی تم نہ سلجھایا کرو

مُو کشاں میرے تئیں اے محرمانِ بزم یار
بر سرِ بازار رسوائی نہ لے جایا کرو

ایسے ہاتھوں پر کسی کا خون ہووے گا میاں !
یہ حنائی ہاتھ ہر اک کو نہ دکھلایا کرو

جی کا ترسانا برا ہوتا ہے، مانو بات کو
او میاں صاحب ! کسی کا جی نہ ترسایا کرو

---

۱ - چن کے : پ
۲ - بھی : پ، ل (۱)
۳ - تو : پ، ل (۱)

جب وہ سو جایا کرے تو بیٹھ کر میاں[1] **مصحفی** !
اپنی آنکھوں سے تم اس کے تلوے سہلایا کرو

۴۴۵

مستی میں اس کے پاؤں کی افتاد دیکھیو
دل پس گئے ہیں سیکڑوں ، بیداد دیکھیو
آتا نہ ہووے وہ بھی کہیں ، میرے قتل میں
جلدی بہت نہ کیجیو جلاد ! دیکھیو
صیاد ! ناتواں ہوں ، نہ پہنچوں گا باغ تک
کیجو مجھے قفس سے نہ آزاد ، دیکھیو
پھرتا ہے کب کا دامنِ صحرا میں گرد باد
یہ کس کی خاک ہوتی ہے برباد ، دیکھیو
گویا اسے خبر ہے کہ آئی بہارِ گل
ٹک اضطرابِ مرغِ قفس زاد دیکھیو
شیریں جو بے ستوں کی طرف ہو ترا گزر
تو جا کے کارِ تیشۂ فرہاد دیکھیو
میں مرغِ نو اسیر ہوں مر جاؤں گا مجھے
جھک کر درِ قفس سے نہ صیاد دیکھیو
ہے اس کی رگ کے نیچے رگِ جاں مری نہاں
نشتر لگے زیادہ نہ فصاد ، دیکھیو
مجھ سخت جاں پہ اس کو لگاتے تو ہو مگر[2]
جاوے نہ ٹوٹ خنجرِ فولاد ، دیکھیو

---

۱ - بروزن فع -
۲ - ولے : پ ، ل - ۱ ، ۲ -

رکھیو قدم سمجھ کے ذرا کوے یار میں
یہ کربلا ہے اے دلِ ناشاد ! دیکھیو
لکھی ہے خونِ دل سے میں تصویرِ روے یار
تم بھی تو اس کو مانی و بہزاد دیکھیو
اے مصحفی ! نہ جائیو گلشن میں اب کے سال
سرگرمِ عشوہ ہیں گل و شمشاد دیکھیو

۲۲۶

کوچے میں ترے گو کہ نہ جا اپنے تئیں ہو
مرنا ہی جب آیا تو مری جان کہیں ہو
رکھ دیکھ تو تُو اس کو ذرا دانتوں کے نیچے
شاید کہ کبابِ دلِ عاشق نمکیں ہو
کہتا[1] ہے یہی تجھ سے ترا حسن ہمیشہ
اے برقِ جہاں سوز ! کہیں پردہ نشیں ہو
کب پہنچے ہے رتبے کو مرے مجھ سے فرو تر
کیا قدر ہے کرسی کی جہاں عرشِ بریں ہو
سورج کی سی سرعت جو خدا ہم کو بھی دیتا
آ رہتے فلک پر وہیں پھر زیرِ زمیں ہو
اندوہ یہ کس کا مرے سینے میں بھرا تھا
نکلا نفسِ سرد بھی جوں آہِ حزیں ہو
معلوم کروں میں بھی تو کیا میری خطا ہے
بتلاؤ تو کس بات پہ تم چیں بہ جبیں ہو
فتراک سے باندھو تو ہو سر میرا ، ولے میں
ڈرتا ہوں نہ آلودہ بہ خوں دامنِ زیں ہو

---

۱ - کہتا ہے یہی حسن ترا تجھ سے ہمیشہ : ل ۲ -

ہے ناخنِ غم کی جو خراش اپنے جگر میں
گرتے ہیں سدا لختِ جگر کندہ نگیں ہو

گہ دہر میں جاتا ہوں گہ آتا ہوں حرم میں
تسکینِ دل اپنی نہ یہیں ہو ، نہ وہیں ہو

اے مصحفی ! کچھ کام نہیں مجھ کو کسی سے
گو صاحبِ دنیا کوئی ، یا صاحبِ دیں ہو

۴۴۷

ہوا ہے عشق کا اظہار دیکھیے کیا ہو
سجی ہے اس نے بھی تلوار دیکھیے کیا ہو

اب اس کا چلنے میں پڑتا ہے کچھ قدم ترچھا
نکالی ہے نئی رفتار دیکھیے کیا ہو

ملے تو ہیں پہ یہی دل میں سوچ رہتا ہے
ہمارے اس کے اب اقرار دیکھیے کیا ہو

بچے تھے مر کے جس آزار سے ہم الفت میں
ہوا ہے پھر وہی آزار دیکھیے کیا ہو

کشیدہ تیغ ہے وہ قاتل اور اس کے حضور
کھڑے ہیں سارے گنہگار دیکھیے کیا ہو

بہا کریں ہیں شب و روز صورتِ ناسور
ہمارے دیدۂ خوں بار دیکھیے کیا ہو

تغافلوں نے ترے ہم سے روزِ محشر پر
رکھا ہے وعدۂ دیدار دیکھیے کیا ہو

اٹھائے صدمے بہت ابتدائے الفت میں
الٰہی عاقبتِ کار دیکھیے کیا ہو

کھنچی ہے چاہ مری اس کی پھر بہ رسوائی
چھپے ہیں رخنۂ دیوار دیکھیے کیا ہو
الجھ رہا ہے مرا جی خیالِ گیسو میں
کھنچا ہے طول یہ آزار دیکھیے کیا ہو
ہمارے ساتھ مری جان دوستی میں تری
ہوے ہیں دشمنِ جاں یار دیکھیے کیا ہو
شبِ فراق میں دیکھا جو کچھ کہ میں دیکھا
سحر ہوئی یہ نمودار دیکھیے کیا ہو
ملیں ہم اس مہِ نا مہرباں سے یا نہ ملیں
فلک ہے در پۓ آزار دیکھیے کیا ہو
ہماری بزم سے اے **مصحفی**! سحر ہوتے
گیا ہے ہو کے وہ بیزار دیکھیے کیا ہو

۲۲۸

یارب مری اس بت سے ملاقات کہیں ہو
جس بات کو جی چاہے ہے وہ بات کہیں ہو
گر قربِ سخن اس سے نہیں، دور سے اے کاش
نظروں میں ہی ٹک حرف و حکایات کہیں ہو
پھرتا ہے حسینوں سے بہت آنکھیں لڑاتا
ڈرتا ہوں یہ دل مصدرِ آفات کہیں ہو
ہوتے ہوے دشمن کے کہوں کیوں کہ میں کچھ بات
مجلس سے تری دفع یہ بد ذات کہیں ہو
کاغذ پہ شب و روز تری کھینچوں ہوں تصویر
یعنی اسی صورت بسر اوقات کہیں ہو

ہے آج کی شب وعدۂ وصل اس کا مرے ساتھ
یارب کہ شتابی سے یہ دن ، رات کہیں ہو

دے ڈالو دل اے مصحفی! تم ، ورنہ مری جاں
رسوائی ہے وہ تم پہ گر اثبات کہیں ہو

ردیف ہ

۴۴۹

ہم نے چاہا تھا کریں گے رخِ جاناں پہ نگاہ
رہ گئی ضعف سے آ کر سرِ مژگاں پہ نگاہ

اس کی رفتار یہ کچھ ، دورۂ داماں یہ بلا
کیجیے رفتار پہ یا دورۂ داماں پہ نگاہ

ہم سے کب آنکھ لڑے اس کی کہ واں رہتی ہے
گاہ سینے پہ ، کبھی چاکِ گریباں پہ نگاہ

حلقہ در حلقۂ زنجیر چلے جاتے ہیں
کون کرتا ہے اب احوالِ اسیراں پہ نگاہ

عزم ہو تجھ کو گر اے برق ! ادھر آنے کا
پہلے کر لیجیو میرے سروساماں پہ نگاہ

مل گئے خاک میں ایسے کہ نشاں بھی نہ رہا
کیا کوئی خاک کرے گورِ غریباں پہ نگاہ

دیدہ بازی کا مزہ شیخ جی کیا جانیں ہیں
ان کی تو آٹھ پہر رہتی ہے قرآں پہ نگاہ

ہم تو مدت سے ہیں محبوسِ قفس ، کیا جانیں
کہ کبھی کرتے ہیں کیوں کر گل و ریحاں پہ نگاہ

یعنی یہ لختِ جگر قابلِ دیدن ہی نہیں
کیا کرے کوئی ان اوراقِ پریشاں پہ نگاہ

ڈر ہے اس چشم سے یارو کہ دمِ خوں ریزی
نہ وہ کافر پہ کرے ہے نہ مسلماں پہ نگاہ

مصحفی سلکِ گہر ایسے کہاں چمکیں ہیں
کیجیو یار کی شقّافیِ دنداں پہ نگاہ

۴۵۰

ہم بھی ہیں ترے حسن کے حیران ادھر دیکھ
کیا آئنہ دیکھے ہے مری جان ادھر دیکھ

آنکھیں نہ چرا مجھ سے مری جان ادھر دیکھ
اے میں تری اس چشم کے قربان ادھر دیکھ

ترسوں ہوں تری اک نگہِ لطف کو پیارے
اتنا بھی تو مجھ کو نہ کڑھا ، مان ، ادھر دیکھ

عاشق تو ہزاروں ہی غرض گزرے ہیں لیکن
یوں چاک ہوا کس کا گریبان ادھر دیکھ

آنکھیں نہ چرا مصحفیِ ریختہ گو سے
اک عمر سے تیرا ہے ثناخوان ادھر دیکھ

۴۵۱

جس جاگہ نہ ہووے پر و پیکان کا صرفہ
عاشق نہیں پھر وہ جو کرے جان کا صرفہ

نت گل کی طرح دھجیاں کر کر کے اڑایا
ہرگز نہ کیا ہم نے گریبان کا صرفہ

ہر تار سے الجھے ہے یہاں خارِ مغیلاں
اس راہ میں ممکن نہیں دامان کا صرفہ

عاشق کی تسلی کو بھلا ہنسیے کبھو تو
اتنا بھی نہ کیجے لب و دندان کا صرفہ

وقتے کہ صبا لے گئی بو اُس کی اڑا کر
کیا لطف ہے پھر زلفِ پریشاں کا صرفہ

رونا تو بڑا یہ ہے کہ اس عشقِ بتاں میں
ہم سے نہ ہوا دیدۂ گریاں کا صرفہ

اے مصحفی! سنتا ہے نہ لے نامِ محبت
اس بات میں ناداں نہیں انساں کا صرفہ

۴۵۲

کیا کھینچے ہے خود کو دور اللہ
اللہ رے ترا غرور اللہ

حسن ایسا کہاں ہے مہر و مہ میں
کچھ اور ہی ہے یہ نور اللہ

ہم نے تو بہ چشمِ خویش دیکھا
ہر شے میں ترا ظہور اللہ!

ہم ہیں ترے بندے میرے صاحب!
گو شیخ کو دیوے حور اللہ

پہلو سے مرے نکل گیا بت
کیا مجھ سے ہوا قصور اللہ

جس دم میں کروں ہوں نالہ دل سے
اٹھتا ہے کتنا شور اللہ

اے مصحفی! حق نہیں سمجھتا
کیسا ہوں میں بےشعور اللہ

۴۵۳

کیا نظر پڑ گئیں وہ چشمِ خمار آلودہ
شفقِ صبح تو ہے زورِ بہار آلودہ

قتل اپنے کا تو کچھ ڈر نہیں یہ ڈر ہے مجھے
کہ مرے خوں سے نہ ہو دامنِ یار آلودہ

دور ہے سوختہ جانوں سے نہالِ تزئیں
نہ کرے دستِ حنا دستِ چنار آلودہ

ایک دن رو کے نکالی تھی میں واں کلفتِ دل
اب تلک دامنِ صحرا ہے غبار آلودہ

پھول کیا چاہیے تربت پہ شہیدوں کی[1] ترے
جوششِ خوں سے ہے خود خاکِ مزار آلودہ

مستقل بس کہ ہے سینے میں مرے آتشِ عشق
آہ جو نکلے ہے دل سے[1] وہ شرار آلودہ

مصحفی گلشنِ ہستی میں تو ہم کو ہرگز
نظر آیا نہ کبھیں جز گل خار آلودہ

۲۵۲

ہر چند بہار و باغ ہے یہ
پر کس کو دل و دماغ ہے یہ

ہے بوند عرق کی زلف کے بیچ
یا گوہرِ شب چراغ ہے یہ

کیا لالہ کو نسبت اپنے دل سے
یعنی کہ تمام داغ ہے یہ

در گزرے ہم ایسی زندگی سے
دنیا میں اگر فراغ ہے یہ

---

۱ - کو : ل ۱ ، ۲ -
۲ - سو : ل ۱ ، ۲ -

پھر اتنی درنگ کیا ہے ساقی
مے ہے یہ اور ایاغ ہے یہ

ق

ایسا گیا مصحفی جہاں سے
یارو مرے دل پہ داغ ہے یہ
جو پھر نہ کہا کسو نے اتنا
اس گم شدہ کا سراغ ہے یہ

۴۵۵

دل کہ جوں شیشۂ مے دیدۂ گریاں ہے یہ
ایک اک دم میں در اندازِ صد افغاں ہے یہ
زلف میں یار کی بوندیں ہیں عرق کی یارب
یا شبِ تار میں اک جوشِ چراغاں ہے یہ
سرمہ ہر وقت جو آنکھوں میں دیا جاتا ہے
چشمِ بد دور مرے قتل کا ساماں ہے یہ
کوفت سے غم کی کبھی منھ تو نہ موڑا اس نے
مجھ[1] کو حیرت ہے یہی دل ہے کہ سنداں[2] ہے یہ
تار سے تار کو پیوند کہاں تک کیجے
جی کا جنجال ہے اک ، کوئی گریباں ہے یہ
رو بہ رو یار کے لے جا کے مجھے از رہِ لطف
کوئی اتنا ہی کہے آپ کا خواہاں ہے یہ

---

۱ - ہم کو : پ
۲ - سنداں : (ف) نہائی ، وہ مربع آہنی بٹا جس پر ہتھوڑے سے لوہا کوٹتے ہیں ۔

کیا نہیں دیکھی ہے صورت تری آئینے نے
اپنے چہرے کی صفائی پہ جو نازاں ہے یہ
مصحفی ایک غزل اب کے تو تُو اور بھی پڑھ
کیوں کہ نت تیرے سخن کہنے کا عنواں ہے یہ

۴۵۶

جس کو چاہے اُسے اپنا کرے انساں ہے یہ
پر ہو تُو رام کسی کا، کوئی اسکاں ہے یہ!
نہ شریعت، نہ طریقت، نہ حقیقت، نہ مجاز
کون کافر مجھے کہتا ہے مسلماں ہے یہ
عالم اک دیکھ کے تکتا تجھے رہ جاتا ہے
کس کو کہیے کہ تری شکل کا حیراں ہے یہ
زخمِ دل پر مرے مرہم نہ لگاؤ کوئی
اس پہ ٹک چھڑکو نمک اس کا تو درماں ہے یہ
اس کے پیکاں کو مرے سینے ہی میں رہنے دو
کہ ٹک اک موجبِ تسکینِ دل و جاں ہے یہ
چھپ گیا چاند سا مکھڑا ترا اُس میں سارا
کوئی گھٹا امڈی ہے یا زلفِ پریشاں ہے یہ
خونِ عاشق سے میاں جان! نہ انکار کرو
تیغ گو دھوئی گئی، آپ کا داماں ہے یہ
وصل کے بعد بھی بے تابیِ دل کم نہ ہوئی
آہ کیا جانیے کس چیز کا خواہاں ہے یہ
ایک تو چشمے سے آنکھوں سے اُبلتے ہیں مدام
تس پہ پھر دل بھی بھرا آئے ہے طوفاں ہے یہ

ہیں ز خود رفتہ ہم اتنے کہ نہیں کچھ معلوم
ہے ترے وصل کی شب یا شبِ ہجراں ہے یہ

مصحفی شہر نہیں ، فسرم ہے اب یاں کس سے
خوب سا کھول کے دل رو کہ بیاباں ہے یہ

۴۵۷

گر ہوے ہم سے مکدر ٹک دو چارِ آئنہ
خاک میں مل جائے گی ساری بہارِ آئنہ

اس دلِ پُر داغ کو جا کر کسے دکھلائیے
کیوں کہ ہوتا ہے صفا سے اعتبارِ آئنہ

کب کسی کے صاف دل پر اب[1] گئی اُس کی نگاہ
سادہ روئی میں نہ تھا جو شرم سارِ آئنہ

مر گئے گر ہم سے روشن گر تو اپنی خاک میں
یا ہوے خاکسترِ گل یا غبارِ آئنہ

بزم میں اُس کی ہوا ہے جب سے اپنا بندوبست
تب سے دخلِ شانہ ہے واں اور نہ بارِ آئنہ

کیا قیامت ہے کہ دی آئینے کو اُس کے شکست
دل کو عاشق کے دیا ہے اضطرارِ آئنہ

رو بہ رو اُس کے کوئی کیا خاک دم مارے کہ ہاے
ہے دمِ روح القدس بھی واں غبارِ آئنہ

جب سے اس کی زلفِ درہم کا پڑا ہے اس میں عکس
ہو گیا ہے تب سے برہم کار و بارِ آئنہ

جلوہ گر ہوتا ہے اس میں جب وہ روے پُر عرق
عقدِ پرویں کو کرے ہے مہ نثارِ آئنہ

---

۱ - آ گئی : ل ۲۔

سکتہ وہ جانے پراس کے مجھ کو اک آتا ہے رشک
کھو دیا کس کی نگہ نے اضطرارِ آئنہ
دیکھنا اس کا میسر ہو چکا اے **مصحفی** !
گر رہا یک چند یوں ہی اختیارِ آئنہ

۴۵۸

دیکھتا ہوں اُس کو میں ہر دم دو چارِ آئنہ
اپنے پردے میں ہوا ہے وہ شکارِ آئنہ
بہہ چلے ہیں شوق میں تیرے چمن ہو کر کے آب
اک نظر ایدھر بھی اے باغ و بہارِ آئنہ
کشتۂ پرہیز میں اُس سرو قد کا ہوں کہ وہ
عکس کو اپنے نہ چاہے ہم کنارِ آئنہ
جائے گل تکیوں کے آئینے رہیں تھے راست و چپ
جن دنوں تھا حسن اُس کا بےقرارِ آئنہ
اُس کے چہرے سے روا ہے دیجیے نسبت اُسے
جس کے تلووں سے صفا مانگے عذارِ آئنہ
دورِ خط میں اک ذرا عارض کو اُس کے دیکھیو
ہو گیا ہے تیرہ کتنا روزگارِ آئنہ
سادہ رو ہیں اور بھی لیکن کوئی کرتا نہیں
اس قدر آرائشِ نقش و نگارِ آئنہ
گریہ صورت ہے تری تو ایک دن اے رشکِ حور !
تجھ کو رنگ اپنا دکھاوے گی بہارِ آئنہ
داد کو میری وہ اب پہنچے نہ پہنچے **مصحفی**
شوق نے اس کو کیا ہے شرم سارِ آئنہ

۲۵۹

کل سوے غیر اُس نے کئی بار کی نگاہ
لاکھوں کے بیچ چھپتی نہیں پیار کی نگاہ

پوچھا میں دل سے نزع میں قاتل ہے تیرا کون
بولا کہ اُس سپاہیِ خوں خوار کی نگاہ

کیا قہر ہے کہ مکھڑے سے کھولے تو جب نقاب
طاقت نہ لا سکے ترے دیدار کی نگاہ

اتنا ہوا ضعیف کہ باہر نہ جا سکی
چاکِ قفس سے مرغِ گرفتار کی نگاہ

قسمت کہاں ہے ایسی کہ گاہے بہ بزمِ خویش
ہو آشنا نگہ سے مری یار کی نگاہ

ابرو کو اس کی دیکھ کے حیران رہ گئے
تھی[1] جن مبصروں کو کہ تلوار کی نگہ

اب مجھ سے منھ نہ ڈھانپ کہ ہوتی ہے عین اشک
وقتِ اخیر مردمِ بیمار کی نگاہ

گو حور یا پری ہو، پہ کیا اُس کو دیکھیے
جس پر پڑی ہو مصحفی دو چار کی نگاہ

۲٦۰

غیروں ہی کی مجلس میں تو اے بت! نہ سدا بیٹھ
اک دم تو مرے پاس بھی از بہرِ خدا بیٹھ

اب کیوں ہے کھڑا آگے مرے، دور ہو، جا بیٹھ
کچھ ہو نہ سکا تجھ سے تو اے آہِ رسا بیٹھ

---

۱ - ہے : پ

خورشید کو غرّہ ہے نپٹ حسن پہ اپنے
اک صبح تو ٹک تو بھی میاں ! غرفے میں آ بیٹھ

آنے دے ٹک آغوش میں اُس راحتِ جاں کو
اے دل مرے پہلو سے شبِ وصل جدا بیٹھ

میں مجلسِ خوباں میں رہا رات کھڑا ہی
جوں شمع ، پہ مجھ کو تو کسی نے نہ کہا بیٹھ

در سے ترے تجھ تک یہ گنہگار نہ پہنچا
آیا بھی جو گاہے تو سرِ کوچہ رہا بیٹھ

پھر اس نے کبھی تا بہ ابد سر نہ اُٹھایا
جس کشتے پہ قاتل کا مرے ہاتھ رہا بیٹھ

اس چال سے پامال کیا تو نے اک عالم
ہے یہ بھی کوئی[1] چال کہیں اب تو ذرا بیٹھ

دیدار سے مطلب تھا سو وہ دیکھ لیا میں
اب خواہ مرے رو بہ رو خواہے بہ‌قفا بیٹھ

اے مصحفی ! گر چاہے ہے روز اس کو تو دیکھے
جا کر کہیں اس کوچے میں دھونی سی رما بیٹھ

۴٦١

اُٹھنے سے ترے شورِ قیامت بھی گیا بیٹھ
اے فتنۂ برخاستہ از بہرِ خدا بیٹھ

پردہ نہ رکھ اس روے دل افروز کے آگے
یوں چاہے تو سب اپنا بدن مجھ سے چھپا بیٹھ

---

۱ - میاں : ل ۲ -

اب ہم بھی کوئی دم کو میاں یاں سے اٹھیں گے
کیا اتنی شتابی ہے کہاں جا ہے ، ذرا بیٹھ

پاتا ہی نہیں دل کا نشاں اپنے ، میں ہے ہے
کیا جانے وہ آوارہ کدھر[1] جا کے رہا بیٹھ

گر اُس کے تماشے کا تجھے شوق ہے اے دل !
سینے سے نکل کر تو مری آنکھوں میں آ بیٹھ

شمشیر سے کچھ کم نہیں محرابِ در اس کی
اس در پہ جو بیٹھے ہے تو گردن کو جھکا بیٹھ

اُس یوسفِ ثانی کی سواری کی خبر ہے
مانندِ زلیخا تو سرِ راہ میں جا بیٹھ

کیا ہم نہیں پہچانتے یہ ساختہ صورت
غصے سے ٹک اک اور بھی تو منھ کو بنا بیٹھ

کہتے ہیں صبا یار کے کوچے سے چلی ہے
اے غنچۂ نشگفتہ نہ اتنا بھی خفا بیٹھ

گھر اس کے گیا ملنے تو جا بزم میں وہ شوخ
مشغول ہوا غیر سے اور مجھ سے کہا ، بیٹھ

اے مصحفی ! کیا دیکھے ہے ، ہے مجلسِ خوباں
ایک آدھ سے تو بھی کہیں یاں آنکھ لڑا بیٹھ

۴۶۲

شیریں لب اُس صنم کے ہیں جوں نبات تحفہ
پھر تس پر اتنی تلخی ، ہے یہ بھی بات تحفہ

زلفوں کا تار اُس کے میں حرزِ جاں بنایا
ہاتھ اپنے لگ گیا تھا یہ کل کی رات تحفہ

---

۱ ۔ کہاں : ل ۲ ۔

کیوں کرنہ خوں میں ڈوبے کوئی[1] دیکھ اس پھبن کو
رنگِ حنا عجائب پھر تس پہ ہات تحفہ

آخر کو دخترِ رز دل لے گئی ہمارا
از بس کے جوں چترنی[2] تھی اس کی ذات تحفہ

اب سبز خط سے ان پر کائی سی جم رہی ہے
وے لب کہ تھے برنگِ آبِ حیات تحفہ

دریا میں کل نہاتے دیکھا جو میں نے اس کو
سب سیمبر بتوں میں تھی اس کی گات تحفہ

دلی کے کیا کروں وصف اے **مصحفی**! میں دیکھا
ہر ایک کوچہ اس کا جوں سومنات تحفہ

۴۶۳

مجھ کو یاروں نے بد و نیک کہا کیا کیا کچھ
دیکھ تو اک تری خاطر میں سنا کیا کیا کچھ

ساغرِ بادہ و دامانِ گل و دستِ نگار
ہاتھ سے میرے بہ یک بار گیا کیا کیا کچھ

نشے کے بیچ تھے ہم یہ ہمیں معلوم نہیں
رات ہم سے تری خدمت میں ہوا کیا کیا کچھ

مے کشی ، سیرِ چمن ، بزمِ طرب کا جانا
عشق میں میں نے ترے ترک کیا ، کیا کیا کچھ

---

۱ - بروزن فع ، دل : پ ، ل ۲-
۲ - چترنی : (ھ) مونث - نازک عورتوں کی چار قسموں میں سے ایک قسم -

(نوراللغات ، ج ۲ ، ص ۵۰۵)

رلتا پھرتا ہے مرا کاسۂ سر خاک کے بیچ
دیکھیے ، ہے ابھی طالع میں لکھا کیا کیا کچھ

دیدۂ فرق سے ٹک دیکھ کہ اک اک پل میں
رنگ بدلے ہے زمانے کی ہوا کیا کیا کچھ

سفرِ عشق سے غارت زدہ آیا ہوں نہ پوچھ
راہ میں میرا بھی اسباب لٹا کیا کیا کچھ

ہائے میں کس سے کہوں ابرِ سیہ میں مجھ کو
کوند بجلی کی دکھاتی ہے ادا کیا کیا کچھ

یاں جو کچھ ہم پہ ہوا سو تو سبھوں نے دیکھا
دیکھیے اور بھی ہو روزِ جزا کیا کیا کچھ

ذکر دشنام سقط[۱] کیا ہے کہ اس بد خو نے
نہ کہا میرے تئیں اس کے سوا کیا کیا کچھ

کون جانے ہے کہ نظارہ کشِ شوق کو یاں
رنگ دکھلائے ہے وہ رنگِ حنا کیا کیا کچھ

بلبل اک نالے پہ مت بھول کہ اس گلشن میں
دیکھ تو اور بھی ہیں نغمہ سرا کیا کیا کچھ

ق

ہم نے ہی قدر نہ کی دولتِ دنیا کی دریغ
ورنہ ہم کو بھی فلک نے تھا دیا کیا کیا کچھ

---

۱ - سقط : (ع) بدگوئی -

پیل و اسپ و شتر و پالکی و نقّارہ
قورٗ میں اپنی بھی اک عمر چلا کیا کیا کچھ
کان دھر کر تو ذرا مصحفی یک بار تو سن
آئے ہے دل کے دھڑکنے کی صدا کیا کیا کچھ

۴۶۲

عید کا روز ہے کیوں آج نہاں ہے شیشہ
مے کشو لاؤ بھی، کیدھر ہے، کہاں ہے شیشہ
مے نہ دو گریۂ سرشار ہی کافی ہے مجھے
کہ مری چشم میں ہر اشکِ رواں ہے شیشہ
شغل گریے کا بہم دیدہ و دل کرتے ہیں
ہے وہاں جام بھی موجود، جہاں ہے شیشہ
پنبۂ مے اسے مت سمجھیو، اے بادہ کشاں!
جوشِ مستی کے سبب کف بہ دہاں ہے شیشہ
مۓ گلگوں سے ہے ٹک اس میں بہار اے ساقی!
ورنہ بے برگ تراز نخلِ خزاں ہے شیشہ
شیشہ بازی تو مری دیکھ کہ زاہد کے حضور
آستیں میں مری جوں اشک، نہاں ہے شیشہ
اپنی آنکھوں سے سدا ہند کے سبزوں کی ہے جا
شیشہ والوں کی اگر زیبِ دکاں ہے شیشہ
جب تلک مے نہ پییں کچھ ہمیں آوے نہ نظر
عینکِ چشم ہماری تو میاں ہے شیشہ

---

۲ - قور : (ع- بروزن مور) - مونث ۱ - ناخن کی کور - - - (ت - سلاح) فیتہ جو کپڑوں کے حاشیے پر لگاتے ہیں - ۳ - خاصیے کا ہاتھی - ۴ - ہتھیار - سلاح۔ (نوراللغات ج ۳، ص ٦٦٦)

کیا بلا مے تھی جو ساقی نے بھری کیا جانے
دم بہ دم آج در انداز فغاں ہے شیشہ
وائے اس بزم میں گر عمر خوشی سے گزرے
خندۂ جام پہ نت گریہ کناں ہے شیشہ
شیشہ خانے میں تمھارے مجھے سچ کہہ دیجو
کوئی اس دل سا بھی اے شیشہ گراں! ہے شیشہ؟
عکس گل بادۂ رنگیں سے گرو لیتا ہے
ساقی اس باغ میں خود آبِ رواں ہے شیشہ
مے کے کم پینے سے کچھ زور بنا ہے کافر
بہ تکلف بتِ زنار میاں! ہے شیشہ
محتسب کیا ہے کہ لاوے وہ اسے خاطر میں
آج اس بزم میں خود پیرِ مغاں ہے شیشہ
نہ اٹھا اس کو گر اک جام بھی مے ہو اس میں
تیرے ہاتھوں کی نزاکت پہ گراں ہے شیشہ
عزمِ مے کدہ ہو یار کہ تیری رہ میں
دہن باز سے چشمِ نگراں ہے شیشہ
مصحفی دیکھ کے دل کیوں نہ بہا دے اس کو
چشمِ بد دور عجب سج کا جواں ہے شیشہ

۴٦۵

نت رہا سوے چمن مرغِ گرفتار کا منھ
اس تمنا میں کہ دیکھے گل و گلزار کا منھ
بگڑو مت آپ نے دیکھا نہیں تلوار کا منھ
لال ہو جائے گا ورنہ ابھی دو چار کا منھ

عقدۂ زلف کے کھلتے ہی جہاں یوں مہکا
تو کہے کھول دیا نافۂ تاتار کا منہ

کیوں نہ خوں ٹپکے ہر اک گام پہ اس کی رہ میں
پان سے لال ہے اس قاتلِ خوں خوار کا منہ

باغ میں چاروں طرف گل کھلے، کلیاں چٹکیں
نہ کھلا میرے ہی اک غنچۂ منقار[1] کا منہ

علمِ نالہ پہ پرچم تھے ظفر کی گویا
پھر گیا دیکھ جسے ہر مژۂ یار کا منہ

اب کوئی دم میں یہ دنیا سے گزر[2] جاتا ہے
کرو قبلے کی طرف اس دلِ بیمار کا منہ

ابھی آئینے کو پتھر پہ پٹک دیتا میں
مصحفیؔ کیا کروں ہے میرے تئیں یار کا منہ

۴۶۶

دل بستگی ہے مجھ کو گل و گلستاں کے ساتھ
گو تلخ بولے، کام ہے کیا باغباں کے ساتھ

الفت بھی کیا بلا ہے کہ شب آگ جو لگی
مرغانِ بیضہ دار جلے آشیاں کے ساتھ

برقِ گل اس طرح سے گری[3] شب کہ عندلیب
خاکِ سیاہ جل کے ہوئی آشیاں کے ساتھ

---

۱ - غنچۂ منقار : میرزا صائب :

نیستم چوں بلبلاں قانع بہ گفتا وگوے گل
باغ را در غنچۂ منقار می‌خواهد دلم

(بہار عجم، ج ۲، ص ۲۴۳، مطبع نول کشور لکھنو ۱۸۷۹ع)

۲ - سفر کرتا ہے : پ، ل ۱، ۲ -

۳ - جلی : پ -

مر کر اٹھیں گے یاں سے یقیں کیجیو میاں !
اپنا تو سر لگا ہے ترے آستاں کے ساتھ

یاں تک ہے لخت لخت مرا دل کہ دم بدم
ٹکڑے جگر کے جھڑتے ہیں آہ و فغاں کے ساتھ

رکھتا ہے مجھ سے دور مرے رشکِ ماہ کو
خصمی اسی سبب ہے مجھے آسماں کے ساتھ

البتہ کارِ سہل نہیں تیری دوستی
دشمن کوئی ہو کیوں کہ بھلا اک جہاں کے ساتھ

وہ کشتہ اپنے حال کی تقریر کیا کرے
سر جس کا مثلِ شمع کٹا ہو زباں کے ساتھ

تو رفتگی تو دیکھ کہ مژگاں کے شوق میں
لپٹا ہی جا ہے دل مرا نوکِ سناں کے ساتھ

اے خار خارِ عشق کہیں اب تو در گزر
یہ کیا خلش ہے مصحفیِ نیم جاں کے ساتھ

۴۶۷

دم بدم لب پہ مرے نالۂ وا درد ! ہے آہ
سر اٹھانے نہیں دیتا ہے ، یہ کیا درد ہے آہ

گئے وے دن کہ کبھی دل کی جگہ تھا یہ مکاں
جائے دل اب مرے پہلو میں ترا درد ہے آہ

عشق کا درد نہ ہووے کسی دشمن کو[1] نصیب
جان جاتی ہے چلی ، یہ تو برا درد ہے آہ

---

۱ - کے : ل ۲ -

ٹکڑے[1] ٹکڑے ہی ہوا جائے ہے دل اور جگر
آج تو کچھ مرے پہلو میں بلا درد ہے آہ

ہے پڑی آنکھ پھر اک آفتِ جاں پر میری
اس کی دارو میں کروں کیا کہ نیا درد ہے آہ

زائچہ[2] اپنا منجم سے جو میں کھچوایا
رہ کے بولا تری قسمت میں لکھا درد ہے آہ

جلد تدبیر کرو جا کے الم کی میرے
کم نہ جانو اسے یارو یہ بڑا درد ہے آہ

مصحفی ہاتھ نہ پہلو پہ مرے رکھ بے درد
اس گھڑی کچھ مرے سینے میں ذرا درد ہے آہ

۲٦۸

زمانے کا چلن یکساں نہیں کچھ
کہیں کچھ ہے کہیں کچھ ہے کہیں کچھ

زمیں سر پوشِ خونِ کشتگاں ہے
بغیر از خوں نہیں زیرِ زمیں کچھ

مرا جی تو بھلا بہلے کوئی دم
اُسی کا ذکر کر اے ہم نشیں! کچھ

خدا جانے رہا ہے شب تو کس پاس
پریشاں ہیں ترے موئے جبیں کچھ

---

۱ - صدمۂ ہجر سے شاید کہ ہوا خاک جگر: مرور
۲ - زائچہ اپنا منجم کو جو میں دکھلایا: پ

یہ سرگوشی نہ تھی بے وجہ اس کی
کہے تھی چشمِ تر سے آستیں کچھ

عبث انکارِ قتلِ عاشقاں ہے
بھرا تو خوں سے ہے دامانِ زیں کچھ

غرض دونوں جہاں سے ہم ہیں آزاد
غمِ دنیا ہے یاں ، نے فکرِ دیں کچھ

مرا ہر شعر موتی کی لڑی ہے
کہیں گو دیکھ اس کو عیب بیں کچھ

اگر اے مصحفی ! ہو قصد تیرا
تو دور اتنا نہیں عرشِ بریں کچھ

۲۶۹

اُس کی مژگانِ رخنہ گر کو دیکھ
بعد ازاں آ مرے جگر کو دیکھ

اب تو سینہ سپر کیا میں نے
تیغ کو کھینچ اور سپر کو دیکھ

یار کو مجھ سے کر دیا بے زار
میرے طالع کے ٹک ہنر کو دیکھ

دسترس ہی نہیں جنھیں اُس پر
ہاتھ ملتے ہیں اس کمر کو دیکھ

کیا ہی مژگاں کے زخم جھیلے ہیں
اپنے عاشق کے بھی جگر کو دیکھ

بس کہ وہ طفلِ سادہ تھا پُر کار
چھپ گیا میرے نامہ بر کو دیکھ

گو کہ وہ جھانکتا نہیں لیکن
دل[1] تو خوش ہو ہے چاکِ در کو دیکھ

شعلۂ شمع کا حریف نہ ہو
نفع تو اک طرف، ضرر کو دیکھ

اس قدر ہے[2] بلند پروازی
اے پتنگ! اپنے بال و پر کو دیکھ

دیکھ تو کیا غزل پڑھوں اک زور[3]
مصحفی تو ذرا ادھر کو دیکھ

۴۷۰

اپنے عاشق کی چشمِ تر کو دیکھ
صدقے تیرے میں، ٹک ادھر کو دیکھ

تیر مژگاں ترا دوسار ہوا
دل کو کیا دیکھے ہے، جگر کو دیکھ

دیکھتا کیا ہے عقدِ پرویں کو
اپنے آویزۂ گہر کو دیکھ

میرے آگے نہ دیکھ آئینہ
میری حسرت بھریِ نظر کو دیکھ

زلف کو بوجھ دے کمر پہ نہ جاں
زلف کو دیکھ اور کمر کو دیکھ

تھی شبِ وصل کھل گئی جوں ہی آنکھ
رنگ فق ہو گیا سحر کو دیکھ

---

۱ - دل تو ٹک خوش ہے چاکِ در کو دیکھ : پ، ل ۱
۲ - بھی : پ، ل ۲ -
۳ - اور : پ، ل ۲ -

کیسی فر فر زبان چلتی ہے
اس کی گفتارِ بے خطر کو دیکھ

مصحفی پر ستم نہ کر ناداں
خط نہ دے اپنا نامہ بر کو دیکھ

۴۷۱

چمن آرائے نوبہار تو دیکھ
اک ذرا جوشِ لالہ زار تو دیکھ

آرسی لے کے ہاتھ میں اپنی
اپنی آنکھوں کا تو خمار تو دیکھ

مجھ کو کیا دیکھتا ہے کر کے قتل
اپنی شمشیرِ آب دار تو دیکھ

اتنا موئے کمر پہ غرّہ نہ ہو
ٹک ہماری بھی چشمِ زار تو دیکھ

مر گئے پھر بھی ہیں کھلی آنکھیں
اپنے عاشق کا انتظار تو دیکھ

سینے آیا ہے کس کو اے ناصح !
ٹک مرا جیبِ تار تار تو دیکھ

مصحفی بول اٹھے عجب بھی نہیں
اس کی تربت پہ تو پکار تو دیکھ

ردیف ی ، ے

۴۷۲

زمزمے ہم سے سنو بلبلِ خوش الحاں کے
کہ سدا نغمہ سرا تھے چمن و بستاں کے

آنکھیں دکھلائیں (ہیں) کیا تو نے اسے سچ کہو
آج اوسان سے گم ہیں جو ترے درباں کے
کون سی بچنے کی صورت ہے مری، حیراں ہوں
لوگ کس واسطے درپے ہیں مرے درماں کے
پھر نہ جاوے تری مژگاں کا رخ ان سے میاں !
تیری آنکھیں یہی کہتی ہیں تری مژگاں کے
دیدۂ شیر سے لگتے ہیں مری آنکھوں میں
ہول ناک ایسے ہیں تارے یہ شبِ ہجراں کے
ہم سیہ بخت رہے بوسے سے محروم دریغ
لوٹے مسّی نے مزے تیرے لب و دنداں کے
اشکِ خونیں کو مرے دیکھے ہے جو کہتا ہے
'چُنّیاں'[1] لعل کی یا دانے ہیں یہ مرجاں کے
خار صحرائے جنوں دست درازی سے تری
چاک جاتے ہیں گریباں کو مرے داماں کے
ہم اسیروں پہ بڑا قہر ہوا یا قسمت
عید کے دن بھی نہ دروازے کھلے زنداں کے
حوصلہ دیکھیے میرا کہ بغل میں میری
اک دلِ خستہ میں سو زخم ترے پیکاں کے
قافلہ جائے ہے یاروں کا چلا بس کہ شتاب
میں بھی نالش میں ہوں پیچھے جرسِ نالاں کے
مسی و پان کے کشتوں کے ترے مدفن سے
پھول اُگتے ہیں بہم لالہ و نافرماں کے

---

۱ - چنیاں : (ہ) سرخ چھوٹے نگ ۔

دیدۂ کم سے نہ دیکھو یہ مرے طفلِ سرشک
گو کہ طوفاں نہیں ہم نام تو ہیں طوفاں کے
چاندنی رات میں تارے سے پڑے چمکیں ہیں
یہ جو ذرّات ہیں مکھڑے پہ ترے افشاں کے
کسی بے درد نے دامن کو ترے[1] کھینچا ہے
چین کے اُدھڑے نظر آتے ہیں سارے ٹانکے
مصحفی سے تجھے کیا لاگ ہے، چل جانے دے
اتنا درپے نہیں ہوتا ہے کوئی انساں کے

۴۷۳

تم گھر میں اپنے ہم سے جب منھ چھپا کے بیٹھے
ہم پھاڑ کر گریباں، صحرا میں جا کے بیٹھے
نکلی میاں سے جب شمشیرِ ناز اس کی
کیا کیا نیاز پیشہ سر کو جھکا کے بیٹھے
بدلی سی آگئی اک گر موے سر پریشاں
جب آفتاب میں تم پیارے نہا کے بیٹھے
آنے کی گر ہمارے تم نے خبر سنی تو
آنے سے پیشتر ہی تیوری چڑھا کے بیٹھے
رستے کے جانے والے بھوچک[2] ہو رہ گئے سب
جس دم تم اپنے در پر مونڈھا بچھا کے بیٹھے
تم پاس گر میں آکر بیٹھا تو اٹھ گئے تم
یعنی اسی بہانے مجھ کو اٹھا کے بیٹھے

---

۱ - مرے : پ -
۲ - بھیچک : ل ۱ ، ۲ -

پیارے ابھی تو مجھ سے تم روٹھ کر منے تھے
پھر کیا غضب ہوا ہے جو منھ پھرا کے بیٹھے
ہم اٹھ نہ جاویں کیوں کر در سے تمھارے، تم تو
پاؤں کو اپنے گھر میں مہندی لگا کے بیٹھے
گل چاک کر گریباں رسوا ہوئے چمن میں
جب تم روش پہ اپنا سینہ اٹھا کے بیٹھے

ق

اے مصحفی ! شب اس کے میں سامنے کھڑا تھا
اتنے میں جوں ہی دشمن مجلس میں آ کے بیٹھے
تب دیکھ دیکھ مجھ کو بولا یہ اس سے کہہ دو
کیوں چور سا کھڑا ہے گھر اپنے جا کے بیٹھے

۴۷۴

غم میں تیرے راحت و آرام سے جاتے رہے
گھل گئے ایسے کہ ہم سب کام سے جاتے رہے
دیکھ کر کتنے نصاریٰ تجھ کو مومن ہوگئے
بلکہ مومن بھی کئی اسلام سے جاتے رہے
در بدر روتا پھرا میں جن کی خاطر سو وے شب
چاند سا مکھڑا دکھا کر بام سے جاتے رہے
اس نے شب باشی کا وعدہ غیر سے جس دن کیا
ہم چھپا کر منھ کو اپنے شام سے جاتے رہے
ہائے کیسے کیسے گل اس گلستاں کے ایک بار
خاک میں مل، گردشِ ایام سے جاتے رہے

دورِ خط وہ دیکھ کر زلف اپنی یوں بولا کہ ہاے[1]
چھوٹ کر کیا کیا اسیر اس دام سے جاتے رہے

کل جو میں ان سے کہا دیکھا ہے تم نے اس[2] کا حال
کچھ خفا ہو، **مصحفی** کے نام سے، جاتے رہے

۴۷۵

چتون سے اک تو دل پر آگے ہی بے کلی ہے
پھر تس پہ یہ غضب ہے چشمک ہے جھانولی[3] ہے

فندق ان انگلیوں کی دیتی ہے یاد مجھ کو
ہر شاخِ گل کے اوپر سر کھینچے جو کلی ہے

مرجھا رہے ہیں غنچے، گل ہو گئے ہیں پت جھڑ
اب کے برس چمن میں یہ کیا ہوا چلی ہے

خونابِ دل سے میرے کر کے خضاب اول
ہاتھوں پر اپنے اُس نے پھر کچھ حنا ملی ہے

دلی میں روے خوش کی ہرگز کمی نہیں کچھ
یاں جنسِ حسن ارزاں ہر کوچہ و گلی ہے

شب طبعِ **مصحفی** سے مانندِ سلکِ گوہر
انصاف کیجو یارو کیا ہی غزل ڈھلی ہے

---

۱ - مصرع یوں ہوتا:
دورِ خط وہ دیکھ کر زلف اپنی سے بولا کہ ہاے
(فائق)

۲ - مصحفی: ل ۲ -

۳ - جھانولی: (ھ - مونث) آنکھ کا اشارہ، معشوق کی ناز بھری گردشِ چشم - (نوراللغات، ج ۲، ص ۳۶۰)

دورِ خط وہ دیکھ کر زلف اپنی یوں بولا کہ ہائے[1]
چھوٹ کر کیا کیا اسیر اس دام سے جاتے رہے
کل جو میں ان سے کہا دیکھا ہے تم نے اس[2] کا حال
کچھ خفا ہو، **مصحفی** کے نام سے، جاتے رہے

۴۷۵

چتون سے اک تو دل پر آگے ہی بے کلی ہے
پھر تس پہ یہ غضب ہے چشمک ہے جھانولی[3] ہے
فندق ان انگلیوں کی دیتی ہے یاد مجھ کو
ہر شاخِ گل کے اوپر سر کھینچے جو کلی ہے
مرجھا رہے ہیں غنچے، گل ہو گئے ہیں پت جھڑ
اب کے برس چمن میں یہ کیا ہوا چلی ہے
خونابِ دل سے میرے کر کے خضاب اول
ہاتھوں پر اپنے اس نے پھر کچھ حنا ملی ہے
دلی میں روے خوش کی ہرگز کمی نہیں کچھ
یاں جنسِ حسن ارزاں ہر کوچہ و گلی ہے
شب طبعِ **مصحفی** سے مانندِ سلکِ گوہر
انصاف کیجو یارو کیا ہی غزل ڈھلی ہے

---

۱ - مصرع یوں ہوتا :
دورِ خط وہ دیکھ کر زلف اپنی سے بولا کہ ہائے
(فائق)

۲ - مصحفی : ل ۲ -

۳ - جھانولی : (ہ - مونث) آنکھ کا اشارہ، معشوق کی ناز بھری گردشِ چشم - (نوراللغات، ج ۲، ص ۳۶۰)

۴۷۶

ہم کیا کریں چمن میں گر پھر ہوا چلی ہے
اپنا دلِ فسردہ تصویر کی کلی ہے

ابرو کا ٹک اشارہ جس دم کیا ہے اس نے
پھر عاشقوں میں باہم تلوار ہی چلی ہے

محبوب شرمگیں کا نقشہ ہے اس چمن میں
سر کو جھکائے اپنے لالے کی جو کلی ہے

ہر چند چشمِ کافر پُر دل[1] بہت ہے لیکن
تیکھی نگاہ اُس کی اُس سے بھی من چلی ہے

آدھی اُگل کر اُس کی تلوار رہ گئی کل
کیا **مصحفی** کے سر سے آئی بلا ٹلی ہے

۴۷۷

جمنا میں کل نہا کر جب اُس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے

ایسا شکوہ اُس کی صورت میں ہے کہ ناگہ
آوے جو سامنے سے دستِ مجال باندھے

آنکھوں سے گر کرے وہ زلفوں کو ٹک اشارہ
آویں چلے ہزاروں وحشی غزال باندھے

عیسیٰ و خضر تک بھی پہنچے اجل کا مژدہ
تو تیغ اگر کمر پر بہرِ قتال باندھے

لالے کی شاخ ہرگز لہکے نہ پھر چمن میں
گر سر پہ سرخ چیرہ وہ نونہال باندھے

---

۱ - پُردل : دلیر ، دلاور یا جرأت - (فرہنگ عمید ، ص ۳۲۱)

لت عاشقی کی کوئی جاتی[1] ہے عاشقوں سے
گو بادشاہ ڈانڈے[2] گو کوتوال باندھے

ہم کس طرح سے دیکھیں جب دے دے پیچ لڑکے
چہرے کے پینچوں میں تو زلفوں کے بال باندھے

بندہ ہوں میں تو اس کی آنکھوں کی ساحری کا
تارِ نظر سے جس نے صاحب کمال باندھے

ہم ایک بوسے کے بھی ممنوں نہیں کسی کے
چاہے سو کوئی تہمت روزِ وصال باندھے

سوز دل اپنا اس کو کیا **مصحفی** سناویں
آگو ہی وہ پھرے ہے کانوں سے شال باندھے

۴۷۸

برقع ہے[3] یا کوئی بلا ہے
جس میں ترا سب بدن چھپا ہے

کیا جاتا ہے اس میں منھ لپیٹے
ٹک پیچھے تو دیکھ، آشنا ہے

ہر نقشِ قدم پہ تیرے اے بت!
سایہ ترے سجدے کر رہا ہے

اس طرزِ خرام سے قیامت
گر آج نہیں تو کل بپا ہے

ٹک دیکھ ڈھٹائیاں تو اس کی
پھر **مصحفی** تجھ سے لگ چلا ہے

---

۱ - جاتی: ل ۱، ۲ -
۳ - برقع ہے یہ یا کوئی بلا ہے: ل -
۲ - ڈانڈنا: (ھ) عوض لینا - بدلا لینا (نوراللغات، ج ۳، ص ٦)

۴۷۹

دل مرا تیرے غم میں مرتا ہے
دیکھ اب کوئی دم میں مرتا ہے

تیرے رونے کے روبرو اے ابر!
پانی کب چشمِ نم میں مرتا ہے

دیکھ اس کو بہت میں روتا ہوں
جو کوئی عمرِ کم میں مرتا ہے

سفرِ کعبہ کر، کہ ہے ناجی
جو کہ راہِ حرم میں مرتا ہے

مصحفی کو بڑا الم ہے ترا
آج کل اس الم میں مرتا ہے

۴۸۰

کدھر جائیے اور کہاں بیٹھیے
پرچتا[1] نہیں دل جہاں بیٹھیے

میں دیکھا تمھیں خوب، پردے میں اب
ذرا اور ہو کر نہاں بیٹھیے

کھڑے دیکھتے کیا ہو، پھر[2] آئیے
کرم کیجیے مہرباں بیٹھیے

ابھی سے کہاں اٹھ چلے، کوئی دم
غنیمت ہے صحبت میاں بیٹھیے

---

۱ - پرچنا: (ہ) مانوس ہونا، مائل ہونا، راضی ہونا، بہلنا۔
(نوراللغات، ج ۲، ص ۷۵)

۲ - یاں: پ

ترے ہاتھوں سے اے جفاے فلک!
بتا تو ہی چھپ کر کہاں بیٹھیے

بٹھایا مجھے تم نے زنداں میں خوب
میں بیٹھا بس اب دوستاں بیٹھیے

تم[1] آنکھوں میں کیا بیٹھتے ہو مری
بہ پہلوے دل مثلِ جاں بیٹھیے

نہیں بیٹھنے کی تمھارے وہ جا
ادھر آئیے اب یہاں بیٹھیے

نہ پہنچو گے منزل کو تم **مصحفی**
گیا دور اب کارواں، بیٹھیے

۲۸۱

انداز کے صدقے ہیں نہ ہم ناز کے صدقے
گر[2] ہیں بھی تو اس نرمیِ آواز کے صدقے

دامن کو ترے پاوں کی جب لگتی ہے ٹھوکر
کہتے ہیں یہ مردے کہ اس انداز کے صدقے

کر ذبح مجھے تو نے نئے سر سے جلایا
اے خنجرِ قاتل! ترے اعجاز کے صدقے

اک بار اڑا ہوں میں تو مرغانِ گلستاں
سو بار ہوے ہیں مری پرواز کے صدقے

مت دیکھ تو اوروں کی طرف، میری طرف دیکھ
کافر میں تری چشمِ فسوں ساز کے صدقے

---

۱ - تم آنکھوں میں بیٹھے ہوے ہو مری : پ
۲ - پردے سے ہیں اس نرمی آواز کے صدقے : سرور

کرتا[1] ہوں میں نالہ تو نکلتی ہے یہ آواز
اس نالے کے ، اس سوز کے ، اس ساز کے صدقے

اے مصحفی ! کیا تیرا بھی اندازِ سخن ہے
باللہ کہ ہیں ہم تو اس انداز کے صدقے

۲۸۲

اس طفل کو دیکھو تو یہ رنگ کسو کا ہے
شعلہ ہے ، شرارہ ہے ، آتش ہے بھبوکا ہے

اس آئینے خانے میں اے روشنیِ دیدہ !
جیدھر کو نظر کیجے جلوہ ترے رو کا ہے

یا اس کا کبھی حلقہ وہ ساعدِ سیمیں تھا
یا حلقۂ آہن اب طوق اپنے گلو کا ہے

مت زخمِ جگر میرا جراح سے سلواؤ
لاؤ کسی بینا کو کام اس میں رفو کا ہے

تزئیں سے نہیں خالی یہ جامۂ عریانی
جو زخم محرف ہے خط اس پہ اتو[2] کا ہے

---

۱ - کرتا ہوں میں نالہ تو یہی نکلے ہے آواز : پ ، ل ۱ ، ۲

۲ - اُتو - (ف میں بیش تر بہ ضم اول و دوم ہے اور بہ تشدید بہت کم - اردو میں بیش تر بہ تشدید دوم ہی زبانوں پر ہے) - مذکر ، اصل میں اُس آلۂ آہنی کا نام ہے جس سے کپڑے کو مٹکے پر دبا کر زینت کے لیے نقش بناتے ہیں مگر اصطلاح میں اُن نقوش کو کہتے ہیں جو اس آلے سے بنائے جاتے ہیں -
اتو کرنا : اتنا مارنا کہ بدن پر ضرب کے نشان پڑ جائیں - خوب پیٹنا - (نور اللغات ، ج ۱ ، ص ۲۵۹)

اس دستِ حنائی کو رکھا تھا کہیں اس نے
اب تک مری تربت پر چھاپا سا لہو کا ہے
اب مصحفیِ خستہ اس در سے کدھر جاوے
مارا ترے رُو کا ہے، کشتہ ترے مُو کا ہے

۴۸۳

سب اٹھے بزم سے اور اپنے اپنے گھر کو چلے
ولیک یہ نہیں معلوم ہم کدھر کو چلے
کمر ہوئی تری یاں تک تو شہرۂ آفاق
کہ سر کے بال ترے دیکھنے کمر کو چلے
کہے ہے یہ تپشِ دل کہ اب وہ آتا ہے
ہوئی ہے دیر بہت واں سے نامہ بر کو چلے
جگر میں میرے کئی قطرے خوں کے باقی تھے
سو آج وہ بھی تماشاے چشمِ تر کو چلے
یہ کیا شتابی ہے اے قاصدانِ اشک! کہو
مگر مرے دلِ گم گشتہ کی خبر کو چلے
جنوں کی لہر میں آ، شب میں یاں تلک رویا
کہ سیلِ خوں مری آنکھوں سے بحر و بر کو چلے
یہ راہ وہ ہے کہ اس رہ میں جو مسافر ہو
نہ پہنچے شام بھی منزل، اگر سحر کو چلے
کوئی دن اور بھی دنیا میں تم[۱] کو رہنا تھا
ابھی سے تم تو میاں مصحفی! سفر کو چلے

---

۱ = ہم کو: پ، ل ۱ -

۲۸۴

یاں ضعف سے یہ گردن زنہار نہیں اٹھتی
واں مارے نزاکت کے تلوار نہیں اٹھتی

کب دردِ جگر مجھ کو بے تاب نہیں کرتا
کب ہوک کلیجے میں یک بار نہیں اٹھتی

کہنے ہی کو رنگینی ہے ابر بہاراں میں
ان آنکھوں سے کوئی[1] بدلی خوں‌بار نہیں اٹھتی

غم خانۂ دل میرا مدت سے ہے افتادہ
یارب کبھی اس گھر کی دیوار نہیں اٹھتی

کب سلک گہر پیارے، بازی ترے دانتوں سے
رکھتی ہے کہ آخر کو وہ ہار نہیں اٹھتی

ق

شب وہ بت بے پروا تھا سب سے الگ بیٹھا
یہ بات سمجھ یاں کچھ تکرار نہیں اٹھتی

میں نے جو کہا اس سے چل بیٹھیے مجلس میں
بن آپ کے واں لذت زنہار نہیں اٹھتی

تب منہ کو پھرا اپنے اک ناز سے وہ کافر
بولا کہ مری اب تو بیزار[2] نہیں اٹھتی

اے مصحفی! میں کیوں کر اس غم کو بھلا ٹالوں
چھاتی پہ مری سل ہے سو یار نہیں اٹھتی

---

۱ - اک : پ ، ل ۱ - بر وزن فع -
۲ - بیزار (ف) جوتی -

۲۸۵

ہر چند خالِ کنجِ ذہن ، دل کا چور ہے
پر ہاتھ کا بھی دزدِ حنا اس کے زور ہے

اے عندلیب ! گا ہے تو ہم کو بھی کچھ سنا
آخر چمن ترے نالے کا شور ہے

کیا جانے خط کو پڑھ کے کسی کے وہ طفلِ شوخ
نت ہاتھ میں پتنگ ہے واں یا کہ ڈور ہے

آتی ہے شب کو واں سے اک آواز دل خراش
تیری گلی میں کیا کسی عاشق کی گور ہے

سچ کہیو کس کے خون کا ساماں کیا ہے آج
فندق بندھی ہوئی جو تری پور پور ہے

پیارے بڑا مزہ ہو جو شب آؤں تیرے پاس
سوتے سے چونک اٹھ کے تو بولے کہ چور ہے

زخموں میں کس کے چور تو آتا ہے **مصحفی**
جامہ تمام خون میں ترا شور بور ہے

۲۸٦

جس وقت کہ کوٹھے پر وہ ماہِ تمام آوے
کیا دور ہے گر اس کو سورج کا سلام آوے

کہتے ہیں کہ عاشق کو آتی ہے اجل جلدی
کس طرح کا آنا ہے نے صبح نہ شام آوے

پاس اپنے ہی رہنے دو تم دل کو مرے صاحب !
پھر اس سے ہے کیا بہتر گر آپ کے کام آوے

پاؤں کو لگا مہندی دل خون کیا میرا
کیا جانیے کیا آفت تا وقتِ خرام آوے

ہم آپ ہی خط لکھ لکھ بھیجیں ہیں اسے ورنہ
مدت ہوئی اودھر سے نامہ نہ پیام آوے
کرواتے نہیں صاحب! تم غیر سے گر چمپی
ہو حکم تو کرنے کو یہ کام غلام آوے
اے **مصحفی**! میں کیوں کر مے پینے سے منھ موڑوں
جب یار ہو خود ساقی با شیشہ و جام آوے

۲۸۷

زلفوں نے تری دیکھ تو کیا کام کیا ہے
کر آپ تطاول[1] مجھے بدنام کیا ہے
اے دل! قدم آہستہ کہ اس فرشِ زمیں پر
محنت زدۂ چند نے آرام کیا ہے
غازے میں یہ خونابِ جگر اپنا ملا کر
ہم نے ہی ترے چہرے کو گلفام کیا ہے
وہ خرقہ کہ آلودۂ صد داغ رہا تھا
زاہد نے اسے جامۂ احرام کیا ہے
صاحب نظراں مژدہ کہ خورشید کی مانند
اس شوخ نے دیدار کو پھر عام کیا ہے
رخسار کو دل دیجیے یا زلف کو یا رد
اس کو کئی معشوقوں نے پیغام کیا ہے
اے **مصحفی**! کل قافلہ یاروں کا ہے راہی
کچھ تو نے بھی چلنے کا سر انجام کیا ہے

۱۔ تطاول: (ع) دست درازی۔

۲۸۸

اک ایسے ہی وحشی کو مرا رام کیا ہے
بے طاقتیِ دل نے غرض کام کیا ہے

میں ہوں وہ قدح کش کہ جسے پیرِ مغاں نے
سر حلقۂ رندانِ سے آشام کیا ہے

آیا سو پھنسا ووں ہی ، مگر رشتۂ الفت
صیاد نے صرفِ قفس و دام کیا ہے

اے وعدہ فراموش ! کہیں[1] اب تو خبر لے
مر مر کے میں اس دن کے تئیں شام کیا ہے

ساقی سے گلہ کیا ہے کہ قسّام ازل نے
قسمت میں مری دُردِ تہِ جام کیا ہے

اس رات ستاروں کی جھکی پڑتی ہیں آنکھیں
اُس مہ نے مگر جلوہ سرِ بام کیا ہے

عارض پہ نہیں خال ، کسی سوختہ جاں نے
سایے میں تری زلف کے آرام کیا ہے

ہر حلقے میں رکھ رکھ گلِ نسرین و شقائق
اُس زلف کو میں روکشِ گل دام کیا ہے

اک حرفِ تمنا تھا مرے دل میں سو میں نے
وہ بھی گروِ نامہ و پیغام کیا ہے

بدنامی سے میری اسے کچھ شرم نہ آئی
بے فائدہ میں آپ کو بدنام کیا ہے

---

۱ - اب اس دل کی خبر لے : ل ۲ -

ہر چند ہوں آوارہ ولے مصحفی میں نے
کس دن گلۂ گردشِ ایام کیا ہے

۴۸۹

دیوار و در اپنے سے اجل آن نہ نکلی
ہے ہے شبِ فرقت میں مری جان نہ نکلی

عالم کے مرقع کو کیا سیر میں لیکن
اس میں بھی کوئی صورتِ انسان نہ نکلی

کب تو نے نظر کی کسی عاشق پہ کہ سو بار
ہو کر وہ تری چشم کے قربان نہ نکلی

ہر چند کہ شانے نے کیا اس کو بہت صاف
لیکن گرہِ زلفِ پریشان نہ نکلی

کیا کھینچے گا تیغا تو مرے قتل کی خاطر
تلوار بھی تجھ سے تو مری جان نہ نکلی

ہر چند سفر ہی میں رہے تو بھی ہمارے
دل سے ہوسِ سیرِ بیابان نہ نکلی

اے مصحفی ! آیا وہ ترے سامنے لیکن
اک بات بھی منہ سے ترے حیران نہ نکلی

۴۹۰

غبغب کی سوج جلوہ ذقن میں چرا گئی
گرتے ہی کچھ کنویں میں یہ بجلی سما گئی

اب بھی ہزار غنچے شگفتن کے ہیں قریب
گو بادِ صبح پھولوں کی ڈالی ہلا گئی

اک شاخِ گل پہ صبح مری جا پڑی تھی آنکھ
قامت کو کھینچ مجھ کو قیامت دکھا گئی

تم دیکھتے ہو اُس کا رخِ گل پہ بولنا
بلبل بھی طرز نالے کی میرے اڑا گئی

بازار سے عرب کے جو گزرا وہ خود فروش
لیلٰی دکانِ ناز کو اپنی اٹھا گئی

ہم دیکھ لیں گے دانۂ یاقوتِ سرخ کو
لوہو کی بوند گر کوئی مژگاں پہ آ گئی

افغاں کہ سرسری سی کسی کی نگاہِ لطف
بیٹھے بٹھائے اک ہمیں تہمت لگا گئی

کیا وہ خرامِ موج تھی آبِ حیات کی
جو اک روش سے خاک کے مُردے جلا گئی

کنجِ قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر
فصلِ بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

۴۹۱

اُس رشکِ مہ کی یاد دلاتی ہے چاندنی
ہر رات مجھ کو آ کے ستاتی ہے چاندنی

آبِ رواں میں حسن ملاتی ہے چاندنی
ہر موج میں گٹھی نظر آتی ہے چاندنی

جا بیٹھتے ہیں ہم لبِ دریا پہ جب کبھو
کیا جھمکے اپنے ہم کو دکھاتی ہے چاندنی

سامانِ بزمِ بادہ میں کرتا ہوں جس گھڑی
آ چاندنی کا فرش بچھاتی ہے چاندنی

صحرا میں جا کے دیکھ کہ ہر رودِ خشک کو
ہم رنگِ جوئے شیر بناتی ہے چاندنی

جب دیکھتی ہے دودھ سا پنڈا ترا میاں !
خجلت سے آب ہی ہوئی جاتی ہے چاندنی

پیارے اندھیری راتیں ہیں ایسے میں مل لے تو
پھر ورنہ چاند چڑھتے ہی آتی ہے چاندنی

گر وہ بھی قدرداں ہو تو بے جذبۂ طلب
روٹھے ہوئے صنم کو ملاتی ہے چاندنی

کیوں کر نہ میں جلوں شبِ ہجراں میں **مصحفی**
بن یار میرے جی کو جلاتی ہے چاندنی

۲۹۲

حضورِ عشق سے اُلفت کا کام کیوں لیجے
جو کام ہو نہ سکے اُس کا نام کیوں لیجے

جو تو نہ دے ہمیں گالی تو وقت بوسے کے
ترے لبوں سے میاں انتقام کیوں لیجے

جو غور اُس کو[1] نہ منظور ہو مرا صاحب
تو بندگی میں کسی کو غلام کیوں لیجے

مرا سلام وہ لیتا نہیں مگر سمجھا
کہ یہ غریب ہے اس کا سلام کیوں لیجے

جو شاخِ گل ہے سو حورِ پیالہ برکف ہے
چمن میں ہاتھ سے ساقی کے جام کیوں لیجے

ترے ہی نام سے تسکینِ دل ہے یا اللہ !
وگرنہ نام ترا صبح و شام کیوں لیجے

۱- اس کی : پ ، ل ۱ ، ۲ -

جو مرغ ہووے قفس کا بھی تنگ اے صیاد !
تو فصلِ گل میں اسے زیرِدام کیوں لیجے

جو دل گرا نہ پڑے مارے بے قراری کے
بغل میں اس کو بھلا تھام تھام کیوں لیجے

خدا جو دیوے سو[1] اس پر ہی رہیے بس قانع
کسی سے مصحفی کچھ قرض و وام کیوں لیجے

۴۹۳

ہم آپھی گر نہ کوچۂ جاناں تلک گئے
نالے ہمارے ضعف سے کب واں تلک گئے

کل بندھ گیا جو گریۂ رنگیں کا تار سا
آنکھوں سے ڈورے خون کے داماں تلک گئے

ہم گل کو چاکِ جیب دکھاویں گے اے نسیم !
اب کے بہار میں جو گلستاں تلک گئے

ان قیدیوں پہ تہمتِ نظّارہ ظلم ہے
زنداں سے اٹھ نہ جو درِ زنداں تلک گئے

کیوں آنکھ جھپکے گل سے مری اس بہار میں
اپنے بھی چاکِ جیب تو داماں تلک گئے

چھاتی پہ چڑھ کے مجھ کو لگا کرنے جب وہ ذبح
فوّارے خون کے اس کے گریباں تلک گئے

پامالِ ناز کر کے انھیں مارے شرم کے
پھر وہ کبھی نہ گورِ غریباں تلک گئے

پاؤں تلک نہ ہم کو رسائی ہوئی دریغ
اوروں کے ہاتھ زلفِ پریشاں تلک گئے

---

۱ - تو : پ ب

اک رفتگی سی ہم میں بھی کل کر گئی اثر
ہم اٹھ کے شہر سے جو بیاباں تلک گئے

زنداں کا جن کو حکم کیا تو نے وے میاں !
کیا کہیے کس خرابی سے زنداں تلک گئے

نرگس تو اک طرف رہی اب کی بہار میں
شہرے اُن انکھڑیوں کے غزالاں تلک گئے

کوچے میں اس کے شور قیامت ہوا بلند
ہم شب کو جی جلا کے جو درباں تلک گئے

اے مصحفی ! دوانے ہیں ہم ان کی بوجھ کے
جو درد مول لے کے نہ درماں تلک گئے

۴۹۴

کون[1] عہدِ وفا اُس بتِ سفاک سے باندھے
سر کاٹ کے عاشق کا جو فتراک سے باندھے

دریاے سرشک اپنا جو طغیان پر آوے
دامن کو وہیں دامنِ افلاک سے باندھے

جاؤں جو حرم میں تو مری آہ کا شعلہ
قندیل ستونِ حرمِ پاک سے باندھے

مژگاں نہ کبھی سدِّ رہِ اشک رواں ہوں
دریا کو نہ کوئی خس و خاشاک سے باندھے

چسپیدگیِ دل سے عجب کیا ہے جو عاشق
تیرا دمِ خنجر جگرِ چاک سے باندھے

---

۱ - کیا : پٹنہ ، کیا عہد کوئی اس بتِ سفاک سے باندھے : سرور

گر دیدۂ بینا ہو تو صناعِ جہاں نے
کیا کیا نہ طلسم ایک کفِ خاک سے باندھے

کشمیر بھی جاؤں تو عجب کیا ہے جو یہ چشم
روتے میں گرو[1] چشمۂ ورناگ[2] سے باندھے

اے مصحفی! شاعر وہی جو ایسی زمیں میں
مضمون نئے قوتِ ادراک سے باندھے

۴۹۵

گلدستہ جو لختِ دل صد چاک سے باندھے
گر تارِ جگر ہو نہ تو کیا خاک سے باندھے

قاتل سے یہ کہیو کہ بھلا ٹک دمِ بسمل
پٹی تو نہ اس دیدۂ نمناک سے باندھے

میں مے سے کروں توبہ تو پھر ابرِ بہاری
اس سال تو خوشہ نہ رگِ تاک سے باندھے

کل میں شبِ ہجراں میں تری غصے کے مارے
الماس کے ٹکڑے جگرِ چاک سے باندھے

ہم سجدہ ادا کر چکے اب سر کو ہمارے
نیزے پہ رکھے، خواہ وہ فتراک سے باندھے

آہوں کے شراروں کو اڑا کل شبِ ہجراں
میں اور بھی تارے کئی افلاک سے باندھے

کیا کیا نہ غزالِ ختنی مصحفی میں نے
اس دشت میں تارِ نظرِ پاک سے باندھے

---

۱ ۔ گرو باندھنا : شرط لگانا ۔
۲ ۔ ورناگ ۔ چشمۂ کشمیر ۔

۴۹۶

جو بندِ قبا یار کے تاپاک[1] سے باندھے
دھجی تو وہ میرے بھی دلِ چاک سے باندھے

کیا لطف ہو ساقی تُو اگر ایسی ہوا میں
گردن کو صراحی کی رگِ تاک سے باندھے

وہ صیدِ رسن بستہ نہ جیتے تُو رہا ہو
جو عشق کی ڈوری ترے فتراک سے باندھے

عاشق شبِ ہجراں میں ان آنکھوں کی طنابیں
ہے خوب تو گر خیمۂ افلاک سے باندھے

دامن کو ترے گھیر سے کیا دور ہے پیارے
گر اپنی ہوا میری کفِ خاک سے باندھے

وہ سروِ رواں آوے اگر جلوہ گری میں
فتنے کے قدم قامتِ چالاک سے باندھے

ہم بیٹھے ہیں کھول اپنی کمر **مصحفی** ہاں اب
جو چاہے سو دل اُس بتِ بے باک سے باندھے

۴۹۷

جب اُس بت نے مہندی بھرے ہاتھ دھوئے
ہم آنکھوں سے یک لخت خوں ناب روئے

نہ رونا مرا سرسری جانو یارو
کہ رونے نے میرے بہت گھر ڈبوئے

---

۱ - تاپاک : بے قرار واضطراب - (شمس اللغات ، ج ۱ ، ص ۱۸۸) -
تپاک : بروزن ہلاک ، بہ معنی تپ ست کہ اضطراب و بے قراری باشد - (برہان قاطع ، ص ۱۰۱)

کریں جستجو کس کی دیکھ اس کو یا رب
گئے ہیں کئی دن سے ہم آپ کھوئے
جنھیں تیری ٹھوکر کا تھا دل میں کھٹکا
لحد میں بھی آرام سے وہ نہ سوئے
نہ فرہاد بےچارہ مقصد کو پہنچا
سدا عشق میں اس نے پتھر ہی ڈھوئے
ز بس شوق تھا اس کو رنگِ حنا سے
مری خاک پر بیج مہندی کے بوئے
شماری کے دانوں کے مانند آخر
سناں نے تری متصل دل پروئے
مگر مصحفی خون رویا ہے چھپ چھپ
ہیں سرخ اب تلک اس کی آنکھوں کے کوئے[1]

۴۹۸

جب تک کہ میرے دل میں تری آرزو رہے
یہ آرزو ہے مجھ کو کہ تو خوب رو رہے
جس صید کا گزر ہو کبھی صید گاہ سے
یوں چاہیے کہ اس کی نظر چار سو رہے
جب ٹانکے توڑ ڈالے ہوں خمیازے کھینچ کھینچ
عاشق کے زخمِ دل پہ کہاں سے رفو رہے
اے دیدہ ! شرطِ گریہ ہے ابرِ بہار سے
اتنا تو کیجیو کہ مری آبرو رہے

---

۱ - آنکھوں کے کوئے : آنکھوں کے گوشے -

جو طفلِ خوب رو کہ ہو آواز اس کی خوب
کیا خوب ہے ہمیشہ اگر خوش گلو رہے
کیا کیا نہ اپنے دل کی نکالوں میں حسرتیں
ظالم گر ایک شب بھی مرے پاس تُو رہے
عاشق وہ چاہیے کہ اگر خاک میں ملے
تو بھی ہمیشہ در پے صد جستجو رہے
میں[1] نے کہا جو اُس سے کہ اٹھ جان من ذرا
بولا کہ میرے ساتھ نہ یہ گفتگو رہے
بوسہ لیا ہو جس نے کبھی تیری زلف کا
مر[2] جاوے وہ تو اس کا دہن مشک بو رہے
ہم نذرِ تیغِ یار کریں اس کو **مصحفی**
گریے کے ہاتھ سے جو بدن میں لہو رہے

۴۹۹

رحمت تری اے ناقہ کشِ محملِ حاجی
چاہے تو کرے راہبِ بت خانہ کو ناجی
کس دن نہ اٹھا دل سے مرے شورِ پرستش
کس رات یہاں کعبے میں ناقوس نہ باجی
میں آپ کمر بستہ ہوں اب قتل پہ اپنے
بن یار ہے جینے سے مرا اب[3] تو خفا جی

---

۱ - میں نے کہا جو س سے کہ آؤ نہ (نا) جان من : پ ، ل ۱، ۲ -
سرور
۲ - مرجائے پر بھی اس کا دہن مشک بو رہے - سرور
۳ - بس کہ : پ ل ۱، ۲ -

اک سینے میں دل رکھتے ہیں ہم سو بھی وہ کیا دل
جو زور رہے لشکرِ سلطاں کا خراجی

تم شب مجھے دیتے ہوئے گالی تو گئے ہو
میں بھی کسی دن تم سے سمجھ لوں گا بھلا جی

شیشہ مےٴ گلگوں کا ہے یا رنگِ شفق سے
رنگ اپنے دکھاتا ہے مجھے چرخِ زجاجی[1]

اے مصحفی ! میں افصحِ شیریں سخناں ہوں
کب مجھ سے طرف ہوسکے ہے ہر کوئی پاجی

۵۰۰

نہیں کرتی اثر فریاد میری
کوئی کس طرح دیوے داد میری

فغانِ جاں گسل رکھتا ہوں لیکن
نہیں سنتا مرا صیّاد میری

تو اے پیغامبر! جھوٹے ہی کہہ[2] کچھ
کہ خوش ہو خاطرِ ناشاد میری

میں تجھ کو یاد کرتا ہوں الٰہی
ترے بھی دل میں ہوگی یاد میری

نہیں ہوتا مقیّد میں کسی کا
طبیعت ہے بہت آزاد میری

اُدھر اے مصحفی ! کیا دیکھتا ہے
غزل سن اے مرے استاد ! میری

---

۱ - زجاج : آبگینہ -
۲ - کچھ کہہ : ل ۱، ۲ -

۵۰۱

اس نزاکت پر پھریں ہم کیوں نہ گل کھائے ہوئے
پھرتے ہو شبنم کا جامہ بر میں بھڑکائے ہوئے

خفتگانِ خاک کی مجھ کو فراغت پر ہے رشک
سوتے ہیں کیا چین سے سب پاؤں پھیلائے ہوئے

لگ رہی ہے خانۂ دل کو ہمارے آگ ہائے
اور ہم چاروں طرف پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

سن کے ہمسایے مرے نالوں کو کہتے ہیں کہ وائے
کس عذابِ جان کے ہم آکے ہمسائے ہوئے

ہم موئے جاتے ہیں مارے انفعالِ عشق کے
دیکھتے ہیں جوں جوں نیچے آپ شرمائے ہوئے

پیچ میں لائے ہیں کیا کیا ٹیڑھے بانکوں کو میاں!
پیچ پگڑی کے تری ہیں یہ جو بل کھائے ہوئے

گل گریباں چاک ہیں تم پر، خبر لو ان کی ٹک
ہر طرف پھرتے ہو کیا چولی کو مسکائے ہوئے

ٹک تو ٹھہرو او میاں صاحب! خدا کے واسطے
اب پھرے جاتے ہو کیدھر سامنے آئے ہوئے

کچھ یہ دل ناداں نہیں اس دل کو ہم اے مصحفی!
کب تلک باتوں میں رکھیں یوں ہی بہلائے ہوئے

۵۰۲

شانے کی عمر گرچہ جدائی میں کٹ گئی
پر زلف بھی فراق میں شانے کے لٹ[۱] گئی

---

۱ - لٹنا : (ہ) دبلا ہونا، کمزور ہونا۔

نرگس کی وے ہیں آنکھیں نہ گل کا وہ رنگ ہے
کچھ ان دنوں چمن کی ہوا ہی پلٹ گئی

چھوڑا نہ ایک لحظہ ترا زلف نے خیال
رخ سے جدا ہوئی تو گلے سے لپٹ گئی

معشوق کو بھلا نہیں عاشق سے اختلاط
بلبل کی ایک چونچ میں غنچے کی پھٹ گئی

جورِ فلک سے ہم نہ کبھی سر اُٹھا سکے
جوں شمع ، زیرِ تیغ ہی یاں عمر کٹ گئی

بازار میں لیے میں دُرِ اشک کو بہ کف
اتنا پھرا کہ قیمتِ اول بھی گھٹ گئی

کہتے ہیں ٹکڑے ٹکڑے ہوا رات **مصحفی**
سنتے ہیں اس کی اپنی طبیعت تو بٹ گئی

۵۰۳

گردن سے میری تیغِ جفا گر پلٹ گئی
گو پلٹی، اس میں کچھ مری قیمت نہ گھٹ گئی

ساعد کے حسن سے یدِ بیضا خجل ہوا
جب اس کی آستین کی مہری الٹ گئی

تو آگے میرے غیر سے باتیں کرے دریغ
اپنی طبیعت ایسی ہی باتوں سے ہٹ گئی

یاں ہم کمر پہ ہاتھ دھرے رہ گئے ، وہاں
پٹکے کے ساتھ زلف کمر سے لپٹ گئی

اس چاک آستیں کا ذرا دیکھیو پھبن
اس بانک پن سے[1] غنچے کی کہنی نہ پھٹ گئی

---

۱ - ب ; ل ۲ -

انداز میں نگاہ کے مارا پڑا کوئی
گردن کسی کی تیغِ تغافل سے کٹ گئی

دن رات اُس گلی میں یہی ماجرا رہا
کب عاشقوں کی در سے ترے بھیڑ چھٹ گئی

لگنے چلی تھی آنکھ کہ اتنے میں **مصحفی**
بولا جو مرغِ صبح تو پھر نیند اُچٹ گئی

۵۰۴

قدغن ہے کہ در تک کوئی یاں آنے نہ پاوے
اور بے خبر آوے بھی تو پھر جانے نہ پاوے

واں روزنِ دیوار بھی اب بند ہوئے ہیں
تا سینے کے روزن کوئی دکھلانے نہ پاوے

یوں صاحبِ بستاں کا ہے اب حکم کہ صیاد
اس باغ میں بلبل کا قفس لانے نہ پاوے

تو آگے ہی جا بیٹھ دلا! بزم میں اُس کی
تا آکے کوئی کچھ اُسے سکھلانے نہ پاوے

کیا خاک کرے سحر، ترے نقش قدم کی[1]
جو خاک بھی اس کوچے سے لے جانے نہ پاوے

تو شوق سے لچکا قد جوں شاخِ گل اپنا
پر موے کمر دیکھیو بل کھانے نہ پاوے

کعبے میں تو ہم کو نہ ملا **مصحفی** یارو
بھیجو کوئی قاصد اسے بُت خانے نہ پاوے

---

۱ - کو : ل ۲ -

۵۰۵

اک پل میں بھلائے سب دکھ درد زمانے کے
صدقے میں گیا تیری اس آنکھ لڑانے کے

ہم نے نہ لگایا دل ہر چند کہ عالم میں
اسباب مہیا تھے سب دل کے لگانے کے

ازبس کہ سوا اپنے باقی نہیں یاں کوئی
ہم اس لیے حیراں ہیں اس آئنہ خانے کے

اس آنے و[1] جانے میں کیا ناز نکلتا ہے
صدقے ترے آنے کے، قرباں ترے جانے کے

رفتار تری ہم پر لائی تھی قیامت کل
انداز تھے سب اُس میں مُردوں کے جِلانے کے

گو تو نہ برا مانے، ہم سے تو نہ ہوگا یہ
دیکھیں گے تری زلفیں ہم ہاتھ میں شانے کے

میاں[2] **مصحفی** اتنا تو رویا نہ کرو صاحب!
خوناب سے سب تر ہیں تکیے بھی سرہانے کے

۵۰۶

جو تیغ خوش غلاف کل اُس کی اُگل پڑی
گاوِ زمیں زمین کے نیچے اُچھل پڑی

یہ چہچہے ہیں اُس کے تو دیکھو گے باغ میں
بلبل کے آشیان پہ برق آج کل پڑی

---

۱ - ''واو'' سہو کاتب معلوم ہوتا ہے - (فائق)

۲ - بروزنِ فع -

باد صبا نے آس کے یہ کیا کان میں کہا
گل کی کلی جو کپڑوں سے باہر نکل پڑی

شیشے کا کچھ گناہ نہیں اس میں دختِ رز
آس کی صفائی دیکھ کے تو بھی آچھل پڑی

دشمن تھا میرا یہ دلِ بے تاب **مصحفی**
مجھ کو ملایا خاک میں تب اس کو کل پڑی

۵۰۷

ترا شوقِ دیدار پیدا ہوا ہے
پھر اس دل کو آزار پیدا ہوا ہے

سدا پان کھا کھا کے نکلے ہے باہر
زمانے میں خوں خوار پیدا ہوا ہے

یہ مدفن ہے کس کا جو ہر لالہ یاں سے
جگر خوں ، دل افگار پیدا ہوا ہے

آڑائے ہیں لختِ جگر آہ نے جب
ہوا میں بھی گلزار پیدا ہوا ہے

میں کیوں کر نہ رکھوں عزیز اپنے دل کو
کہیں دل سا بھی یار پیدا ہوا ہے ؟

کہے تھی یہ طفلی میں دیکھ اس کو دایہ
یہ لڑکا طرح دار پیدا ہوا ہے ؟

میں آیا ہوں مدت میں کوئی اس سے کہہ دو
تمھارا گنہ گار پیدا ہوا ہے

یہ دل مجھ سے لڑتا ہے تیری طرف سے
کہاں کا طرف دار پیدا ہوا ہے

میاں مصحفی بیچتے ہو جو دل کو
تو لاؤ خریدار پیدا ہوا ہے

۵۰۸

ہم نہ فرہاد ہیں جو تیشے سے سر چیریں گے
ہاتھ آ جائے گا خنجر تو جگر چیریں گے

بستہ بالی نے بہت تنگ کیا ہے یارب !
وقت پرواز کے ہم بھی کبھی پر چیریں گے

تو نہ ہووے گا کبھی خانہ نشیں گر عشاق
چوبِ صندل سے ترے تختۂ در چیریں گے

تیغِ ابرو سے تری میں نہ پھروں گا ہرگز
مجھ کو آرے کے تلے رکھ کے اگر چیریں گے

مر گئے ہم تو گریبان کفن کی جاگہ
قدسیاں آ کے گریبانِ سحر چیریں گے

عقدۂ دل نہ کھلا ناخنِ ابرو سے تری
اس معمے کو ہم اب لے کے تبر چیریں گے

ہم وہ ہتھ چھٹ ہیں کہ گر ہووے گا دشمن جوں کوہ
ایک ضربت میں اسے تا بہ کمر چیریں گے

مصحفی کشتۂ شمشاد قداں ہے ، ہم تو
اس کے تختوں کو کوئی تازہ شجر چیریں گے

۵۰۹

اس کے ہاتھوں سے ہیں سب آئینہ گر فریادی
آرسی کس نے یہ لے جا کے اسے پہنا دی[۱]

---

۱ ۔ دکھلا دی : پ ، ل ۱ ، ۲ ۔

آنکھیں چندھیا گئیں دامن کی کناری سے تری
جنبشِ پا نے تری بجلی سی اک[1] چمکا دی

کل جو کھینچا میں اُسے تنگ بغل میں تو کہا
"چھوڑ بے! تونے تو چولی مری سب مسکا دی"

ہم اسیروں کی بھی کچھ یاد ہے اُن کو یارب!
وے جو لوٹیں ہیں بہارِ چمنِ آزادی

ذبح کرتا ہے وہ بت نظروں میں مجھ کو اور لوگ[2]
یہی کہتے ہیں کہ "اللہ رے تری جلاّدی"

ہو کے چنگا جو میں آیا تو مرے قاتل نے
مجھ پہ اک وار کی پھر نامِ خدا ڈُھہرا دی

مصحفی میں تو نہ لکھتا تھا ولے کیا کیجے
مجھ سے خامے نے غزل اور بھی اک لکھوادی

۵۱۰

چلتے چلتے جو کمر اُس نے ذرا لچکا دی
مجھ کو ایک آن میں بجلی کی ادا دکھلا دی

کثرتِ گریہ سے دل ڈھے کے ہوا خاک کا ڈھیر
اب کے بارش نے عمارت ہی یہ سب بٹھلا دی

تھی مرے ہاتھ میں ساقی کے، گلابی مے کی
ہنستے[3] ہنستے ابھی دکھلا کے مجھے چھلکا دی

---

۱ - جب: پ ل ۱، ۲ -
۲ - یوں: پ -
۳ - ہنستے ہنستے مجھے دکھلا کے ابھی چھلکا دی: ل۱،۲ -

سیکڑوں خون کیے اُس نے عجب کیا اُس کا
عشق نے گردنِ فرہاد اگر کٹوادی
تنگ پوشی میں مزا اس نے جو پایا تو وہیں
چولی انگڑائیاں لے لے کے سبھی مسکا دی
راہ جاتے مجھے کل پھر کے جو دیکھا اُس نے
آہ لا کر کے لبوں پر ، میں وہیں ٹھہرا دی
حکمِ سلطاں ہے کہ اس محکمۂ عدل کے بیچ
دستِ فریاد کو اونچا نہ کرے فریادی
میں نہ بھولا اُسے تا زیست تری آنکھوں نے
وہ جو اک بات اشاروں میں مجھے سمجھا دی
مصحفیؔ جل کے میں گر خاک ہوا اُس کو میں
میرے دشمن نے مری خاک بھی لے اُڑوا دی

۵۱۱

نظر آتے ہیں پردے تیری آنکھوں کے گلابی سے
کہیں مے پی ہے تو نے یا اٹھا ہے نیم‌خوابی سے
ہوا میں ہے وہ کیفیت کہ نخل اس باغ کے سارے
گلے میں باہیں ڈالے ہیں کھڑے باہم شرابی سے
نمودِ رنگِ گل یوں غنچۂ سوسن کی تہ میں ہے
شرابِ سرخ دیوے جلوہ جوں اودی گلابی سے
بھلا سچ کہیو پیارے کس کا ان سے خوں ٹپکتا ہے
حنا آلودہ یہ جو ہاتھ ہیں تیرے شہابی سے
نزاکت پر نظر کیجو کہ کل اس نے شبِ مہ میں
چھپایا چاند سے مکھڑے کو اپنی آفتابی سے

کج[1] و وا کج پڑے تھا بس کہ مستی میں قدم اس کا
گھر اپنے تو میں لایا اس کو شب ، پر سو خرابی سے

خدا کے واسطے مکھڑا چھپا ورنہ قیامت ہے
پڑا ہے شور اک عالم میں تیری بے حجابی[2] سے

جو میرا دل نہیں جلتا تو پیارے میرے پہلو پر[3]
اٹھا لیتا ہے تو کیوں ہاتھ کو رکھ کر شتابی سے

سوالِ بوسہ پر سو سو سنائیں گالیاں مجھ کو
کوئی عہدہ برآ ہو کیوں کہ اس حاضر جوابی سے

مکانِ مصحفی اس کو نہ سمجھو ، آپ کا گھر ہے
تکلف کچھ نہیں کھل بیٹھیے یاں بےحجابی سے

۵۱۲

دل چیز کیا ہے ، چاہیے تو جان لیجیے
پر بات کو بھی میری ذرا مان لیجیے

مرنے تڑپ تڑپ کے ، دلا کیا حصول ہے
سر پر کسی کی تیغ کا احسان لیجیے

آتا ہے جی میں چادرِ ابرِ بہار کو
ایسی ہوا میں سر پہ ذرا تان لیجیے

میں بھی تو دوستدار تمھارا ہوں میری جاں
میرے بھی ہاتھ سے تو کبھو پان لیجیے

کیجے شریک ہم کو بھی اے دل ! روا نہیں
یوں آپھی آپ لذتِ پیکان لیجیے

---

۱ - کج و وا کج : ٹیڑھا ، ترچھا -
۲ - بے نقابی : پ (حاشیے پر) ل ۱ ، ۲ -
۳ - سے -

اس اپنی تنگ چولی پہ ٹک رحم کیجے جاں
خمیازہ اس طرح سے نہ ہر آن لیجیے

گر قبرِ کشتگاں پہ تم آئے ہو تو میاں !
اپنے شہیدِ ناز کو پہچان لیجیے

بوسے کا جو تمھارے گنہگار ہو میاں
لازم ہے اس سے بوسہ ہی تاوان لیجیے

وحشت کے دن پھر آئے ہیں اس نوبہار میں
اے چاکِ جیب پھر رہِ داماں لیجیے

مشکل نہیں ہے یار کا پھر ملنا **مصحفی**
مرنے کی اپنے جی میں اگر ٹھان لیجیے

۵۱۳

پان کھا کر گھر سے باہر یوں نہ آیا کیجیے
آرسی میں منھ کو اپنے منھ دکھایا کیجیے

چاند سا منہ کھول دینا تم کو یوں لازم نہیں
دیکھ کر ایدھر اُدھر برقع اٹھایا کیجیے

میں نہ مانوں گا کہ تم بھی چاہتے ہو مجھ کو ہائے
جھوٹی باتوں سے نہ میرا جی جلایا کیجیے

گر خوشی ہے آپ کی میرے ستانے میں تو خیر
میں بھی اب مانع نہیں ، اچھا ستایا کیجیے

دیکھتے ہی مجھ کو تم آنکھیں چرا لیتے ہو کیا
اک ذرا چتون سے تو ملایا کیجیے

نیک و بد سب جانتے ہیں تم کو با شرم وحیا
شوخ چشموں سے نہ یوں آنکھیں لڑایا کیجیے

یار نے گالی بھی دی تو کیا ہوا میاں **مصحفی**
ہر گھڑی اس بات کو منھ پر نہ لایا کیجیے

۵۱۴

سیاہی کیا بیاں کیجے تری زلفوں کے بالوں کی
کہ دیکھے سے جنھوں کے جان[1] لہراتی ہے کالوں کی

کوئی زنّاریوں سے سر فرو لاتا ہے وہ کافر
جو پگڑی چھین لے دھولیں لگا تسبیح والوں کی

کمر کی فکر میں تیری سدا حیران رہتے ہیں
نہیں کچھ کام کرتی عقل یاں نازک خیالوں کی

ہنسو ہو جانِ من تم اس لیے آشفتہ حالوں پر
کہ صورت آپ نے دیکھی نہیں آشفتہ حالوں کی

بہ رنگِ آئنہ میں سامنے حیراں کھڑا دیکھوں
تو اے حجام! یوں لیوے صفائی اس کے گالوں کی

جگر کس کا ہے ایسا اب جو ان کے سامنے آوے
دکن تک دھوم پہنچی ہے تری مژگاں کے بھالوں کی

اگر خورشید سے روشن ہوں تو بھی خوار پھرتے ہیں
غرض اس دور میں یہ قدر ہے صاحب کمالوں کی

دیارِ عشق میں ہر اک کے منھ پر خاک اڑتی ہے
عجب صورت میں دیکھی اس نگر کے رہنے والوں کی

ہمارے دام میں اے **مصحفی**! وہ کس طرح آویں
کمندِ زلف میں گردن ہے جن رعنا غزالوں کی

---

۱ - بات : ل ۲، پ

۵۱۵

رسائی عرش تک کیوں کر نہ ہووے اس کے نالوں کی
لگی ہو چوٹ جس کے دل پہ ان چھڑیوں سے بالوں کی

اگر دیکھیں ترے قد کی لٹک اے شاخِ گل ! اک دن
لٹک مل جائے ساری خاک میں نازک خیالوں کی

گلابی پھینٹے ڈالے اپنی نظروں سے تو سب گذرے
بہار اب دیکھنی ہے زعفرانی چیرے والوں کی

کبھی ابرِ سیہ میں جیسے بجلی کوند جاتی ہے
چمک زلفوں میں یوں دیکھی ترے کانوں کے بالوں کی

تری نازک کمر کو مُو بھی کہتے وہ تو ڈرتے ہیں
طبیعت بس کہ نازک ہوتی ہے نازک خیالوں کی

مرکب کی جگہ نوکِ قلم سے خون ٹپکتا ہے
تماشا گاہ ہے تحریر ہم رنگیں مقالوں کی

چبھیں ہیں دل میں یہ بوٹے سے قد اے مصحفی ! میرے
بلائے جان ہو ہے دوستی ان خورد سالوں کی

۵۱۶

جب زہ[1] اس کی کمان پر آئی
آفت ہر اک نشان پر آئی

کانپ اٹھا میں تو ، رات بلبل کے
برق جب آشیان پر آئی

ہیں تری تیغ میں جو دندانے
کیا کسی استخوان پر آئی ؟

---

۱ - زہ : کمان کا چلّہ -

گردشِ چشم سے تری اے شوخ !
اک مصیبت جہان پر آئی

مصحفی دردِ دل کہے ہی بنے
بات اب تو زبان پر آئی

۵۱۷

جی کی دشمن اس کی زلفوں کی پریشانی ہوئی
ہم نے کیوں چھیڑا اسے[1]، کیا ہم سے نادانی ہوئی

غم بڑا یہ ہے کہ آخر با چنیں سعیِ بلیغ
ہم کو کسبِ عشق سے حاصل پشیمانی ہوئی

بس کہ سر رگڑا کیا میں آستانِ یار پر
ماہِ نو کی طرح صرفِ سجدہ پیشانی ہوئی

یاد کر کس ناوکِ مژگاں کو خوں رویا کہ رات
اشک کی ہر بوند جیسے لعلِ پیکانی ہوئی

کیوں کہ ہم ضامن ہوں یا رب اچپلاہٹ کے تری
برق کے شعلے کی تسن سے کب نگہبانی ہوئی

گریۂ شب سے یہ سوز اپنا گھٹا کچھ ہلکہ اور
آتشِ دل پر ہماری روغن افشانی ہوئی

اے زلیخا ! اس قدر بے صبری اب کیا فائدہ
ساتھ ہی یوسف کے تو بھی کیوں نہ زندانی ہوئی

بس کہ شانِ حسن میں یوسف سے تو کچھ کم نہ تھا
صفحے پر تصویر تیری یوسفِ ثانی ہوئی

---

۱ - انھیں : ب ل ، ۲ -

شب تری مجلس وہاں دورِ قدح چلتا رہا
تا سحر یاں آنسوؤں کی سبحہ گردانی ہوئی

اک نگاہ آشنا پر تھا مدار اپنا دریغ
اس سمیں کو دیکھ وہ بھی ہم سے بیگانی ہوئی

شب دلِ بیمار میرا دیر سے تھا محتضرا
بارے ٹک آتے ہی تیرے اس کی آسانی ہوئی

ایک دم پاسِ سخن سے میرے تئیں فرصت نہیں
شعر بانی بھی کہیے تو اک جہاں بانی ہوئی

بس کہ کیشِ کفر میں کامل تھے ہم اے مصحفی!
دیرِ ترسا کی مفوّض ہم کو رہبانی ہوئی

۵۱۸

آئے ہے دل میں خس و خار سے اک ہیبت سی
آشیاں سے مجھے کچھ ہو گئی ہے وحشت سی

سرِ بالیں میں علیلانہ پڑا رہتا ہوں
ان دنوں جاتی رہی ہے مری کچھ طاقت سی

شکر قاتل کا کروں کیا کہ بہ زیرِ دمِ تیغ
جوں جوں تڑپوں ہوں مجھے آوے ہے اک لذت سی

برقِ شمشیرِ تغافل کا کہوں کیا انداز
ناگہاں سر پہ مرے آ پڑی اک آفت سی

جب سے دیکھی ہے میں اوضاعِ فلک، رہتی ہے
مثلِ آئینہ شب و روز مجھے حیرت سی

---

۱ - محتضر: جو بیمار کہ جان کندن کی حالت میں ہو یا ایسا شخص جو قریب المرگ ہو - (ترجمہ فرہنگ عمید، ص ۱۰۵۸) -

تیری تصویر ہی دن رات پڑا دیکھوں ہوں
بس کہ کچھ اس سے مجھے ہوگئی ہے الفت سی
اے شبِ مرگ! میں بس تیرا بھی شہرہ دیکھا
تیرہ و تار کہاں ہے تو شبِ فرقت سی
مصحفی کے جو تو بالیں پہ دمِ نزع نہ تھا
اس کی آنکھوں سے عیاں ہوتی تھی اک حیرت سی

۵۱۹

مجھ سے نسیمِ قدس بھی پیچھے کہیں رہی
مقدور ہر کسی کا نہیں میری ہمرہی
افسوس یہ رہا کہ بہ ہنگامِ ذبح بھی
قاتل سے میں نے آرزوے دل نہ کچھ کہی
نظروں میں ہر کسی کی سبک تو میں ہوچکا
کیا جانے کیا دکھاوے گی اب آگے بے تہی
کندن سے رنگ کو ترے کب پہنچے ہے میاں
جلوے میں گرچہ ہے زرِ خورشید دہ دہی[1]
جو ہیرے کی کنی کہ نہاں دل میں میرے تھی
آخر لباسِ اشک میں وہ آب ہو بہی
رکھے وہ کس طرح سے خبر میرے عشق کی
جب اپنے حسن سے بھی نہ ہو اس کو آگہی
اب کے جو تو نے نامہ لکھا مجھ کو مصحفی
میں اس کو رکھ دوں شعلۂ آتش پہ تو سہی

---

۱ - دہ دہی : در اصطلاح حساب مقادیر یا ارقامی کہ دہ ، دہ بزرگ یا کوچک نمود ، اعشاری ، ونیز بہ معنی زرِ بے غش -
(فرہنگ عمید ، ص ۶۰۱)

۵۲۰

کیا لچک نتھ کی ہے اور کیا ہی ڈھلک موتی کی ہے
کوند بجلی کی کہوں یا یہ لپک موتی کی ہے
اس جھجکنے سے ترے دیکھا تو کچھ کم ہی نہیں
یہ جو عارض پر ترے کافر جھمک موتی کی ہے
ایک تو رخسار کی تیرے جھلک کرتی ہے قہر
آب‌داری میں بلا تس پر جھمک موتی کی ہے
اشک آنکھوں سے مری چنی سے گرتے ہیں صنم
بس کہ ان آنکھوں میں سرخی اب تلک موتی کی ہے
ٹک ڈھلاوٹ کو ذرا تم اس غزل کی دیکھیو
ایک پنہاں[1] وصف اس میں منسلک موتی کی ہے

۵۲۱

یہ تیروں کا کس کے نشانہ ہوا ہے
جو دل میرا زنبور خانہ ہوا ہے
کہیں راہ بھولے ہو شاید، تمھارا
ہماری طرف کو جو آنا ہوا ہے
میں پھڑکا ہوں یاں تک کہ کنجِ قفس میں
پروں کا مرے آشیانا ہوا ہے
کرے قد کشی کیوں نہ سروِ چمن سے
وہ نامِ خدا اب تو سیانا ہوا ہے

---

۱ - پاک بیناں : ل ۲ -

شکنجے میں زلفوں کے کھینچ اس کو لڑکے[1]
یہ ملا بہت چار شانا[2] ہوا ہے

خبر لے شتاب ان کی صیاد آکر
قفس بلبلوں کا پرانا ہوا ہے

نہیں خوں کا اک قطرہ اب اس میں باقی
یہ دل تیری مژگاں کا چھانا ہوا ہے

جو بھیجا ہے اس پاس میں اپنے دل کو
تو پیچھے سے قاصد روانا ہوا ہے

ق

کل آسودگاں کی جو تربت سے گزرا
جنھیں خواب کرتے زمانا ہوا ہے

پڑا ایک مرقد پہ جوں پاؤں میرا
یہ آئی صدا کیا "دوانا ہوا ہے؟"

ترے در پہ بیٹھا ہے گھٹنوں کو پکڑے
یہی **مصحفی** کو بہانا ہوا ہے

۵۲۲

مستی ہے کہ اک ابرِ دھواں دھار اٹھا ہے
اس مستی سے کتنوں کو ابھی مار اٹھا ہے

پیارے جو موا خواہشِ دیدار میں تیری
وہ حشر کو بھی طالبِ دیدار اٹھا ہے

دیکھے جو کوئی اس کو تو کہتا ہے کہ اللہ
یہ طفل بھی کیا شوخ و جفا کار اٹھا ہے

۱ - اک دن : ل ۲ ۔
۲ - مردِ تنومند کہ دارائے شانہ ھائے پہن باشد (فرہنگ عمید ، ص ۳۸۹)

خوں کننوں کا سرخی نے اُن آنکھوں کی کیا ہے
جب صبح کو سوتے سے وہ خوں خوار اٹھا ہے

اس بزم میں آیا ہے مرا ذکر تو ناگاہ
وہ ہاتھ میں لے کر وہیں تلوار اٹھا ہے

چاند ابر میں جاتا ہے چھپا شرم کے مارے
شاید کہ ترا پردۂ رخسار اٹھا ہے

چکھا ہے مرے خوں کو گر انگشت سے اس نے
مانندِ عسل اس میں بھی اک تار اٹھا ہے

کیا[1] خوں میں رنگے تھے یہ کہیں رات کو تو نے
بازی ترے ہاتھوں سے جو گل ہار اٹھا ہے

ق

کل ہاتھ پہ کرتا تھا ترے گل بھی گرانی
تو آج بایں وضع مرے یار اٹھا ہے

میں ساعدِ نازک کے ترے صدقے ہوں تجھ سے
کیوں کر قفسِ مرغِ گرفتار اٹھا ہے

اے مصحفی! دل جس نے اٹھایا ہے جہاں سے
اٹھتے ہوئے وہ یاں سے سبک بار اٹھا ہے

۵۲۳

تری چپ تو ہے خصمِ جانی ہماری
تو بولے تو ہو زندگانی ہماری

جگہ سے نہ ہلنے دیا اس نے آخر
ہمیں لے رہی ناتوانی ہماری

---

۱ - کیا خوں میں رنگے تھے (یہ) کہیں رات کو تو نے:
تصحیح قیاسی از فائق -

جز الفت کے تیری نہ کچھ خاک پایا
فلک نے بہت خاک چھانی ہماری

یہ ممکن نہیں ہے کہ عشقِ بتاں میں
ہمیں چین دے بدگمانی ہماری

جوانی میں ہم سے ملو تا ہمیشہ
دعا دیوے تم کو جوانی ہماری

تری تیغِ ابرو کا ہم پر کرم تھا
کٹی خوب تب زندگانی ہماری

پڑے ہیں کئی استخواں اس گلی میں
یہی رہ گئی ہے نشانی ہماری

بہت سر کو خالی کیا ہم نے لیکن
نہ نبڑی نہ نبڑی کہانی ہماری

شب آخر ہوئی **مصحفی** ، جا پڑی اب
بروزِ دگر قصہ خوانی ہماری

۵۲۴

عمر گزری ہے ہمیں نالۂ و زاری کرتے
کاش ہم اس بتِ کافر سے نہ یاری کرتے

بر سرِ شکوہ بھی لائی نہ ہمیں اس کی نگاہ
تا اسی پردے میں ہم شکر گزاری کرتے

بار مجلس میں تری ان کو نہیں ورنہ میاں
مہر و مہ آ کے ابھی آئنہ داری کرتے

تو کہاں کا تھا بھلا یہ تو ہمیں بتلا دے
ہم بھی ٹک گریہ گر اے ابرِ بہاری ! کرتے

عشق میں چل نہ سکا پیش ہمارا ورنہ
ہم قبول اپنے اوپر ذلت و خواری کرتے

اپنے کہنے میں نہیں نشترِ مژگاں اس کے
ورنہ یوں خوں نہ مری چشم سے جاری کرتے

کوئی پرکالا جگر کا نہ گرا آنکھوں سے
کہ ہم اس کو ترے دامن کی کناری کرتے

مصحفی یار ہیں اس وقت کے سب مردہ پسند
بد نہ تھا ہم بھی تخلص جو مزاری کرتے

۵۲۵

نہ کہیں صبح ہی ہوتی ہے نہ خواب آتا ہے
رات کیا آتی ہے اک مجھ پہ عذاب آتا ہے

قاصد اس کوچے سے پھرنے کا نہیں اے ہمدم !
جھوٹ کہتا ہے کہ نامے کا جواب آتا ہے

کیا کروں اس لبِ شیریں سے سوالِ بوسہ
مجھ کو اس بات کے کہنے سے حجاب آتا ہے

جان قالب میں نہیں رہتی مری ، جب کہ رقیب
ساتھ گھوڑے کے ترے پکڑے رکاب آتا ہے

میں ترے واسطے سر پٹکوں ہوں دیواروں سے
چین کس طرح تجھے خانہ خراب آتا ہے

ہستیِ پوچ سے اپنی مجھے دیتا ہے خبر
سامنے میرے جو دریا سے حباب آتا ہے

ہوگیا ہے مرا گریے سے زبس دل خالی
اشک آنکھوں میں مری جیسے حباب آتا ہے

فرصتِ وقت غنیمت ہے کہ اے دل ! وہ شوخ
آج اس راہ سے پھر مستِ شراب آتا ہے

مصحفی کے بھی کچھ احوال سے ہے تجھ کو خبر
روز اس کوچے میں با چشمِ پُر آب آتا ہے

۵۲۶

نہ گل کے نہ یاسمن کے صدقے
چنپا سے ترے بدن کے صدقے

ہر حلقۂ زلف میں مرا دل
ہوتا ہے شکن شکن کے صدقے

بیٹھا ہو جس انجمن میں وہ شوخ
میں ساری اس انجمن کے صدقے

حسرت یہ رہی کہ فصلِ گل میں
ہم کیوں نہ گئے چمن کے صدقے

پروانے کے شوق کو تو دیکھو
ہوتا ہے پڑا لگن کے صدقے

نکلا ہے تُو آج زور سج سے
ہوں کیوں نہ میں اس پھبن کے صدقے

تیشے سے قلم کا کام کرنا
تردستیِ کوہ‌کن کے صدقے

تلوار تو زور ہی سجی ہے
صدقے ترے بانک پن کے صدقے

وہ تشنہ ہوں میں کہ دن میں سو بار
ہوتا ہوں چہِ ذقن کے صدقے

نکلے نام اس کا جس دہن سے
ہو جائیے اس دہن کے صدقے

جامہ تو پھبے ہی ہے پر اس کی
زیبائیِ پیرہن کے صدقے

اے مصحفی! کیا غزل لکھی ہے
تیری روشِ سخن کے صدقے

۵۲۷

یہ آنکھیں ہیں تو سر کٹا کر رہیں گی
کسو سے ہمیں یاں لڑا کر رہیں گی

اگر یہ نگاہیں ہیں کم بخت اپنی
تو کچھ ہم کو تہمت لگا کر رہیں گی

یہ سفّاکیاں ہیں تو جوں مرغِ بسمل
ہمیں خاک و خوں میں ملا کر رہیں گی

کیا ہم نے معلوم نظروں سے تیری
کہ نظریں تری ہم کو کھا کر رہیں گی

یہ آہیں ہیں تو ایک دن آسماں کو
جلا کر، کھپا کر، اڑا کر رہیں گی

اگر گردشیں آسماں کی یہی ہیں
تو ہم کو بھی گردش میں لا کر رہیں گی

یہ آنکھیں ہیں تو ایک دن مصحفی کو
نگاہوں کے اندر فنا کر رہیں گی

۵۲۸

یادِ فندق میں شب اس دل نے جو بے تابی کی
میں نے رو رو کے لہو، ہر مژہ عنّابی کی

اک ذرا کھول کے پڑھ اُس کو کہ ظاہر ہے تمام
میرے نامے سے حقیقت مری بے خوابی کی
جلوۂ حسن کے آگے ترے ، اے ماہ منیر !
روشنی پھیکی ہوئی جاتی ہے مہتابی کی
سازِ دل وہ ہے کہ ہر تار کے اوپر جس کے
سال ہا ناخنِ اندوہ نے مضرابی کی
اب تک آنکھوں سے مری اشک بہے جاتے ہیں
اک جھلک دیکھی تھی اُس پیرہنِ آبی کی
پیشِ محراب میں کرتا تو ہوں سجدہ لیکن
دل سے جاتی نہیں یاد ابروے محرابی کی
مصحفی ہوں میں گداے درِ شاہنشہِ عشق
آرزو مجھ کو نہیں خانی و نوّابی کی

۵۲۹

نصیبوں سے کوئی گر مل گیا ہے
تو پہلے اس پہ اپنا دل گیا ہے
کرے گا یاد کیا قاتل کو اپنے
تڑپتا یاں سے جو بسمل گیا ہے
لگے ہیں زخم کس کی تیغ کے یہ
کہ جیسے پھوٹ سینہ کھل گیا ہے
خدا کے واسطے اُس کو نہ لاؤ
ابھی تو یاں سے وہ قاتل گیا ہے
کوئی مجنوں سے ٹک جھوٹے ہی کہہ دے
کہ لیلیٰ کا ابھی محمل گیا ہے

اگر ٹک[1] کی ہے گا ہے ہم نے جنبش
پہاڑ اپنی جگہ سے ہل گیا ہے

کوئی اے **مصحفی**! اس سے یہ کہہ دے
دعا دیتا تجھے سائل گیا ہے

۵۳۰

ہم تو بیٹھے ہی رہے یار کے در کے آگے
کھائیں سو ٹھوکریں پر واں سے نہ سرکے آگے

وے نہیں ہم کہ سپر سینے پہ اپنے رکھیں
بلکہ رکھ دیتے ہیں سینے کو سپر کے آگے

صرف اے دیدہ! کوئی لختِ جگر روتا ہے
چاہیے اشک بھی ہوں لختِ جگر کے آگے

یک بیک جا جو پڑی اس گل نازک پہ نگاہ
پھر گئے سیکڑوں رنگ اپنی نظر کے آگے

مجھ کو یہ ڈر ہے چرائیں نہ کہیں حسن ترا
منھ کو مت کھولیو تو شمس و قمر کے آگے

گریہ رکتا ہی نہیں ہم سے تو رومال ہی ایک
باندھ رکھیں گے اب اس دیدۂ تر کے آگے

مصحفی[2] اس کو ہی کہتے ہیں، سنا ہی ہوگا
وہ جو کل غش میں پڑا تھا ترے در کے آگے

۵۳۱

بیٹھا مونڈھے کو بچھا جب کہ وہ در کے آگے
خون کتنوں کے ہوئے یار کے گھر کے آگے

---

۱ - اگر ٹک کی ہے ہم نے ایک جنبش : ل ۲ -
۲ - مصحفی ان کو ہی کہتے ہیں سنا ہووے گا : پ ل ۱، ۲ -

بال اک وضع پہ رہتے ہی نہیں کافر کے
کبھی پیچھے تو کبھی ہیں وے کمر کے آگے
دجلۂ خشک کی مانند نظر آتا ہے
پاٹ دریا کا مرے دامنِ تر کے آگے
صدمۂ آہ کہیں اُس کو نہ پہنچا ہووے
اور تو کچھ نہیں اک دل ہے جگر کے آگے
داغ سینے کے مرے دیکھے جو اس نے تو کہا
پھول اتنے تو نہ تھے تیری سپر کے آگے
منتظر فیض کا رہ موے جبیں سے اس کے[1]
صبح نورانی ہے اس تیرہ سحر کے آگے
بے ہنر گو کہ کرے آکے ہنر کا دعویٰ
پیش جاتی ہے کوئی اہلِ ہنر کے آگے
دیکھ کر مجھ کو ہوا چیں بہ جبیں مجلس میں
اپنی[2] جا سے جو ٹک اک ہم کبھی سرکے آگے
مصحفی کیا ہو اگر سب سے میں آنکھوں کو سیا
میرا مطلوب تو ہے میری نظر کے آگے

۵۳۲

سر اُس کے پہ کیا کوئی دستار باندھے
جو پھرتا ہے گلیوں میں زنّار باندھے
کمر باندھتے تو کیا قتلِ عالم
قیامت ہے جس دم وہ تلوار باندھے

---

۱ - نے : ل ۱ -
۲ - اپنی جاگہ سے جو اک ہم کبھی سرکے آگے : ل ۲ -

کوئی سحر سے باندھتا ہے[1] دکاں کو
وہ کافر جو آوے تو بازار باندھے

ہو دشوار بانکوں کو پھر سر اٹھانا
جو بل‌دار پھینٹا وہ خوں خوار باندھے

فرشتہ بھی گر آ اس کے آ جائے آگے
پکڑ ہاتھ مثلِ گنہ‌گار باندھے

نہ ساون کرے پھر برسنے کا دعویٰ
جو یہ دیدۂ تر کبھی تار باندھے

ہے صرفہ اسی میں کہ یاں مردِ عاقل
دل اپنا کسی سے نہ زنہار باندھے

کھلیں بازوے زاغ اس فصل گل میں
فلک بالِ مرغِ گرفتار باندھے

تپِ دل سے ہے دردِ سر **مصحفی** کو
سر اپنا نہ کیوں کر یہ بیمار باندھے

۵۳۳

یار آکے رہے قریب میرے
ہیں گے ایسے کہاں نصیب میرے

گر نالے کی طرز سیکھنا چاہے
سن نالے تو عندلیب میرے

اس کُو میں نہیں کوئی مزاحم
ہیں طالعِ بد رقیب میرے

کیوں ہوگیا ناتواں تو اے دل !
کیا تجھ پہ پڑی غریب میرے

---

۱ - تھا : پ

بیمار ہوں مصحفی میں کس کا
حیراں ہیں جو سب طبیب میرے

۵۳۴

نہ ملیے آس سے رہیے فاصلے سے
ضرر ہو اپنے تئیں[1] جس کے ملے سے

نہ قاتل اس جگہ آیا نہ تلوار
یہ سب مارے پڑے ٹک بھوں ہلے سے

سب اپنے مہرباں منزل کو پہنچے
رہے اک ہم ہی پیچھے قافلے سے

مریدِ زلفِ خوباں ہوں کہ میرا
بندھا ہے اعتقاد اس سلسلے سے

نہ کر اے **مصحفی** ! روزی کا شکوہ
خدا بے زار ہوتا ہے گِلے سے

۵۳۵

ہمیں گالی دینا یہ خو تھی کسو کی
کبھی ہم سے بھی گفتگو تھی کسو کی

میں آئینے سے آنکھ ہرگز نہ پھیری
کہ صورت مرے روبرو تھی کسو کی

گلے لگ کے سویا تھا کس رشک گل سے
سحر جیب میں میرے بو تھی کسو کی

ہوئے خاک میں بھی نہ آسودہ ہرگز
وہاں بھی ہمیں جستجو تھی کسو کی

---

۱ - بر وزن فع -

مری نعش پر لوگ کہتے ہیں آ کر
اسی شخص کو آرزو تھی کسو کی
اب اے **مصحفی** ! ہم کہاں اور تعشق
مگر چاہ ہم کو کبھو تھی کسو کی

۵۳۶

باتوں نے اس کی ہم کو خاموش کر دیا ہے
آگے زباں تھی لیکن اب گوش کر دیا ہے
عشقِ بتاں میں ازبس کھائے ہیں داغ پیہم
ساعد کو اپنے ہم نے گل پوش کر دیا ہے
کس سیم بر کا یارو عاشق ہوں میں کہ مجھ کو
کاہش نے جوں مہِ نو آغوش کر دیا ہے
جب یادِ قد میں تیرے کھینچا ہے ہم نے نالہ
سروِ چمن سے اس کو ہم دوش کر دیا ہے
طاقت یہ اپنی کب ہے جو اس کی تاب لاویں
جس جلوے نے کہ موسیٰ بے ہوش کر دیا ہے
اے **مصحفی**! اٹھا ہے جب دل سے میرے شعلہ
مار آستیں ، میں اس کو خاموش کر دیا ہے

۵۳۷

دامن کی اک جھپک نے مدہوش کر دیا ہے
جیسے چراغ ہم کو خاموش کر دیا ہے
ہم راہِ آہ ازبس لختِ جگر اڑے ہیں
میں عرصۂ ہوا کو گل پوش کر دیا ہے
کون آیا تھا نہانے ، لطفِ بدن نے کس کے
لہروں سے سارا دریا آغوش کر دیا ہے

اب اور آہِ پیچاں کیا چاہے ہے ، میں اُس کو
زنجیرِ عرش سے تو ہم‌دوش کر دیا ہے
ساقی کو میں دیا تھا خونِ فشردہ ، اُس نے
میرے تئیں اُسی کو پھر جوش کر دیا ہے
صوفی و شیخ و زاہد سب کیفی بن رہے ہیں
اُس کی نگہ نے عالم مے نوش کر دیا ہے
نوبت سخن کی ہم تک جب آئی ہے ، ادب نے
'خاموش' کہہ کے سب کو خاموش کر دیا ہے
مجلس میں مصحفی کی آیا ہے جو بہ دعویٰ
میں[1] اک سخن میں اُس کو خاموش کر دیا ہے

۵۳۸

شب آ کے رو برو جوں ہی بجلی چمک گئی
نظروں میں میری ، یار کی صورت جھمک گئی
آئی ہوائے ابر تو کیا دل خنک ہوا
وہ بھی ہماری آگ پہ دامن جھٹک گئی
اے گل ! تجھے دکھاویں گے اُس کے بدن کا رنگ
اُس نازنیں کی گر کبھو چولی مسک گئی
طوفاں کیا وہ اشک نے غم میں ترے کہ رات
جو موجِ تند اُس سے اُٹھی تا فلک گئی
بجلی شب آسماں سے جو بےتاب ہو گری
آ کر کے آستاں پہ ترے سر پٹک گئی

۱- میں اک قدح میں اس کو بے ہوش کر دیا ہے : پ ل ۱ ، ۲ -

آس گل بدن نے بندِ قبا جوں ہی وا کیے
مجلس تمام پھولوں کی بو سے مہک گئی

یاروں کو ہم دکھاویں گے بے طاقتی کے رنگ
اپنی بھی آنکھ گر کسی گل سے اٹک گئی

ہر بات پر مری تُو نہ کر نکتہ چینیاں
ان باتوں سے تری ، مری چھاتی تو پک گئی

ہم نے بہت علاج کیا لیک **مصحفی**
ہرگز نہ دردِ دل کی ہمارے چمک گئی

۵۳۹

باغ سرسبز ہے اور آب و ہوا اچھی ہے
کیجیے سیر کوئی دم تو فضا اچھی ہے

تیری تصویر کو کب پہنچے ہے تصویرِ پری
تو ہی پھر خوب ہے وہ گو کہ ذرا اچھی ہے

شوخ چشمی نہ کر اے شوخ کہ معشوقوں کی
جس قدر چشم میں ہو شرم و حیا ، اچھی ہے

گل سے کہتی ہے کہ یہ تیری ہے بو کا طالب
تو بھڑا دینے کو اے باد صبا ! اچھی ہے

دیکھتا ہے جو کوئی آس کو یہی کہتا ہے
صورت اس طفلِ پری زاد کی کیا اچھی ہے

آس فریبندہ سے کیوں کر کوئی سودا نہ کرے
طرح ترکیب ہے خوش وضع ، ادا اچھی ہے

حق تعالٰی مرے پیارے سے ملا دے مجھ کو
یہ دعا ورد کر اے دل ! کہ دعا اچھی ہے

جس قدر خونِ جگر کھاوے اُسے کھانے دے
تیرے بیمار کے حق میں یہ غذا اچھی ہے

ملو پیشانی کو خاک اُس کی گلی کی ، اے دل !
دردِ سر جائے گا اس سے ، یہ دوا اچھی ہے

ق

مصحفی مجھ سے تعجب ہے کہ یہ بات کہوں
کہ مری طرز ، سخن کہنے کی کیا اچھی ہے

پر میں اتنا تو سمجھتا ہوں کہ سب کے نزدیک
نالۂ چغد سے بلبل کی نوا اچھی ہے

۵۴۰

اب تلک یار کی ہے چیں بہ جبیں ویسی ہی
نت مرے ساتھ چلی آتی ہے کیں ویسی ہی

اب تلک بھوں کا چڑھانا ہے وہی ہر ساعت
اب تلک پڑتی ہے پیشانی میں چین ویسی ہی

جب سے دیکھا ہے مرا لختِ جگر کہتا ہے
مجھ کو بازار سے لادے تو نگیں ویسی ہی

جس جگہ میرے تئیں قتل کیا تھا اُس نے
اب تلک خون سے تر ہے وہ زمیں ویسی ہی

دل جو غائب ہے مری نظروں سے شاید اُس کو
پھر کے صورت نظر آئی ہے کہیں ویسی ہی

کب مرے نالۂ جاں کاہ کو وہ سنتا ہے
بات بد گو کی ہے واں ذہن نشیں ویسی ہی

مصحفی اب تلک آیا نہیں ہرگز میں بحال
غمِ ایام سے ہے طبع حزیں ویسی ہی

۵۴۱

پاسباں جاگے ہے ، در بند ہے ، مینہ برسے ہے
میں اِدھر تڑپوں ہوں اور یار اُدھر ترسے ہے

اس طرح توڑ کے پر پھینک نہ دے بلبل کے
بیر ہی اُس کو تو اک بالِ کبوتر سے ہے

چرخِ بے مہر سے میں کیا گلہ بنیاد کروں
کہ ستم میرے اوپر بازیِ اختر سے ہے

وہ ستم کشتہ بُتاں کا ہوں کہ کل روزِ جزا
دعویِ خون مجھے داورِ محشر سے ہے

ہم گرفتار ہوئے اور ہی ہنگامے میں
یاں خبر کاہے کو ہنگامہٗ محشر سے ہے

دوستو اُس کو جو پکڑا ہے تو تم چھوڑیو مت
لاؤ لاگ اپنے تئیں بھی اسی کافر سے ہے

کیوں کہ بیت الصنمِ عشق کا جلوہ دیکھیں
راہ و رسم اپنے تئیں بت سے نہ بت گر سے ہے

کیوں نہ اُس زلف سے مل ہوں میں مشوش اے دل
کیا کروں یار کہ کام ایسے ہی ابتر سے ہے

مصحفی دوکھیں ہیں گر خویش و برادر دوکھیں
کام کیا اپنے تئیں خویش و برادر سے ہے

۵۴۲

منظور گر تمھیں بھی تماشاے خلق ہے
وابستہ اک نظر کی تمناے خلق ہے

افسوس ہے نہ جانے تو اُس کی ہی قدر کو
جو شخص تیرے واسطے رسواے خلق ہے

کس طرح کوئی چین سے بیٹھے کہ رات دن
دورِ سپہر درپئے ایذاے خلق ہے
میرا گناہ کیا ہے جو مجھ بے گناہ پر
عالم سمٹ کے آیا ہے دعواے خلق ہے
معنی طلب کی صورتِ خالق پہ ہے نظر
صورت پرست محوِ تماشاے خلق ہے
پھرتا ہے نت وہ برہنہ رو جیسے آفتاب
گو خلق دیکھے کب اسے پرواے خلق ہے
شاید کہ آج مصحفی مارا گیا کہیں
اس کی گلی میں کہتے ہیں غوغاے خلق ہے

۵۴۳

کوچہ ترا نہ جاے تماشاے خلق ہے
بہرِ نظارہ بیہدہ غوغاے خلق ہے
میری طرح سراسرِ عالم پھرا نہیں
ہر چند آفتاب بھی رسواے خلق ہے
کیا تجھ کو فائدہ ہے بھلا اس میں اے فلک!
تو اس قدر جو در پئے ایذاے خلق ہے
کم ہم سے کم بغل پہ وہ ہوتا ہے ملتفت
نت جس کے ساتھ گرمیِ سوداے خلق ہے
میں ہوں وہ خاکِ راہ کہ کوچے میں یار کے
میرا سرِ شکستہ ہے اور پاے خلق ہے
کچھ شعر و شاعری سے نہیں مجھ کو فائدہ
الا" حصولِ کاوشِ بے جاے خلق ہے

چل تو بھی مصحفی کہ وہ نکلا ہے بزم سے
ہے بارِ عام، نوبتِ مجرائے خلق ہے

۵۴۴

تو بے وفا ہوا تو مروت کہاں رہی
عاشق کو تجھ سے جائے شکایت کہاں رہی
دنبالِ دل پری سی کوئی گام زن تو تھی
پر یہ خبر نہیں کہ وہ صورت کہاں رہی
وقتے کہ شاعروں نے رگِ گل کیا خیال
موئے کمر کی اُس کے نزاکت کہاں رہی
میں نے چمن میں آن کے جب نالہ سر کیا
مرغانِ نغمہ سنج کی جرأت کہاں رہی
مڑتے ہی بھوں کے ہاتھ سے جاتا رہا یہ دل
اپنے کہے میں اپنی طبیعت کہاں رہی
مدت ہوئی کہ بیٹھے ہیں ہم انتظار میں
کیا جانے آتے آتے قیامت کہاں رہی
وقتے کہ میں نے نامے پہ رو رو دیا لہو
سمجھے کوئی جسے، وہ عبارت کہاں رہی
جو تو نے دی رقیب کو پہلو میں اپنے جا
عاشق کی تیری بزم میں عزت کہاں رہی
آنے سے خط کے اور ہی کچھ رنگ ہو گیا
چہرے کی اُس کے اب وہ شباہت کہاں رہی
جو کچھ میں دیکھتا ہوں فلک تجھ سے حادثہ
فرہاد و قیس پر یہ مصیبت کہاں رہی

جب تیرِ غمزہ دل سے مرے پار ہو گیا
جانِ ستم رسیدہ سلامت کہاں رہی

کیا بات پوچھتے ہو کہ وقتِ اخیر ہے
اب ہم کو بات کہنے کی قدرت کہاں رہی

حیراں ہیں سارے قاضی و مفتی و بادشاہ
آگے ترے ، کسی کی حکومت کہاں رہی

تھی یاروں تک ہی رونقِ بزم اپنی **مصحفی**
جب یار ہی اٹھ گئے تو وہ صحبت[1] کہاں رہی

۵۴۵

کیا کہوں بات میں اس گریے کی طغیانی کی
کشتیِ نوح اسی گریے نے طوفانی کی

خوشے خوشے مری مژگاں سے گرے دامن میں
دانۂ اشک نے اس سال فراوانی کی

نوبہار آنے سے سودائے جنوں تازہ ہوا
سبزے کی موج نے پھر سلسلہ جنبانی کی

صاف تو یہ ہے کہ انصاف نہیں یاروں میں
ورنہ جوں آئنہ صورت ہوں میں حیرانی کی

درد سر کیوں کہ نہ ہو مجھ کو کہ ان آنکھوں سے
شکل دیکھی ہے میں صندل لگی پیشانی کی

ایسی کیا جلدی ہے ہاں خط بھی پڑھوں گا قاصد
پہلے کچھ بات تو کہہ لے تو مرے جانی کی

۱- صورت : پ ۔

مجتہد ملتِ ترسا کا ہوں میں کیوں کہ مدام
خدمتِ بُت میں رہا ، دَیر کی رہبانی کی

دہِ غارت زدہ کی طرح نمایاں ہے تمام
میرے ظاہر سے حقیقت مری ویرانی کی

تیرے دامن کی کناری کو نہ پہنچا زنہار
شعلۂ برق نے ہرچند کہ جولانی کی

جو سدا محو رہے اپنی ہی آرائش کا
اُس کو کیا فکر مری بے سر و سامانی کی

فصلِ گل میں بھی رہے کنجِ قفس کے ہی اسیر
ہم گرفتاروں نے کس روز پر افشانی کی

گھر میں رہنا تمھیں ہو جائے گا مشکل پیارے
کر گئی آہ اثر گر کسی زندانی کی

بن گیا سطحِ فلک تختۂ دامن سارا
ابرِ مژگاں نے مرے بس کہ دُر افشانی کی

مصحفی دوں میں جہاں ریختہ گوئی کو رواج
قدر شیرازی کی ہو واں ، نہ صفاہانی کی

۵۲۶

خوش حال اُن کا وے جو گلستاں میں مر گئے
حسرت نصیب ہم تھے کہ زنداں میں مر گئے

پہنچا نہ کام چشم کی گردش تلک دریغ
ہم اُس کی اک ہی جنبشِ مژگاں میں مر گئے

آخر نہ ہو سکا سفرِ دورِ راہِ عشق
لاکھوں گھسٹ گھسٹ کے بیاباں میں مر گئے

روتا پکارتا نہیں اب کوئی ، کیا میاں
عاشق ترے سبھی شبِ ہجراں میں مر گئے
نسبت درست کیجیے اب کس سے **مصحفی**
جو منتخب تھے گبر و مسلماں میں مر گئے

۵۴۷

کبھیں مغز اُس کے میں صبح دم تری بوئے زلفِ رسا گئی
ترے کوچے سے جو چمن تلک گل اُڑاتی خاک صبا گئی
مرض اک جہاں سے نرالا تھا مری جان تیرے مریض کا
نہ ہوا کسی سے علاج جب ، اجل اس کی کرنے دوا گئی
غرض اس نباہ کے صدقے میں ، غرض ایسی چاہ کے صدقے میں
نہ ترا ہی جور و جفا گیا ، نہ مری ہی مہر و وفا گئی
یہ بہار ہووے گی سب خزاں ، نہ سمن ، نہ لالہ ، نہ ارغواں
دمِ گرم کی مرے دوستاں ، کبھی باغ میں جو ہوا گئی
جو فدائے صورتِ خوب ہیں انھیں تب کہوں گا کہ دیکھیے
کوئی شکل اپنی ہی چشم میں کبھو سیر کرتی جو آ گئی
میں ہؤا بہ خاکِ سیہ فرو ترے کوچے میں بہ صد آرزو
رہا شرمگین ہی ہمیشہ تُو تری اب تلک نہ حیا گئی
سر اٹھاؤں کیوں کہ میں **مصحفی** نہیں مجھ میں تاب و تواں زری
کہ خرام اُس بتِ شوخ کی مجھے خاک ہی میں ملا گئی

۵۴۸

تصوارِ یار جب تئیں پیشِ نظر رہی
سو صورتوں سے آنکھ مری بے خبر رہی
آخر ہمیں جلا کے کفِ خاک کر دیا
دن رات کی یہ سوختگی کام کر رہی

اک روز دیکھ لوگے کہ ہم درمیاں نہیں
گر درمیاں ، میاں ! یہی شام و سحر رہی

وقتے کہ خط کو پانی میں اُن نے ڈبو دیا
کہہ تو ہی میری آبرو کیا نامہ بر رہی

واں جھوٹ موٹ بھی نہ ہوئی اُس کی چشم نم
یاں اشک سے ہر اک مژہ سلکِ گہر رہی

جوں زخمِ تازہ تجھ کو میں نت پوچھتا رہا
سوکھی کب آستیں مری اے چشم تر! رہی

وقتے کہ اس کمر پہ طپنچے سجے گئے
انصاف کیجے آپھی کہاں سے کمر رہی

شاید کہ لختِ دل کوئی پیچھے رہا جو آج
مژگاں پہ بوند اشک کی آ کر ٹھہر رہی

جانا نہ ہم نے بالشِ سر کہتے ہیں کسے
اک خشت سی تو اپنے بھی ہاں زیرِ سر رہی

میرا اور اس کا جھگڑا نہ فیصل ہوا کبھی
آپس کے بیچ بحث ہی دو دو پہر رہی

قسمت کہ تجھ سے اب کے بھی اپنی ملازمت[1]
موقوفِ مہربانیِ وقت دگر رہی

دیکھوگے گر دکھاویں گے ہم ریختہ کو فرس
یک چند اگر توجہِ خاطر ادھر رہی

بے اعتدالیوں سے تری اُس گلی کے بیچ
خانہ خراب دھوم سی شام و سحر رہی

۱- ملازمت بمعنی ملاقات -

آہ و فغاں ہی کرتا رہا تُو تو **مصحفی**
تیری زباں نہ ایک دم اے نوحہ گر ! رہی

۵۴۹

نہ غمِ عاشقِ رسوا ہے تجھے
نہ خیالِ دلِ شیدا ہے تجھے

میں ترے غم میں موا جاتا ہوں
کوئی یہ بات بھی کہتا ہے تجھے ؟

آشنا سا نظر آتا ہے تو یار
میں نے شاید کہیں دیکھا ہے تجھے

جب میں کہتا ہوں کہ ٹک زلف تو کھول
تب یہ کہتا ہے کہ سودا ہے تجھے؟

جانِ من ہے تو بہت[1] بے پرواہ
سچ ہے پرواہ مری کیا ہے تجھے ؟

جاں بہ حسرت جو تو یوں دیتا ہے
مصحفی ! کس کی تمنا ہے تجھے ؟

۵۵۰

جب کمر میں کٹار رکھتا ہے
اس نے کتنوں کو مار رکھتا ہے

اک فریبِ نگہ پہ یاں ہم نے
سالہا انتظار رکھتا ہے

پھانس بھی گر چبھی ہے دل میں مرے
اس نے برسوں فگار رکھتا ہے

---

۱ - لپٹ : ل ۲ -

تم نے اپنا جہاں دھرا ہے قدم
ہم نے واں سر آثار رکھّا ہے

اپنا عاشق نہیں تو اے کافر!
آئنہ کیوں دو چار رکھّا ہے

ہم نے دستِ جنوں کے ہاتھوں سے
جیب کو تار تار رکھّا ہے

ق

میری تربت پہ آن کر گاہے
کب قدم تو نے یار رکھّا ہے

بعد از مرگ بھی مجھے یعنی
کشتۂ انتظار رکھّا ہے

مصحفی ہم نے اپنے پہلو میں
دل کو دے دے فشار رکھّا ہے

۵۵۱

دنیا میں دل سے دل کو محبت نہیں رہی
ہرگز کہیں دو شخص میں اُلفت نہیں رہی

پھڑکے ہیں زیرِ دام ہم اتنے کہ اب ہمیں
خنجر تلے تڑپنے کی حسرت نہیں رہی

کیا فائدہ ہے اُس سے گر آنکھیں ملائیے[1]
آنکھوں میں اُس کی کچھ بھی مروت نہیں رہی

اے دیدہ! زار زار نہ رو اس قدر کہ اب
مجھ کو بھی گریہ کرنے کی طاقت نہیں رہی

---

۱ - لڑائیے : ل ۲ -

مجلس میں اس کی جا کے کوئی کیا ذلیل ہو
ہرگز موافق اپنے وہ صحبت نہیں رہی
کیا جا کے اب کسی کے تئیں منہ دکھائیے
وقتے کہ وہ زمانے کی صورت نہیں رہی
آتے ہی اُس کے سامنے، ٹوٹی ہے آرسی
ہرگز نظر سے اُس کی سلامت نہیں رہی
اے غم! فشارِ دل میں نہ اتنی بھی سعی کر
جانے بھی دے کچھ اس میں تو حالت نہیں رہی
اتنا رمیدہ خو ہے کہ اُس کو ہمارے ساتھ
اُلفت تو اک طرف کہ خصومت نہیں رہی
اے مصحفی! نہ کیجے سوے کودکاں نگاہ
اس کام میں بزرگوں کی حرمت نہیں رہی

۵۵۲

اُس سوا اور ہزاروں ہیں تو کیا کام مجھے
اُس کے بن دیکھے نہیں ایک دم آرام مجھے
شہر میں شہرۂ ہر برزن و کو تو میں ہؤا
عاشقی اور کہاں تک کرے بد نام مجھے
یہی حسرت رہی دل میں کہ کبھی ساقی نے
اپنے ہونٹوں سے لگا کر نہ دیا جام مجھے
شہر سے دور پڑا، خاطرِ یاراں سے گیا
کون اب بھیجتا ہے نامہ و پیغام مجھے

---

۱ - کوچہ -

مجھ کو سو چشم تھیں یاروں سے ولے روزِ فراق
نہ کیا یاد کسو نے بہ دو بادام مجھے
سادگی دیکھ کہ بوسے کی طمع رکھتا ہوں
جن لبوں سے کہ میسر نہیں دشنام مجھے
میں نے کیا ان کا لیا ہے جو گلی کوچوں میں
مدعی ڈھونڈتے ہیں صبح مجھے، شام مجھے
اک ترے کوچے سے باہر نہ نکالے تازیست
یوں[1] جو چاہے سو کرے گردشِ ایام مجھے
مصحفی ہاتھ اٹھا اب بھی تعشق سے، کہ یار
نظر آتا ہے بد اس کام کا انجام مجھے

۵۵۳

ڈرتی نہیں وہ چشمِ سیہ زاریِ دل سے
دن رات اُسے کام ہے خوں خواریِ دل سے
یارب تری زلفوں سے مجھے جس نے چھڑایا
تا حشر نہ چھوٹے وہ گرفتاریِ دل سے
اک داغ نیا ہر بُنِ مو پر ہے نمایاں
یہ پھول چنے ہم نے شرر باریِ دل سے
شعلے کا ترے حسن کے فانوس بنا ہے
تو اُس پہ بھی غافل ہے ہوا داریِ دل سے
ہم بھی دلِ خوں گشتہ لیے ساتھ ہیں اُس کے
گو ہاتھ اُٹھاوے نہ دل آزاریِ دل سے
غم کیوں نہ چھپاؤں میں کہ چہرے کا مرے رنگ
عالم کو نشاں دیتا ہے بیماریِ دل سے

---

۱ - یوں تو جو چاہے کرے گردش ایام مجھے : پ -

اے مصحفی ! جز آہ و غم و نالہ و زاری
حاصل نہ کیا ہم نے تو کچھ یاریِ دل سے

۵۵۴

پہنچا ہے زیاں تجھ کو وفاداریِ دل سے
کیا میں نہیں واقف تری بیزاریِ دل سے

بن دل کے تری زلف بھی اب رہ نہیں سکتی
ہے وہ بھی گرفتارِ گرفتاریِ دل سے

ایسا نہ ہو لے جا کے کہیں مجھ کو لٹا دے
میں آگو ہی ڈرتا ہوں زیاں کاریِ دل سے

شب دیدۂ بیدار کے محتاج نہیں وہ
جو فیضِ سحر لیتے ہیں بیداریِ دل سے

اُس شہر کا کیا نام ہے جس شہر میں کوئی
جاں بر نہیں ہوتا تپِ بیماریِ دل سے

کیا نامِ محبت لیں کہ اب بزمِ بُتاں میں
ہم آپ خجل ہوتے ہیں ناداریِ دل سے

کرتا تھا یہ دل پیش ازیں مشقِ تپیدن
ہے اب تو شکایت ہمیں بیکاریِ دل سے

اے آئینہ ! ہم تجھ کو دکھا دیویں گے نقشہ
گر پردہ اٹھا آئینہ رخساریِ دل سے

ہرچند کہ ہیں خانہ بر انداز وے آنکھیں
پر شکر کہ غافل نہیں معماریِ دل سے

کاہے کو پئیں بادہ ، کہ پہنچے ہے ہمیشہ
بے ہوشی کا مژدہ ہمیں ہشیاریِ دل سے

ان روزوں پھر اُس شوخ کی آنکھوں نے کیا ہے
بازارِ نظر گرم ، خریداریِ دل سے
وقتے کہ مدد خواہ تھے ہم کوئی نہ آیا
کیا فائدہ ہے اب مدد و یاریِ دل سے
اے **مصحفی** ! سمجھے ہیں ہم اُس شوخ کو غافل
یک لحظہ جو غافل نہیں معماریِ دل سے

۵۵۵

جب دیکھوں وہ صورت مرے آگے ہی کھڑی ہے
اک قاتلِ خوں خوار سے پھر آنکھ لڑی ہے
اس گریے کے صدقے ہوں کہ خوناب جگر سے[1]
جو بوند ہے پلکوں پہ وہ چنّی سے جڑی ہے
وہ ابرِ سیہ جس سے کہ خوں برسے ہے ہر دم
اُس کے لبِ پاں خوردہ پہ مسّی کی دھڑی ہے
اُس زلف میں کیا کام کریں اپنی نگاہیں
جس زلف کا ہر حلقہ زرہ کی سی کڑی ہے
حیراں ہوں کہ اس غم کے تئیں کیوں کہ میں ٹالوں
اے وائے کہ سل سی مری چھاتی سے اڑی ہے
وہ کشتۂ بےکس ہوں کہ خوں خواہی کی خاطر
دروازے پہ قاتل کے مری لاش[2] پڑی ہے
خوں کس کا کیا تو نے جو آج اے مرے قاتل !
تلوار ترے ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی ہے

---

۱ - کے : ل ۱ -
۲ - نعش : پ -

سنگینوں سے پلکوں کی شرارے ہی اڑے ہیں
جب اشک کی پلٹن کی مرے باڑھ جھڑی ہے
آ **مصحفیِ** خستہ کی ٹک دیکھ لے صورت
یہ غم‌زدہ مہماں کوئی پل کوئی گھڑی ہے

۵۵۶

کس گل کی نزاکت پہ مری آنکھ پڑی ہے
جو ہر رگِ گل خار سی نظروں میں کھڑی ہے
جس موج سے لپٹا ہوں کر ابرو کا تصور
اس موج نے سر پر مرے تلوار جڑی ہے
گھر کیوں کہ غریبوں کے بھلا بیٹھ نہ جاویں
بے فاصلہ رونا مرا ساون کی جھڑی ہے
جو دیکھے ہے وہ ابروے خم دار کہے ہے
کیا صانعِ قدرت نے یہ تلوار گھڑی ہے
تو آئنہ خانے میں بہت دیر رہے ہے
کیا جانیے واں کس سے تری آنکھ لڑی ہے
گل‌دستہ ہے خود اک تو ترا دستِ نگاریں
پھر تس پہ غضب اور یہ پھولوں کی چھڑی ہے
کچھ ذکر تھا میرا، جو میں آ نکلا تو ہنس کر
کہنے لگا وہ یوں "تری کیا عمر بڑی ہے"

ق

خوں جلوہ گری کرتا ہے از بس کہ شب و روز
اس جاگہ پہ جس جاگہ مری نعش گڑی ہے
جو نخل کہ اگتا ہے وہاں خاک سے، لڑکے
گویا وہ ترے واسطے پھولوں کی چھڑی ہیں

اے **مصحفی** ! "گزری[1]" کی ذرا سیر تو کرلے
جاتا ہے کہاں دن ابھی دو چار گھڑی ہے

۵۵۷

دل کیوں کہ کریں بیٹھ کے ہم یار سے خالی
ہوتی ہی نہیں بزم تو اغیار سے خالی
کس طرح قدِ یار سے وہ آ کے طرف ہو
ہے سرو کے اک پاؤں ، سو رفتار سے خالی
ہم سوے عدم یوں گئے دنیا سے تہی دست
جس طرح کہ مفلس پھرے بازار سے خالی
باندھی ہے کمر اس نے ز بس خلق کُشی پر
جب دیکھو میاں اس کا[2] ہے تلوار سے خالی

---

۱ - گزری : (ف) اسم مؤنث : وہ بازار جو شام کو راہ‌گزر پر لگتا ہے - 'گزری: چوک ، بازارِ شام ، شام کے وقت کا بازار ہے:
پیری میں کر لیں سیرِ جوانی تو ہے مزا
گزری ہے اُس کی راہ گزر پر لگی ہوئی
لیکن مؤلف فرہنگ آصفیہ نے مصحفی کا یہی مقطع 'گدڑی' کی (فرہنگ آصفیہ ، جلد چہارم ، صفحہ ۵۱) مثال کے ذیل میں نقل کیا ہے - لکھتے ہیں :
گدڑی : (۱-۲) گزری کا بگڑا ہوا لفظ جس کے معنی بازارِ وقتِ شام کے آتے ہیں - چوک۔ وہ بازار جو شام کے وقتِ سرراہ پرانی دھرانی چیز بیچنے کے واسطے لگایاجاتا ہے - (ایضاً جلد ہ ، ص ۲۱ نیز ملاحظہ ہو - نوراللغات ، جلد چہارم صفحہ ۵۶)

۲ - کی : ل ۲ -

پیمانہ مری عمر کا افسوس کہ یا رب!
مرتے بھی رہا شربتِ دیدار سے خالی

اے مصحفی! شاید کہیں دل بند ہے تیرا
یہ آہ کا بھرنا نہیں اسرار سے خالی

۵۵۸

سر تری تیغ کو دیے ہی بنی
سجدہ محراب میں[1] کیے ہی بنی

دستِ ناصح سے تنگ آیا ہوں
چاکِ جیب اب مجھے سیے ہی بنی

آ پھنسے اب تو بزمِ رنداں میں
شیخ جی تم کو مے پیے ہی بنی

ہم کب اس زندگی کے تھے طالب
پر جِلایا تو اب جیے ہی بنی

مصحفی تم کو وہ کرے گا خراب
اس سے دل باز پس لیے ہی بنی

۵۵۹

لبِ زخمِ جگر سیے ہی بنی
خونِ دل ہم کو اب پیے ہی بنی

کھینچ کر تیغ یار آیا ہے
اس گھڑی سر جھکا دیے ہی بنی

دل گرا ہی پڑے ہے سینے سے
اب یہ دل ہاتھ میں لیے ہی بنی

---

۱ - کو: ل ۲.

یار کا صبح پر ہے وعدۂ وصل
ایک شب اور بھی جیے ہی بنی

اب تو اس دردِ دل کی تاب نہیں
مصحفی کچھ دوا کیے ہی بنی

۵۶۰

تو ہر شب نت بغل میں رکھے ہے
یہ دل شائستہ کب اس جور کے ہے

ترے دامن کا دور ایسا ہے پیارے
کہ صدقے دور بھی جس دور کے ہے

اسے کیا دورِ دامن کی خبر ہے
جو قصے[1] میں مسلسل دور کے ہے

بتاں کیا پوچھتے ہو، ہم سے کیجے
جو کچھ شایاں تمھارے طور کے ہے

مرے نامے کو مت یوں سرسری دیکھ
کہ ہر اک سطر قابل غور کے ہے

نہ خود قائم ہے یہ پتلا بدن کا
کل اس کی ہاتھ میں اک اور کے ہے

جبیں اس بت کی اب اے مصحفی دیکھ
کہ وہ سودے[2] میں چندن گھور کے ہے

۵۶۱

اب تو اس بزم میں پیارے تمھیں آئے ہی بنی
اپنے مشتاقوں کو دیدار دکھائے ہی بنی

۱- قبضے : پ، ل ۱ -
۲- سودہ : سفوف -

زخم دو چار تری تیغ کے کھائے ہی بنی
جائے تسلیم ہے یہ[1] ، سر کو جھکائے ہی بنی

سخت حیران کیا ، چہچہۂ بلبل نے
باغ میں ہم کو بھی اب دھوم مچائے ہی بنی

گر تصور ہے یہی تو مرا جینا معلوم
اس تصور کے تئیں جی سے بھلائے ہی بنی

یار لے رشتۂ سوزن کو بہ کف آیا ہے
اب تو اس چاکِ گریباں کو سلائے ہی بنی

وہ جو ہجراں میں ترے مجھ پہ گزرتی ہے میاں
تو سنے یا نہ سنے مجھ کو سنائے ہی بنی

سخت افسردہ کیا ہے ہمیں بے عشقی نے
مصحفی پھر کہیں اب آنکھ لڑائے ہی بنی

۵۶۲

بند ہی آنکھوں کو زری کیجیے
چند پریشان نظری کیجیے

اک نظر ایدھر بھی زری کجیے
گر نہیں اچھی نظری کیجیے

دل کے عوض دیجیے بوسہ ہی ایک
خوب نہیں مفت بری کیجیے

آئنے میں دیکھیے مکھڑا میاں
آئنے کو رشکِ پری کیجیے

گر نہیں قاصد تو بدل کر کے بھیس
آپ ہی پیغام بری کیجیے

---

۱ - یاں : ل ۲ -

قدر ہنر کی جو ہوئی دیکھ لی
اب ہنرِ بے ہنری کیجیے
کون ہے ان باتوں کا مانع میاں
خوب سی بےداد گری کیجیے
دل کی کچھ اس کُو سے نہ آئی خبر
ماتمِ یارِ سفری کیجیے
مصحفی ہے وقتِ وداعِ جہاں
مثلِ چراغِ سحری کیجیے

۵۶۳

روحِ بلبل چمن میں بھٹکے ہے
اب تلک یاں گلاب چھٹکے ہے
زلف کو جب وہ کھول دیتا ہے
جیسے مارِ سیاہ لٹکے ہے
گر پڑا میں ترا برا ہووے
یوں بھی دامن کو کوئی جھٹکے ہے
مے پیوں ہوں توَ مثلِ شیشۂ مے
وہ بھی تجھ بِن گلے میں اٹکے ہے
کون سے عضو کی کروں تعریف
اس کی تو بوٹی بوٹی مٹکے ہے
جب سے دیکھی ہے وہ پلک میں نے
پھانس سی کچھ جگر میں کھٹکے ہے
گھر سے باہر نکل کہ مصحفی آج
تیری چوکھٹ پہ سر کو پٹکے ہے

۵٦۴

آغازِ صبحِ ہجر کا انجام دور ہے
اے دیدہ اور رو کہ ابھی شام دور ہے

طاقت کہاں ہے اتنی کہ واں تک پہنچ سکیں
ہرچند باغ ہم سے کئی گام دور ہے

انصاف تو کرو دلِ بے تاب کو مرے
آرام کس طرح ہو ، دل آرام دور ہے

بیٹھے ہیں اور لوگ تو سارے بھرے ہوے
مجلس میں تجھ سے اک یہی ناکام دور ہے

نزدیک میرے لاوے ٹک اس ماہ رو کے تئیں
کیا یہ بھی تجھ سے گردشِ ایام دور ہے ؟

مے پی چکوں تو دیکھیو تم مستیاں مری
یارو ابھی تو لب سے مرے جام دور ہے

مت بھولیو تو اپنی کمندِ شعاع پر
اے آفتاب ! اس کا لبِ بام دور ہے

بیٹھا ہے نقش سب کا لبِ یار پر درست
الاّ کہ اس نگیں سے مرا نام دور ہے

جب سے نظر پڑی ہے اُس ابرو کی تیغ پر
سر سے ہمارے بالشِ آرام دور ہے

کیوں مصحفی کو دیکھ کے کہتا ہے دور دور
مدت سے تجھ سے آپھی یہ بدنام دور ہے

۵٦۵

گہ خون روئے گا ہے لختِ جگر نکالے
پھر تو نے رنگ اپنے اے چشمِ تر ! نکالے

پھر نوبہار آئی اور پھر شگوفہ پھولا
ہر شاخِ بے ثمر نے پھر برگ و بر نکالے
ٹک دیکھ تو تماشا صعنت کی باغباں نے
اک مشتِ گل سے کیا کیا رنگین پر نکالے
سدّ ِ سکندری میں گر رکھیے خوب رو کو
وہ کاوشِ مژہ سے اُس میں بھی در نکالے
اے نا نمودہ عارض! اس تیری جستجو نے
پردے سے باہر آخر شمس و قمر نکالے
کوے بتاں میں میری چاروں طرف نظر ہے
شاید کوئی پری رو غرفے سے سر نکالے
یہ حسن وہ بلا ہے آوے جو ساحری پر
گھر سے پری کو اپنے دیوانہ کر نکالے
ممنونِ بے پری رہ یعنی کہ اس جہاں سے
پروازِ زندگی ہے، جب مور پر نکالے
اے شوقِ جاں فشاندن! کیجو خبر ہمیں بھی
دستِ ستم میاں سے شمشیر اگر نکالے
مارے خوشی کے مجھ کو آجاتی ہے غشی سی
کیسے سے خطّ ِ جاناں تا نامہ بر نکالے
تو جس زمیں پہ اپنا اے مصحفی دھرے پاؤں
یُمنِ قدم سے تیرے وہ گنجِ زر نکالے

۵٦٦

مارے گئے کئی ترے اے یار! ہاتھ سے
پر تو بھی تُو نے رکھی نہ تلوار ہاتھ سے

اللہ رے دشمنی کہ جوں ہی مجھ کو دیکھنا
کر لینے بند رخنۂ دیوار ہاتھ سے

یارب کہیں وہ دن ہو کہ میں گریہ جب کروں
پونچھے تو میرے دیدۂ خوں بار ہاتھ سے

دیکھا ہے میں نے جب سے ترا چاکِ آستیں
جاتا رہا ہے دل مرا اے یار! ہاتھ سے

کیا اتنا اضطراب ہے خوں ریزی میں مری
مہندی تو کھول ٹک کہیں خوں‌خوار ہاتھ سے

صیاد مرغِ دل کو ابھی ٹک قفس میں رکھ
خوگر نہیں ہوا یہ گرفتار ہاتھ سے

کرنی ہے کچھ دوا مرے دل کی تو کر طبیب
جاتا ہے مفت ورنہ یہ بیمار ہاتھ سے

گر اس چمن میں میں نے چنا ہو گلِ مراد
نکلیں بسانِ شانہ مرے خار ہاتھ سے

کہتے ہیں رات سیر و تماشا میں مصحفی
مارا گیا کسی کے طرح‌دار ہاتھ سے

۵۶۷

او دامن اٹھا کے جانے والے
ٹک ہم کو بھی خاک سے اٹھا لے

روٹھو ہو اِدھر، اُدھر منو ہو
دنیا سے یہ ناز ہیں نرالے

حلقے زلفوں کے تیرے رخ پر
اک ماہ ہے اور ہزار ہالے

عشق اس کو ہے جوکہ مثل شانہ
ہاتھوں میں کھلاے مار۱ کالے

اس دل نے مجھے بہت ستایا
دشمن کے پڑے نہ کوئی پالے

واں ہلتی ہیں پلکیں تیری اور یاں
چلتے ہیں مرے جگر پہ بھالے

اتنا بھی تو مصحفی نہ خوں رو
رنگین تو ہوگئے رسالے

۵٦۸

پردہ گر درمیاں سے اٹھ جاوے
اک جہاں جسم و جاں سے اٹھ جاوے

مارے الفت کے مر گئے اے کاش
رسم الفت جہاں سے اٹھ جاوے

دیکھ اس کو میں مجھ کو یوں بولا
کہہ دو اس کو یہاں سے اٹھ جاوے

جی میں ہے اتنے بوسے لیجیے کہ آج
مہر اس کے دہاں سے اٹھ جاوے

رہے اے گل! تو باغ میں، بلبل
ستم باغباں سے اٹھ جاوے

ہم کو جلنا وہ شوخ بے پروا
گو مرِ امتحاں سے اٹھ جاوے

۱۔ ناگ: پ ل ۱، ۲۔

گل کا یہ رنگ کیا تعجب ہے
مرغ اگر آشیاں سے اٹھ جاوے

نہ ملے جا اسے کسی در پر
جو ترے آستاں سے اٹھ جاوے

ق

کون کہتا تھا ، خوش زباں ایسا
مجلسِ دوستاں سے اٹھ جاوے

ہائے رے مصحفی کا مرنا ہائے
آدمی یوں جہاں سے اٹھ جاوے

۵۶۹

آنکھوں سے رواں خونِ دلِ ریش رہے ہے
یاں روز یہی واقعہ درپیش رہے ہے

نظروں میں کھُبی[1] ہے مژہ اس شوخ کی جب سے
دل ساتھ مرے نت خلشِ نیش رہے ہے

منصور صفت گو کہ اسے دار پہ کھینچیں
حق گوئی سے کب مردِ حق اندیش رہے ہے

گہ لام تو گہ لام الف بنتی ہے بل کھا
زلف اس کی نہ برقاعدۂ خویش رہے ہے

نت قتلِ غریباں پہ کمر اس کی ہے بستہ
ان باتوں سے کب چرخِ جفا کیش رہے ہے

پاؤں اپنا رہِ عشق میں رکھوں کہ نہ رکھوں
ہر لحظہ یہی مجھ کو پس و پیش رہے ہے

---

۱ - کھب جانا : سما جانا ۔

اک روز تو کر مصحفی کی تو بھی زیارت
کوچے میں ترے کب سے یہ درویش رہے ہے

۵۷۰

جوں ہی تک یار کی پیشانی میں چیں پڑتی ہے
سر و سامان میں مرے برق وہیں پڑتی ہے

اس تامل کا ہوں کشتہ کہ ترا وقت خرام
پاؤں پڑتا ہے کہیں ، آنکھ کہیں پڑتی ہے

خار خار اس مژہ کا بس کہ رہے ہے شب ہجر
ایک پل میرے تئیں نیند نہیں پڑتی ہے

نیم بسمل گئے ہیں وہ جو ترے کشتۂ ناز
کیوں کہ کل ان کے تئیں زیر زمیں پڑتی ہے

مصحفی کے تو گھر آوے تو عجب بھی نہیں کچھ
تجھ سے امید تو اے زہرہ[1] جبیں ! پڑتی ہے

۵۷۱

عین رقت میں کوئی مجھ سے رکا جاتا ہے
کیا کروں خون دل آنکھوں سے بہا جاتا ہے

اندک اے پیش رواں ! وقفہ کہ اس منزل میں
اک مسافر سا کوئی پیچھے رہا جاتا ہے

بے حجابانہ نہ یوں بام پر آیا کر تو
کہ ترے سامنے خورشید چھپا جاتا ہے

کون آگاہ ہے یاں درد سے اس گھائل کے
روز زخموں سے نمک جس کے ملا جاتا ہے

---

۱ - زیر زمیں : ل ۱ ، ۲ ، ۔

بیٹھو اے یارو ! کوئی بات بتاؤ مجھ کو
آج نامے کا جواب اس کے لکھا جاتا ہے
آج کیا جانیے کیا باد چلی گلشن میں
خود بخود رنگ گل و لالہ اُڑا جاتا ہے
مصحفی کے بھی میں ابرام کا دیوانہ ہوں
جھڑکیاں[1] دینے پہ وہ ساتھ لگا جاتا ہے

۵۷۲

سر دل پر مجھے اک نیشتر معلوم ہوتا
مژہ کا تیری رخ کچھ پھر اِدھر معلوم ہے
نمی سی پنبۂ داغِ جگر میں اپنے پاتا ہوں
کئی دن سے مجھے پھر اب وہ تر معلوم ہوتا ہے
کوئی گھر بیٹھے کیا جانے اذیت راہ چلنے کی
سفر کرتے ہیں ، جب رنجِ سفر معلوم ہوتا ہے
امیدِ وصل پڑتی ہے طلوعِ شمس سے دل کو
ابھی سے نالۂ شب کا اثر معلوم ہوتا ہے
کروں کیوں ذکر میں زاہد کے آگے شعروشاہد کا
وہ ان باتوں سے مجھ کو بے خبر معلوم ہوتا ہے
میں تم سے پوچھتا ہوں انتہا اس عشق بازی کا
تمھیں بھی کچھ بھلا اے چشمِ ترمعلوم ہوتا ہے
مری بھوکی نگاہیں دیکھ شب ہمدم سے یوں بولا
کہ مجھ کو مصحفی کچھ بد نظر معلوم ہوتا ہے

---

۱ - جھڑکیاں دے ہے وہ ، یہ ساتھ لگا جاتا ہے : پ ل ۱ ، ۲ -

۵۷۳

تو دیکھے تو اک نظر بہت ہے
الفت تری اس قدر بہت ہے
اے دل ! تو نہ کر ہماری خصمی
بس اک دلِ کینہ ور بہت ہے
ٹک اور بھی صبر کر کہ مجھ کو
لکھنا ابھی نامہ بر بہت ہے
ہم آبلہ بن رہے ہیں ، ہم کو
اک جنبشِ نیشتر بہت ہے
شیشے میں ترے شراب ساقی
ٹک ہم کو بھی دے اگر بہت ہے
اس رنگ سے اپنے گھر نہ جانا
دامن ترا خوں میں تر بہت ہے
افسانۂ عشق کس سے کہیے
اس بات میں دردِ سر بہت ہے
مجھ کو نہیں آہ کا بھروسہ
یعنی کہ یہ بے اثر بہت ہے
اس دل کی تو تُو خبر رکھا کر
یہ آپ سے بے خبر بہت ہے
کیا بگڑی ہے آج **مصحفی** سے
اس کوچے میں شور و شر بہت ہے

۵۷۴

اٹھ گیا ہے وہ ستم دیدہ کہیں مدت سے
کچھ خبر مجھ کو دل اپنے کی نہیں مدت سے

جیسے ناسور شب و روز بہا کرتے ہیں
ہے یہ آزار ان آنکھوں کے تئیں مدت سے
کبھی آزردگی اپنی کو کرے گی ظاہر
دل میں کھٹکے ہے تری چین جبیں مدت سے
کچھ نہ پوچھو کہ غمِ عشقِ بتاں نے یارو
کر رکھا ہے مری خاطر کو حزیں مدت سے
آسماں تازہ نہیں بر سر بیداد آیا
یاد ہے اس کے تئیں شیوۂ کیں مدت سے
کچھ تبسم نے لبِ یار کے ڈالا نہیں شور
خندۂ زخمِ جگر ہے نمکیں مدت سے
کوئی واقف نہیں احوال سے میرے شاید
میں تو اس شہر میں ہوں گوشہ نشیں مدت سے
آبرو کی ہے ز بس پاس مجھے ، گاڑے پاؤں
گھر میں بیٹھا ہوں میں مانندِ نگیں مدت سے
مصحفی اس کی گلی میں میں رہا آخر ٹھور[1]
تھی مرے خوں کی پیاسی یہ زمیں مدت سے

۵۷۵

جب سے اس شوخ نے شمشیر و سپر باندھی ہے
ہم نے بھی خون پہ یہاں اپنی کمر باندھی ہے
روز آ آ کے مجھے گالیاں دے جاتے ہو
مجھ پہ روز آپ نے اس بات کی کر[2] باندھی ہے

---

۱ ۔ ٹھور رہنا : (ہ) جان دے دینا ۔
۲ ۔ کر : (ہ) تاوان ، جرمانہ ۔

کیا تماشہ ہے کہ اس شعبدہ بازی نے تری
جو نظر باز ہیں ان کی بھی نظر باندھی ہے

گل ہی اس باغ سے جانے پہ نہیں بیٹھا کچھ
گٹھری غنچے نے بھی از بہرِ سفر باندھی ہے

جائے مرہم نمکِ سودہ لگایا ہے آسے
زخمِ دل پہ میں نئی پٹّی اگر باندھی ہے

آج جو گریے کا ساماں ہے بہ اندازِ دگر
شرط کیا ابر سے اے دیدۂ تر باندھی ہے ؟

دل کو اپنے ہدفِ تیرِ بلا پاتا ہوں
اس کماں کش نے مگر شست ادھر باندھی ہے

لختِ دل جھمکے ہے یوں چشم کے پردے سے مرے
تو کہے جگنو ہے یا اس میں شرر باندھی ہے

باندھنوں[1] ہم پہ نئے سر سے لگے ہیں بندھنے
اس نے پھر باندھنوں کی پگڑی مگر باندھی ہے

مصحفی اشک مسلسل کے میں صدقے جس نے
ہر پلک سے تری اک سلکِ گہر باندھی ہے

۱۔ باندھنوں : (ہ) مذکر ۔ چیرا جو مختلف قسم کے رنگ دینے کے واسطے ڈوری سے باندھا کرتے ہیں ۔ وہ بندش جو رنگ ریز چندریاں رنگنے کے واسطے باندھا کرتے ہیں . . .(۲) جھوٹی تہمت ، الزام ۔ (٦) خیال تصور (۷) خیالی افسانہ . (۸) ایک ریشمی کپڑا ۔
(نور اللغات ، جلد اول ، صفحہ ۵۵۲ ، طبع کراچی)

۵۷۶

اول تو یہ دھج اور یہ رفتار غضب ہے
تس پر تری پازیب کی جھنکار غضب ہے

کیوں کر نہ تجھے دوڑ کے چھاتی سے لگا لوں
پھولوں کا گلے میں یہ ترے ہار غضب ہے

جب دیکھوں ہوں کرتی ہے مرے دل کو پریشاں
آشفتگیِ طرۂ طرّار غضب ہے

اے کاش یہ آنکھیں مجھے یہ دن نہ دکھاتیں
اس شوق پہ محرومیِ دیدار غضب ہے

خورشید کا منہ ہے کہ طرف ہوسکے اُس سے
یعنی وہ بر افروختہ رخسار غضب ہے

میں اور کسی بات کا شاکی نہیں تجھ سے
یہ وقت کے اوپر ترا انکار غضب ہے

اب تک حرمِ وصل سے محرم نہ ہوئے ہم
کعبے میں حجابِ در و دیوار غضب ہے

گر ایک غضب ہو تو کوئی اس کو اٹھاوے
رفتار غضب ہے، تری گفتار غضب ہے

فرہاد بچا عشق سے، نہ قیس، نہ وامق
جی لے ہی کے جاتا ہے یہ آزار غضب ہے

اے مصحفی! اُس شوخ سے ٹک بچ کے تو چلنا
سنتا ہے یہاں وہ بتِ خوں خوار غضب ہے

۵۷۷

راہ خدا میں اتنی سعیِ قدم کریں گے
اب اُس گلی کا ہم بھی جانا ہی کم کریں گے

تیغِ نگہ کی اس کے سنتے ہیں آب داری
اک دن جگر کے ٹکڑے ہم بھی بہم کریں گے

آے تھے کچھ سمجھ کر کیا جانتے تھے یہ ہم
تیغِ جفا کو خوباں ہم پر علم کریں گے

بِن خون سے لکھے کوئی[1] ہوتا ہے نامہ رنگیں
ہم انگلیوں کو اپنی اک دن قلم کریں گے

جانے لگا ہے پھر دل بے طرح اُس گلی میں
اس کا بھی رفتہ رفتہ کچھ فکر ہم کریں گے

مسجد میں گر خروشاں ہے شیخ یا صمد خواں
ہم بت کدے میں جا کر ذکرِ صنم کریں گے

معمورۂ جہاں سے دل سرد ہو گیا ہے
یک چند جا کے سیرِ ملکِ عدم کریں گے

گر تازہ کاریوں پر آئے یہ اشک خونیں
تیری گلی کو جیسے باغِ ارم کریں گے

کیا غم ہے مصحفی گر کاغذ نہیں حنائی
ہم خون رو رو اس کو نامہ رقم کریں گے

۵۷۸

چاہ سی کہیں بلا بھی ہوتی ہے
طبع ہے مبتلا بھی ہوتی ہے

شیخ جی سچ کہو تو تم سے نماز
کبھی حضرت! قضا بھی ہوتی ہے؟

۱- بروزن فع -

ق

تو نے اک بات پر کیا مجھے قتل
کہیں ایسی جفا بھی ہوتی ہے؟
مار یوں ڈالتے نہیں اس کو
آدمی سے خطا بھی ہوتی ہے
مصحفی جب میں شعر پڑھتا ہوں
تحسیں اور مرحبا بھی ہوتی ہے

۵۷۹

یوں کر کے مرے لاشۂ قربان کے ٹکڑے
جاتا ہے کدھر او بے مری جان کے ٹکڑے
مت نام لو سینے کا کوئی ورنہ ابھی میں
کر ڈالوں گا پھر اپنے گریبان کے ٹکڑے
وہ خستہ بدن ہوں میں کہ جب ڈھونڈیں ہیں احباب
زخموں سے مرے نکلیں ہیں پیکان کے ٹکڑے
تم نے کبھو آ گو بھی کوئی قتل کیا ہے
اس طرح نہیں کرتے ہیں انسان کے ٹکڑے
اے عشق! روا ہے یہ، گریبانِ زلیخا
ثابت رہے، یوسف کے ہوں دامان کے ٹکڑے
کچھ لختِ دل اور اشک میں اتنا تو نہیں فرق
وہ پارۂ آتش ہیں، یہ طوفان کے ٹکڑے
اے مصحفی! غیرت سے مرے طرزِ سخن کی
ہر اک نے کیے پھاڑ کے دیوان کے ٹکڑے

۵۸۰

اول تو قفس کا مرے در باز کہاں ہے
اور ہو بھی تو یاں طاقتِ پرواز کہاں ہے

انجام ہے بد اس کا نہ ہر اک سے ملا کر
چہرے پہ ترے خط ابھی آغاز کہاں ہے

بلبل تو طرف مجھ سے تو سو مرتبہ ہوتی
میری سی ولیکن تری آواز کہاں ہے

معلوم ہے گھر اس کا نہیں[1] ڈھونڈیں سو کیوں کر
کیا جانیے وہ خانہ بر انداز کہاں ہے

طاؤسِ چمن گرچہ بصد ناز چلیں[2] ہیں
تیری سی روش پر بُتِ طناز کہاں ہے

یارو کوئی سمجھو تو مغنّی کی صدا کو
کس پردے میں بولے ہے، یہ آواز کہاں ہے

میری ہی طرح اور بھی یاروں کی زباں پر
سو بات ہیں پر بات کا انداز کہاں ہے

اے مصحفیؔ! میں جس سے کہوں دردِ دل اپنا
ایسا کوئی یاں محرمِ ہم راز کہاں ہے

۵۸۱

اس کی جب بات کان پڑتی ہے
تنِ بے جاں میں جان پڑتی ہے

دیکھنا سب کا بھول جاتا ہوں
جب نظر تجھ پہ آن پڑتی ہے

۱- ولے : ل ۲ -
۲- چلے ہے : ل ۱ ، ۲ -

قطعہ

ایک دن بھی معاملت جس کو
تم سے اے مہربان پڑتی ہے
جی دیے ہی بنے پھر اس کو[1] صبح
گو کہ شب درمیان پڑتی ہے
عشق کی برق گو نہیں ہمہ سوز
مصحفی پر ندان پڑتی ہے

۵۸۲

جوں نقشِ قدم پیارے واں خاک میں جم بیٹھے
اٹھنے کی ترے در سے ہم کھا کے قسم بیٹھے
احسان کا قاتل کے حق کیوں کہ کریں برباد
شمشیر تلے اس کے ہم بھی کوئی دم بیٹھے
نت تفرقہ ہی اس میں اور ہم میں رہا یارب
افسوس کہ اک دن بھی مل کر نہ بہم بیٹھے
دل کرنے لگا جب شغل اس کوچے میں نالے کا
اک سمت کے تئیں ہم بھی بے[2] دیدۂ نم بیٹھے
آتے ہو تو جلد آؤ یا یوں ہی کہو جاؤ
تا چند میاں صاحب در پر رہیں ہم بیٹھے
اے مصحفی ! آئے تھے وے یار کہ بن بن کر
اس محفلِ ہستی میں افسوس کہ کم بیٹھے

۱- سے : پ ، ل ۱ ، ۲ -
۲- 'با' زیادہ با معنی ہے - 'بے' سہو کاتب معلوم ہوتا ہے - فائق

۵۸۳

خط آ چکا پہ ہنوز اس کی آن باقی ہے
وہی ادا ہے ، وہی عظم و شان باقی ہے

گر اور بھی ہوسِ امتحان باقی ہے
تو اب تلک بھی میاں نیم‌جان باقی ہے

جو اٹھ گئے ترے کُو سے نشست گاہ ان کی
برنگِ نقشِ قدم اک نشان باقی ہے

گداز غم کو جو اب تک ہے لاگ شمع صفت
مگر بدن میں کوئی استخوان باقی ہے

لیا تو جان و دل اس وقت وہ بھی لے لیجے
کچھ اور بھی اگر اے مہربان ! باقی ہے

رہا ہے کون سدا اس جہانِ فانی میں
اسی کی ذات ہے وہ جو ندانِ باقی ہے

ملے بھی خاک میں ہم لیک مصحفی اس کو
ہمارے جینے کا اب تک گمان باقی ہے

۵۸۴

اس کے لبِ میگوں ہیں سدا کام میں اپنے
ہم خونِ جگر کیوں نہ بھریں جام میں اپنے

کس طرح کریں عشق کہ مانند نگیں کے
حرف آتا ہے اس بات کے اک نام میں اپنے

بیدار نہ ہوتے کبھی ہم خوابِ عدم سے
گر عشق نہ کرتا خلل آرام میں اپنے

آئینے میں وہ دیکھ کے زلف اپنی پریشاں
آخر کے تئیں آہی گیا دام میں اپنے

کر کرکے یہ فریاد و فغاں راتوں کو یارو
ہم آپ خلل کرتے ہیں آرام میں اپنے
مر جاویں پہ واعظ کی نہ ہو ہم سے اطاعت
اے مصحفی یہ کفر ہے، اسلام میں اپنے

۵۸۵

دل کو یہ اضطرار کیسا ہے
دیکھیو بے قرار کیسا ہے
ایک بوسہ بھی دے نہیں سکتا
مجھ کو، پیارے تو یار کیسا ہے
کشتۂ تیغِ ناز کیا جانے
خنجرِ آب‌دار کیسا ہے
ہر گھڑی گالیاں ہی دیتے ہو
جان میری، یہ پیار کیسا ہے
مے نہیں پی تو کیوں نشے[۲] میں ہو
انکھڑیوں میں خمار کیسا ہے
اور تو ہیں ہی، یہ تو کہہ پیارے
مصحفی دوست دار کیسا ہے

۵۸۶

دل میں مرغانِ چمن کے تو گماں اور ہی ہے
پر دلِ زار کا اندازِ فغاں اور ہی ہے
قدِ نوخیز نہیں آفتِ جاں اور ہی ہے
جس پہ دل اپنا گیا ہے وہ جواں اور ہی ہے

---

۱ ۔ چھپاتے : پ، ل ۱، ۲ ۔

ہم جہاں رہتے ہیں یارو وہ جہاں اور ہی ہے
وہ جگہ اور ہی ہے اور وہ مکاں اور ہی ہے
شفقی رنگ پہ مت بھولیو اپنے اے ابر!
چشمِ خشک اور مژہٴ اشک فشاں اور ہی ہے
بدن آغشتہ بہ خوں ہونے پہ موقوف نہیں
زخمیِ ناوکِ مژگاں کا نشاں اور ہی ہے
گو کہ اوروں کی ہوئیں سرمے سے آنکھیں[1] روشن
سُرمہٴ بینشِ صاحب نظراں اور ہی ہے
گر چہ رکھتے ہیں نزاکت یہ سبھی مُو کمراں
وہ نزاکت ہے جُدی اور وہ میاں اور ہی ہے
مصحفی گرچہ یہ سب کہتے ہیں ہم سے بہتر
اپنی پر ریختہ گوئی کی زباں اور ہی ہے

۵۸۷

یہ نہیں پیارے وہ تقریر و بیاں اور ہی ہے
جس سے کوئی تم کو سرا ہے وہ زباں اور ہی ہے
میں تو کہتا ہوں بہت ان سے کہ ہوں عاشق صاف
لیک یاروں کو مرے حق میں گماں اور ہی ہے
کیا عمارات سے ڈھونڈے ہے نشانِ عشّاق
ہائے ان خانہ خرابوں کا نشاں اور ہی ہے
ہوگیا پردہٴ دل چاک تو تم دیکھو گے
اس کے پردے میں کوئی آفتِ جاں اور ہی ہے

۱ - روشن آنکھیں : پ۔

اور جو کہتے ہیں مُو تیری کمر کو تو کہیں
ہم کو کیا کام خیال اپنا میاں اور ہی ہے

اک ذرا جھانک توتو خاک کے پردے سے اُدھر
تا تجھے بھی نظر آوے کہ جہاں اور ہی ہے

پھول جھڑتے ہیں قلم سے مرے گل ریز کی طرح
کوئی انصاف سے دیکھے تو سماں اور ہی ہے

مصحفی ہر کوئی کب پہنچے ہے اس رتبے کو
رتبۂ شعر و سخن سچ ہے کہ ہاں اور ہی ہے

۵۸۸

مشعوق کی بلا سے پڑا خوار ہو کوئی
جیوے کوئی ، مرے کوئی ، بیمار ہو کوئی

جس طرح دامِ زلف میں پھڑکے ہے مرغِ دل
یارب نہ یوں کسی کا گرفتار ہو کوئی

سوتا ہے میرے پاس وہ اور گرد سب رقیب
دھڑکا ہے دل میں یہ کہ نہ بیدار ہو کوئی

کیا ایسی تجھ میں خوبی ہے ، کاہےکو کیا ضرور
جی بیچ کر جو تیرا خریدار ہو کوئی

گر کام دل کا لیجیے اُس سے تو خوب سا
کیا ایک بوسہ لے کے گنہگار ہو کوئی

پیارے کرے نہ آہ تو پھر آہ کیا کرے
ہاتھوں سے درد و غم کے جو ناچار ہو کوئی

ق

میری طرف سے اک نے کہا اس کو کاے[1] میاں
کرتے ہیں یوں خفا اسے جو یار ہو کوئی
کہنے لگا کہ واہ جی تم بھی ہو زور شخص
میں کیا کروں جو آپ سے بیزار ہو کوئی
سو بار جا چکا ہے یہ گذری[2] میں مصحفی
وہ دل نہیں کہ جس کا خریدار ہو کوئی

۵۸۹

ہے جی میں تو اپنے کہ وفا کیجیے اس سے
پر جی ہی کا دشمن ہو تو کیا کیجیے اس سے
شاید کہ وہ دل غم کی مرے داد کو پہنچے
اس بات کو ظاہر تو بھلا کیجیے اس سے
غصہ ہو تو کچھ اپنی غرض آپ نہ کہیے
جو کچھ وہ کہے اس کی سنا کیجیے اس سے
تاحشر لبِ شکوہ مرے بند نہ ہوویں
اس دل کو اگر باتوں میں وا کیجیے اس سے
وہ ہم سے جو شاکی ہے تو گو ہووے ولیکن
ہم کو نہیں لازم کہ گلہ کیجیے اس سے
پیچھے ہی لگا پھرتا ہے جوں سایہ شب و روز
کیوں کر دلِ دیوانہ جدا کیجیے اس سے

---

۱ - کاے اصل میں ' کہ اے ' کا مخفف ہے - فارسی شاعری کی تقلید کی ہے - (فائق)

۲ - دیکھیے گدڑی وگذری بہ معنی بازار رہ گذر بہ وقت شام - (فائق)

سنتے ہو میاں مصحفی ہو جاؤ گے رسوا
چھپ چھپ کے نہ راتوں کو ملا کیجیے اُس سے

۵۹۰

آہ و فغاں و نالہ و زاری
ہم ہیں اور یہ رات ہے ساری

دیکھ تو ُتو اس رونے کا رنگ
یوں روتا ہے ابرِ بہاری

اُس بت سے تو وہی[1] بہتر تھا
پتھر سے گر کرتے یاری

اے دل! اب ہم دور چلے ہیں
دیکھیو مت تو راہ ہماری

کیا کیا ہم نے کیا نہیں آگے
چہرہ خراشی، سینہ فگاری

مصحفی آیا وقت سفر کا
چلنے کی کیجے تیّاری

۵۹۱

ایسے تم کیا ہو میاں جو تمھیں ہم دیکھیں گے
جا کسی اور ہی کو اب کوئی دم دیکھیں گے

تم خفا ہم سے بہت ہوگئے اس دیکھنے پر
آج سے ہم کو بھی سوگند ہے کم دیکھیں گے

قبلہ ہوگے تو کبھی منھ نہ کریں گے اودھر
بخدا ہم کو بھی، ہم اور صنم دیکھیں گے

---

۱ - وہی بروزن فع -

غیر دیکھیں تمھیں اور ہم کو کبھو جا بے نہ دیکھ
اپنی آنکھوں سے بھلا ہم یہ ستم دیکھیں گے
دیکھنے کی جو ادھر تم نے قسم کھائی ہے
کب تلک نبھتی ہے ہم بھی یہ قسم دیکھیں گے
دیکھ کے ہم تو چلے پر یہی حسرت ہے کہ ہائے
اب یہ اغیار ترے لطف و کرم دیکھیں گے
ایک دن جان نکل جاوے گی آنکھوں ہی کی راہ
مصحفی عشق میں گر ایسے ہی غم دیکھیں گے

۵۹۲

جب وہ قاتل خرام کرتا ہے
ہر قدم قتلِ عام کرتا ہے
جو کوئی دیکھتا ہے اس کے تئیں
دونوں ہاتھوں سلام کرتا ہے
تجھ بِن اس مے کدے میں اے ساقی!
کون لبریز جام کرتا ہے
تو کھڑا رہ کہ آپھی یہ بسمل
کام اپنا تمام کرتا ہے
جب کہ نکلے ہے گھر سے وہ باہر
عالم اک ازدحام کرتا ہے
نہ کرے گا کوئی میاں صاحب
خدمتیں جو غلام کرتا ہے
ایک دن آکے مل بھی جا پیارے
روز کیا صبح و شام کرتا ہے

ابھی اک زخم اور بھی قاتل
تیغ کو کیوں نیام کرتا ہے

ق

کیا کیا تو نے سن تو دیوانے
کوئی ایسا بھی کام کرتا ہے
مصحفی دل دیا تو ایسے کو
جس سے ہر اک پیام کرتا ہے

۵۹۳

دلِ غش کردہ مرا زار و نزار اس کا ہے
لے چلو واں مجھے جس جاگہ گذار اس کا ہے
ایسے بد وضع سے اب اپنی کہو کیوں کہ نبھے
ہر گھڑی غیر سے ملنا ، یہ شعار اس کا ہے
داغ ہوتے ہیں اسے دیکھ کے گل گلشن میں
سرخ جوں لالہ ز بس رنگِ عذار اس کا ہے
نشۂ مے سے نہیں یارو مری آنکھیں سرخ
خونِ دل کل جو پیا تھا یہ خمار اس کا ہے
شمع رو کیوں نہ جلوں رشک سے پروانے کے
رات ہوتے ہی تری بزم میں بار اس کا ہے
چہرۂ زرد پہ عاشق کے نہیں اس کو نگاہ
جو کوئی زر اسے دے یار، وہ یار اس کا ہے
مصحفی گرچہ میں حسرت زدہ ہوں خاک کا ڈھیر
تو بھی ہر ذرّہ مرا آئنہ دار اس کا ہے

۵۹۴

کیا جانے کب وہ چہرۂ پر نور دیکھیے
کب صبح ہووے یہ شبِ دیجور دیکھیے

از بس میں تجھ سے دیکھے ہیں رنج و تعب کہ اب
دل دیجیے نہ اُس کو اگر حور دیکھیے

کیا کر رہے ہو باغ میں نرگس ہی[1] پر نگاہ
ٹک اپنی بھی تو نرگسِ مخمور دیکھیے

وہ دل کہ جس کی آنکھ سے آنسو گرا نہ ہو
کیا قہر ہے کہ اب اُسے ناسور دیکھیے

ہم رہ گئے ، رفیق سب آگے نکل گئے
اب ہم سے طے ہو کب یہ رہِ دور دیکھیے

تم دیکھو آئنے میں تمھیں اس کا کیا ہے ڈر
جو ہووے اپنی چشم کا منظور ، دیکھیے

اک تند خو سے آنکھ لڑائی تو ہے ولے
ہے حق میں میرے کیا اُسے منظور دیکھیے

مارا ہے ہم کو جان سے اس کے غرور نے
کب مہرباں ہو وہ بتِ مغرور دیکھیے

ایسے کے تئیں نہ چھیڑیے زنہار **مصحفی**
دیوانے پہلے اپنا بھی مقدور دیکھیے

۵۹۵

نت ضعف سے فتادہ یہ سر بر زمین ہے
مانندِ نقشِ پا مرا بستر زمین ہے

---

۱ - یہ تم : پ

کاٹے ہی سے کٹے گی یہ مانندِ بے ستوں
فرہاد راہِ عشق کی پتھر زمین ہے
پست و بلند دہر پہ کیا کیجیے نظر
جب آنکھیں مُند گئیں تو برابر زمین ہے
اس زلفِ مشک فام کی لٹ کھل گئی تھی رات
دیکھا تو اب تلک بھی معطّر زمین ہے
بارِ گنہ سے آپ کو اتنا گراں نہ کر
کشتی کی طرح پانی کے اوپر زمین ہے
ہوں خاکِ پائے خلق ؔمیں دنیا میں مصحفی
یعنی بسانِ مور مرا گھر زمین ہے

۵۹۶

کوچے میں اُس کے کتنوں کا سربر زمین ہے
مسجودِ خلق ہے یہ عجب سر زمین ہے
مت پوچھ ماند و بود تُو اپنے مریض کی
بالیں جو سنگ سے ہے تو بستر زمین ہے
ہندوستاں سے ہائے کوئی کیوں کہ بچ کے جائے
یہ خاکِ سحر خیز تو کافر زمین ہے
اک دن ہوا تھا وہ گلِ عارض عرق فشاں
اب تک ہمارے گھر کی معطر زمین ہے
تخمِ امید اُس میں جو بویا سو جل گیا
صحرائے دل کی حیف کہ بنجر زمین ہے
مت کھینچ آسماں پہ خود کو کہ آخرش
منزل گہِ فقیر و تونگر زمین ہے

فرشِ شہی سے کام ہے کیا ہم کو **مصحفی**
اپنی نشست گاہ تو اکثر زمین ہے

۵۹۷

کوچے کی تیرے خون میں اکثر زمین ہے
کیا خاکِ کربلا یہی کافر زمین ہے

ہے مبتذل ہمیشہ ہوا آہِ سرد کی
اقلیمِ عشق کی بھی عجب سر زمین ہے

دل کی تپش پہ میری ہے اس کا بھی عرصہ تنگ
صحرائے حشر گرچہ سراسر زمین ہے

کس طرح کہیے چھوٹ گئے مر کے وے مریض
سل سی جنھوں کی چھاتی کے اوپر زمین ہے

کیا کیا نہ خوں ہوئے ترے کوچے کی خاک پر
انصاف ہو تو قابلِ محضر زمین ہے

آتا ہے جی میں رو کے ڈبا دوں اسے بھی سب
یہ تھوڑی سی جو پانی کے اوپر[1] زمین ہے

گاڑا تھا تیری زلف کے کشتے کو جس جگہ
کہتے ہیں لوگ واں کی معنبر زمین ہے

دیکھو نہ خاکساروں کو ہرگز بہ چشمِ کم
رتبے میں آسماں کے برابر زمین ہے

جس جا کیا تھا ذبح مجھے اس نے **مصحفی**
تھالے سے خوں کے اب بھی وہاں تر زمین ہے

---

۱ - باہر : ل ۲

۵۹۸

ہر طرف وہ شمع رو ہے جلوہ آرا دیکھ لے
حق نے گر دیں ہیں تجھے آنکھیں، تماشا دیکھ لے

اس گذر کا اور بھی دو دن تماشا دیکھ لے
آنکھیں کرتی ہیں تری کس کس سے سودا دیکھ لے

ہم کو تو ہرگز نظر آتی نہیں اس کی کمر
چاہیے کیا ہم‌نشیں گر تو ہے بینا دیکھ لے

یار کے چہرے سے کھولا چاہتا ہوں میں نقاب
لیک ڈرتا ہوں کوئی اس کو مبادا دیکھ لے

پھر کہاں پاوے گا اے دیوانے یہ فصلِ بہار
کر لے سیرِ گلستاں اور کوہ و صحرا دیکھ لے

دیکھ تو کیسا یہ تیری راہ میں ہے شور و شر
رکھ نہ تو یاں سے قدم آگے، یہ غوغا دیکھ لے

بام پر آتا تو ہے تُو ہو کے ہر شب بے حجاب
اور جو کوئی چاند سا تیرا یہ مکھڑا دیکھ لے؟

مصحفی آخر تو تُو جاوے گا آپھی اس کے پاس
راہ اس کی اور بھی امروز و فردا دیکھ لے

۵۹۹

نہ کرو دیر مرے قتل میں تم، آؤ بھی
گر نہیں تیغ تو خنجر ہی میاں لاؤ بھی

سر بسر مایۂ شر ہے یہ تری بدمستی
شیخ جی خیر سے تم گھر کو کہیں جاؤ بھی

جانِ من دور کھڑے کیا ہمیں ترساتے ہو
آئے ہو اب تو گلے سے کہیں لگ جاؤ بھی

کون برداشت کرے نت کی تمھاری ہر دم
ایک تو گالیاں دو ، دوسرے دھمکاؤ بھی

کیا کروں اب تو کیا تم سے سوالِ بوسہ
لبِ شیریں سے جو دینا ہے تو فرماؤ بھی

سارے عالم میں بہت تم نے کیا مجھ کو خراب
کہیں اے دیدہ و دل ! اپنا کیا پاؤ بھی

بزم سب منتظر آنے کی تمھارے ہے غرض
حضرتِ **مصحفی** تشریف کہیں لاؤ بھی

٦۰۰

ہم کو تو اپنا ہی جانا چاہیے
غیر سے یوں منہ پھرانا چاہیے

کیوں کہ بے تقریب جاؤں اس کے پاس
کچھ تو ملنے کو[1] بہانا چاہیے

جانے کا کچھ اس گلی میں ڈر نہیں
شب کے رہنے کو[2] ٹھکانا چاہیے

کوئی[3] کسی کو مفت بھی دیتا ہے جان
او میاں اتنا تو جانا چاہیے

قصہ غم میں اگر لکھوں تمام
اس کے لکھنے کو زمانا چاہیے

جب کہ گردن رکھ دی ہو خنجر تلے
پھر ہمیں کیا سر اٹھانا چاہیے

---

۱ ، ۲ - کا : پ -
۳- بروزن فع -

تیرِ مژگاں کے یہ دل قابل نہیں
یاں کوئی نازک نشانا چاہیے

رہیے اک شب یاں بھی کیا ایسی ہے ضد
بات کو میری بھی مانا چاہیے

مصحفی ناصح تو نکلا منہ کا سخت
اس کے تئیں اب اک دہانا چاہیے

۶۰۱

اے عشق! تیری اب کے وہ تاثیر کیا ہوئی
شورِ جنوں کدھر گیا، زنجیر کیا ہوئی

دیوانے پن کا میرے جو کرتے نہیں علاج
تدبیر کرنے والوں کی تدبیر کیا ہوئی

آگو کی طرح آپ جو اب بولتے نہیں
کیا جانے ایسی ہم سے وہ تقصیر کیا ہوئی

ہم نے تو تم کو دوڑ کے گودی میں بھر لیا
فرمائیے اب آپ کی شمشیر کیا ہوئی

کی تھی جو میں مرقعِ عالم سے انتخاب
اے مصحفی! دریغ وہ تصویر کیا ہوئی

۶۰۲

وصل کی شب جسے کہتے ہیں سو پائی نہ گئی
ہم گئے جان سے پر تیری جدائی نہ گئی

عشق سے[1] ہم کو کھلاتا تھا قسم یار بہ تیغ
تیغ کھائی پہ قسم ہم سے تو کھائی نہ گئی

۱- کی : پ -

تیری تصویر بنا ، ویسی ہی پھر مانی نے
اور تصویر بنائی تو بنائی نہ گئی

آہ وہ آتشِ سوزاں ہے کہ جس دم بھڑکی
پھر کسی طرح سے یہ آگ بجھائی نہ گئی

آج جو رطلِ گراں دے اسے دشمن ہے مرا
جس سے کل سے کی صراحی بھی اُٹھائی نہ گئی

گرم ہے آہ سے ہنگامۂ آتش بازی
کون سی شب کہ فلک تک یہ ہوائی نہ گئی

کب وہ بُت گھر سے نہ مسجد کی طرف آ نکلا
دیکھنے کس دن اُسے ساری خدائی نہ گئی

گرچہ کوتاہ کیا قطع کر ، اُن کو تُو نے
تو بھی پیارے ترے زلفوں کی رسائی نہ گئی

کس طرح ہم تجھے پردے میں چھپا بٹھلاویں
جب کہ حق سے ہی تری شکل چھپائی نہ گئی

وصل کی شب ہی تو کچھ مجھ سے بگڑ بیٹھے ہے
سب ہوا پر یہ تری شب کی لڑائی نہ گئی

دیکھ اُس جنبشِ ابرو کو ہوے ہم مجروح
مصحفی ہم سے یہ تلوار بچائی نہ گئی

۶۰۳

کل جوں ہی دابی[1] چشم تر انگشت کے تلے
آنے لگا لہو سا ہر انگشت کے تلے

صیاد مجھ کو اب ترے چنگل سے چھوٹنا
رہ جاویں گو کہ اک دو پر انگشت کے تلے

۱۔ ڈالی : ل ۲ ۔

قاتل سے میرے خون کا دعویٰ نہ کیجیو
دیکھو مزار اس کی گر انگشت کے تلے
مرہم لگاوے گو تو مرے داغ کو طبیب
رکھ لیجو ٹک حنا ہی سر انگشت کے تلے
مردوں کے زیردست ہی ہوتے ہیں بھائی بند
جیسے سب انگلیاں ہیں نر انگشت کے تلے
سینے میں داب داب کے رکھوں کہاں تلک
دل ہاتھ کے تلے ، جگر انگشت کے تلے
کاہے کو اپنا زور سے رکھو تم اس پہ ہاتھ
جو ناتواں کہ جائے مر انگشت کے تلے
تو مجھ سے کیا چھپائے ہے لایا ہے اس کا خط
کچھ ہے تو تیری نامہ بر انگشت کے تلے

۶۰۴

روتے نت زار زار گزری ہے
یوں ہی لیل و نہار گزری ہے
جی سے گزرا ہے وہ ، تری صورت
جس کی نظروں سے یار گزری ہے
سیکھے عشق ہم سے کوئی[۱] کہ اپنی عمر
کرتے یہی[۲] کار و بار گزری ہے
اشکِ گلگوں رہے ہیں زیبِ مژہ
خار پر بھی بہار گزری ہے

۱- بروزن فع -
۲- بروزن فع ''ئی'' پڑھا جائے یا ''یہ'' پڑھا جائے - (فائق)

گل کی خاطر میں بھی نہیں اب تک
جی سے بلبل ہزار گزری ہے
پوچھ مت سرگزشت کچھ میری
زیرِ شمشیر یار گزری ہے
کیا کہوں اس نگاہ کا انداز
تیر سی دل کے پار گزری ہے
کہہ دو مجنوں سے ناقۂ لیلیٰ
آج پھر بے مہار گزری ہے
مصحفی سر سے آبِ تیغ اس کی
جیسے دریا کی دھار گزری ہے

٦٠٥

آغوش میں تم آ کے کب اے یار! سو گئے
خالی بغل ہی ہم تو کئی بار سو گئے
اغلب کہ حشر کو نہ اٹھیں گے وہ خواب سے
جو اس کے زیرِ سایۂ دیوار سو گئے
آتی نہیں جو کان تلک اب صدائے آہ
شاید کہ تیری چشم کے بیمار سو گئے
جو آئے اس کے کوچے میں رات ان[1] کی یوں کٹی
دو چار جاگتے رہے، دو چار سو گئے
کیا رکھے چشم وا کوئی اس خواب گاہ میں
یاں ہم سے کتنے مردمِ ہشیار سو گئے

۱- ان پہ: پ ل ۱، ۲-

باہر نکل تو گھر سے کہیں اب تو میری جاں
باشندگانِ کوچہ و بازار سو گئے
مخمل کی سیج پر بھی نہ آتی[1] تھی جن کو خواب
سو اب وے فرشِ خاک پر ناچار سو گئے
گر ہم تمھارے ملنے کو آئے تو تم میاں
چادر[2] سے منہ چھپا وہیں یک بار سو گئے
اے **مصحفی** ملا نہ وہ کافر بہ قولِ درد
ایسے ہمارے طالعِ بیدار سو گئے

٦٠٦

ہم کو نہ دنیا و نہ دیں چاہیے
اک صنمِ زہرہ جبیں چاہیے
دل مرے پہلو میں ٹھہرتا نہیں
جا اسے اب زیرِ زمیں چاہیے
یار کے کوچے میں کرو مجھ کو دفن
یعنی میری قبر یہیں چاہیے
غم نہیں گر ہو مری خاطر حزیں
خاطرِ عشّاق حزیں چاہیے
گریۂ شبنم میں نمک ہے[3] تو لیک
خندۂ گل بھی نمکیں چاہیے

۱- آتا تھا : پ ، ل ۱ ، ۲ -
۲- چادر سے منہ کو ڈھانپ کے یک بار سو گئے : پ ، ل ۱ ، ۲ -
۳- تو ہے : ل ۱ ، ۲ -

چاہیے یہ مہر کی باتیں کرو
ہم سے میاں تم کو نہ کیں چاہیے

بیچتے ہیں مصحفی ہم اپنا دل
ہم سے تو کہیو جو کہیں چاہیے

۶۰۷

چہرے سے نقاب دور کیجے
بس شرم و حجاب دور کیجے

ہو تیغ تو دل کو چاک کرکے
پہلو سے عذاب دور کیجے

ہے جی میں ، یہ زندگی کا برقع
مانند حباب دور کیجے

تا چند نوشت و خواند اے دل !
بس لوح و کتاب دور کیجے

دھو ڈالیے خونِ مصحفی کو
خنجر سے خضاب دور کیجے

۶۰۸

شبِ ہجر کل بے قراری میں گذری
سحر تک ہمیں آہ و زاری میں گذری

نہ جھپکی ، نہ جھپکی ذرا آنکھ میری
یہ شب مجھ کو اختر شماری میں گذری

کیا اس نے گا ہے نہ ملنے کا وعدہ
مری یوں ہی امید واری میں گذری

یہ آنکھیں تری ہیں وہ بازِ سبک پر
کہ جن کی سدا دل شکاری میں گذری

کوئی فعل نیکو[1] نہ ہم سے ہوا ہے
اُسی خجلت و شرم‌ساری میں گذری

یہ عمرِ دراز اپنی جوں زلفِ خوباں
پریشانی و سوگواری میں گذری

کبھو خوں کبھو آب رویا کیا میں
ان آنکھوں کی نت تازہ کاری میں گذری

ترے رو بہ رو بیٹھا رویا کیا میں
شبِ وصل بھی اشک باری میں گذری

بیاں کیا کرے **مصحفی** تجھ سے اُس کا
جو حالت تری دوست‌داری میں گذری

٦٠٩

تری واں تغافل شعاری میں گذری
مری یاں سدا آہ و زاری میں گذری

ہوے آخرِ کار اپنے وے دشمن
جنھوں کی ہمیں دوست‌داری میں گذری

بِن اک خوب صورت نہ ہرگز رہے ہم
ہمیشہ ہی یاروں کی یاری میں گذری

کبھی ایسی زلفوں کو شانہ کیا ہے
صبا تیری نت شانہ کاری میں گذری

چھٹی ہی رکھیں منہ میں مژگاں سے چلمن
ان آنکھوں کی نت پردہ‌داری میں گذری

مجھے آخرِ کار آیا یہ رونا
کہ عمرِ عزیز اپنی خواری میں گذری

۱- اس کا : پنہ

تو کتنا برا ہے کہ اوقات تیری
سدا **مصحفی** ہرزہ کاری میں گذری

۶۱۰

اندازِ و ناز میں تجھے استاد کر گئے
اہلِ زمانہ ہم پہ یہ بیداد کر گئے

صد آفریں ہے ان کو جو اس قتل گاہ میں
آ سر کو وقفِ خنجرِ جلاد کر گئے

آتے ہوئے گلی سے تری جیسے گرد باد
ہم آپ اپنی خاک کو برباد کر گئے

پہنچی نہ گوشِ گل میں صدا اس چمن کے بیچ
کیا کیا نہ مرغ نالہؑ و فریاد کر گئے

کیا ڈر ہے باغباں جو کبھی آ کے باغ میں
ہم بھی نظارۂ گل و شمشاد کر گئے

گر آ گئے گلی میں تری ہم کبھی تو یار
رو کر تسلیِ دلِ ناشاد کر گئے

یارب بھلا ہو ان کا جو آتے ہی روزِ عید
زندانیوں کو قید سے آزاد کر گئے

مرغانِ تیز بال سے شکوہ ہے یہ کہ ہائے
ہم کو اسیرِ چنگلِ صیاد کر گئے

مردانِ دیں انھیں کو لکھا اہلِ ہوش نے
دنیا میں آ کے وے جو تری یاد کر گئے

ہاتھوں کو ان کے چومیے جو اک رقم کے بیچ
کاغذ کو رشکِ صفحہؑ بہزاد کر گئے

اک تو ہی مصحفی نہ گیا قافلے کے ساتھ
اسباب اپنا یار تو سب لاد کر گئے

٦١١

صورت کے تیری صدقے تصویر ہے تو یہ ہے
عاشق کے حق میں پیارے تسخیر ہے تو یہ ہے
دل پیچِ زلف سے ہو کیوں کر رہا کسی کا
گر دام ہے تو یہ ہے ، زنجیر ہے تو یہ ہے
شب خواب میں لیے ہیں بوسے ترے لبوں کے
کیوں کر نہ منفعل ہوں تقصیر ہے تو یہ ہے
دل کی تڑپ سے اپنے پے لے گیا میں یعنی
تیرِ نگہ کا اس کی نخچیر ہے تو یہ ہے
ہے جی[۱] میں شاخِ گل کے لگ کر گلے سے روؤں
رفعِ جنوں کی میرے تدبیر ہے تو یہ ہے
ابرو کے آگے تیرے لازم ہے سر جھکانا
محراب ہے تو یہ ہے شمشیر ہے تو یہ ہے
میری طرف سے اس کا دل کر دیا ہے پتھر
آہ و فغاں کی اپنے تاثیر ہے تو یہ ہے
کل کی شب آہ اپنی گردوں سے پار گذری
ترکش میں عاشقوں کے گر تیر ہے تو یہ ہے
میں مر گیا پر اس نے میری طرف نہ دیکھا
اس جرم عاشقی کی تعذیر ہے تو یہ ہے
فرقت میں تیری پیارے جیتا رہا ہے اب تک
ہاں سچ ہے مصحفی کی تقصیر ہے تو یہ ہے

۱۔ دل : ل ۲

۶۱۲

غیر کے قابو میں یوں آ جائے یار افسوس ہے
ہم رہیں یاں ہاتھ ہی ملتے ہزار افسوس ہے

خاک بھی اپنی نہ پہنچی اس کے کوچے میں صبا
یوں گیا برباد یہ مشتِ غبار افسوس ہے

ہم صفیران[1] چمن نے باغ[2] کی لوٹی بہار
ہم قفس ہی میں رہے فصلِ بہار، افسوس ہے

کیوں نہ میں ماتم میں دل کے بیٹھ کر زاری کروں
اٹھ گیا دنیا سے ایسا غم گسار افسوس ہے

اے دلِ شوریدہ! آخر اُس کی زلفوں کی طرح
ہو گیا تو بھی پریشاں روزگار، افسوس ہے

یہ بھی کچھ قسمت کی خوبی ہے کہ با ایں ارتباط
میری اور اس کی نہ ہو صحبت برار[3] افسوس ہے

جس کو ہم سمجھے تھے یارِ با وفا اے **مصحفی**!
آخر اس نے بھی دیا ہے انتظار افسوس ہے

۶۱۳

ہم رہیں با حسرت و حرماں دوچار افسوس ہے
آئنہ ہو اس کا ہم زانو، ہزار افسوس ہے

مجھ سے روٹھا ہی پھرے ہر لحظہ یار افسوس ہے
غیر سے ہو اُس کو یوں صحبت برار افسوس ہے

۱- ہم صفیران قفس نے باغ کے لوٹے مزے : ب
۲- باغ کے لوٹے مزے : ل ۱-۲
۳ - صحبت برار ہونا : صحبت موافق ہونا، دوستی نبھنا

گل کا پت جھڑ دیکھ کر بلبل یہ بولی آہ مار
مل گیا یوں خاک میں رنگِ بہار افسوس ہے

اس کا وہ دامن جھٹکنا اب تلک آتا ہے یاد
کیا گیا ہے ہاتھ سے میرے شکار افسوس ہے

عید کے دن بھی رہیں محروم ہی ہم یا نصیب !
یار یوں غیروں سے ہووے ہم کنار افسوس ہے

دیکھتے ہی اس کی صورت مصحفی دل سے مرے
یک بہ یک جاتا رہا صبر و قرار افسوس ہے

٦١٢

کرتے نہیں جو داد تو بیداد کیجیے
یعنی کسوا طرح توہمیں یاد کیجیے

دام و قفس کو توڑ کے جاتے رہیں گے ہم
کچھ فکر اور اے مرے صیاد ! کیجیے

صفحے پہ دل کے کھینچیے تصویرِ روے یار
تضحیکِ کار مانی و بہزاد کیجیے

اک آسمان طرفہ بپا ہو ، ہوا کے بیچ
گر اپنی مشتِ خاک کو برباد کیجیے

تقریب کون سی ہے ہمارے نشاط کی
اس دل کو کس طرح سے بھلا شاد کیجیے

اپنے نصیب میں یہ لکھا تھا کہ فصلِ گل
کنجِ قفس میں زمزمہ بنیاد کیجیے

صنعت پہ آئیے تو ابھی سنگِ سخت میں
ناخن سے کارِ تیشۂ فرہاد کیجیے

۱- کسی : پ

کیوں مصحفی کو دیتے ہو دشنام آو میاں!
مرتا ہے وہ اسے بہ دعا یادِ کیجیے

٦١٥

خاطر کو بندِ غم سے ٹک آزاد کیجیے
چلیے چمن میں روئیے فریاد کیجیے

تا چند ہم سے جان مری یہ رکھائیاں
گا ہے تسلیِ دلِ ناشاد کیجیے

مانندِ گل جو کھولیے دستِ سخا کبھو
زر اک طرف کہ آپ کو برباد کیجیے

آتا ہے جی میں صورتِ شیریں کو دیکھ کر
جا بے ستوں میں ماتمِ فرہاد کیجیے

روے شبِ فراق سیہ، کانپتا ہے دل
اس شب کی بے قراریاں گر یاد کیجیے

کہتا ہے جو کچھ آپ کو، پھر سوچتے ہو کیا
ہم کو بہ جاں قبول ہے ارشاد کیجیے

گر جائیے چمن میں تو آنکھیں نہ موندیے
واں بھی نظارۂ گل و شمشاد کیجیے

یک پردہ عندلیب سے رکھیے نوا بلند
نالے کی طرز اب کے گر ایجاد کیجیے

ڈرتے نہیں جفا سے جو چوکیں وفا سے ہم
جتنا کہ تم سے ہو سکے بیداد کیجیے

اڑنے کے بال و پر ہیں کہاں مصحفی مگر
اب پھر سراغِ خانۂ صیاد کیجیے

٦١٦

ہے آج جو گلشن میں بہارِ گلِ مہندی
آتا ہے نظر سرخ عذارِ گلِ مہندی

بے برگی غرض اس کی تو ظاہر ہے سبھوں پر
کیا رنگِ شفق ہووے دو چارِ گلِ مہندی

کہیے گل بے خار اگر اس کو بجا ہے
یعنی کہ نہ دیکھا کہیں خار گل مہندی

ہر شاخِ گل افشاں سے ہے ظاہر کہ چمن میں
ہے خود گلِ مہندی ہی نثارِ گلِ مہندی

کیوں کر نہ گریباں کو کریں چاک کہ بن یار
یوں ہاتھ سے جاتی ہے بہارِ گلِ مہندی

رنگین ہے اتنا کہ وہ ہو جائے حنائی
انگشت سے گر کیجے شمارِ گل مہندی

اے مصحفی آتش سی لگا دی ہے چمن میں
اڑتے نہیں پتے میں شرارِ گل مہندی

٦١٧

عاشق کو اپنے منعِ محبت نہ کیجیے
یہ بھی نہ کیجیے جو مروت نہ کیجیے

ہے گریۂ شبانہ سے آگو ہی دل پہ کوفت
اے آہِ صبح اور قیامت نہ کیجیے

میں آپ خوش ہوں آئیے تلوار کھینچ کر
تم کو قسم ہے میری رعایت نہ کیجیے

گر یہ تپش ہے دل کی تو شاید کہ بعد مرگ
زیرِ زمیں بھی خواب فراغت نہ کیجیے

وقتے کہ دست‌رس ہی نہ ہو اس عذار پر
پھر کس طرح نگاہ بہ حسرت نہ کیجیے

مقتل میں دل چلا ہے یہ جائے گا کیا بھلا
گر واں تلک بھی اس کی رفاقت نہ کیجیے

میری طرف بھی دیکھیے ٹک میرے روبرو
نظروں میں ہر کسی سے اشارات نہ کیجیے

تابوت پر تو آئیے اپنے مریض کے
گر زندگی میں اس کی عیادت کیجیے

سر کاٹ کر اگر تو مرا پھینک دے میاں
تو بھی کسی سے تیری شکایت نہ کیجیے

صورت کو ٹک ہی دیکھیے اس کی بھی ناصحو
مجھ کو[1] ہی وقت وقت نصیحت نہ کیجیے

اس دھج سے اپنا پاؤں نہ رکھیے زمین پر
میری تو کیا ہے شہر کو غارت نہ کیجیے

اے مصحفیؔ! نہ جائیے اس کی گلی کے بیچ
سنیے کسی کی بات جہالت نہ کیجیے

٦١٨

اجل[2] کی گھات مری جان ہر کسی پر ہے
بہ ہوش باش کہ عالم روا روی پر ہے

مژہ سے[3] چنتی سی آتی ہے کوئی بوند کبھی
ز بس کہ خونِ جگر ان دنوں کمی پر ہے

---

۱ - عاشق کو : پ ل۱ ، ل۲ (حاشیہ پر)
۲ - اجل لگائے ہوئے گھات ہر کسی پر ہے : پ
۳ - پہ : پ

میں دیکھتا ہوں طرف اس کی اور بزعم مری
نگاہ اس بت کافر کی آرسی پر ہے
دلا خمش گلۂ روز گار کیا کیجے
کچھ ایک تو[1] نہیں یہ حادثہ سبھی پر ہے
میں جانتا نہیں تڑپے ہے کون خوں میں مگر
کسی کے ہاتھ سے آفت کسی کے جی پر ہے
لگا کے تیر مرے ہم سروں سے یوں بولا
لگاؤ تم بھی کہ چوٹ اپنی اب اسی پر ہے
ہمیں خبر نہیں پر بعضے لوگ کہتے ہیں
کہ خون کتنوں کا اس پان اس[2] مسی پر ہے
بظاہر اتنی خشونت یہ[3] کیا ہے حیراں ہوں
مزاج اس کا اگر ہم سے آشتی پر ہے
خدا کے واسطے ہاتھوں کو مت حنائی کر
کہ تیرے ہاتھوں سے بیداد مصحفی پر ہے

٦١٩

شب روتے روتے ہم جو ترے غم میں سو گئے
تا صبح ہوتے ہم پہ تو طوفان ہو گئے
آئے جو تیرے کوچے میں سوداگران عشق
تیرا[4] تو کیا لیا وہی کچھ اپنا کھو گئے
کس سے ہم اپنے دیدۂ تر کا کریں گلہ
ڈوبے یہ آپ اور ہمیں بھی ڈبو گئے

---

۱ - پر : پ ، ل۱-۲
۲ - اور : پ ، ل۱-۲
۳ - مگر یہ حیراں ہوں : ل۲
۴ - تیرا تو کیا لیا وہ کچھ اپنا ہی کھو گئے : پ ، ل ۱-۲

از بس دو چند شوق رہا مجھ کو نامہ بر
آیا جو واں سے ایک تو پھر یاں سے دو گئے

تو کار گاہِ عشق کی کچھ نازکی نہ پوچھ
یاں رونے والے پلکوں سے موتی پرو گئے

دریاے خوں بہا تھا ز بس اس گلی کے بیچ
پہنچے وے اپنی جان سے جو ہاتھ دھو گئے

آیا نہ تو تو بجلی کا سینہ ترق گیا
تربت پہ بے کسوں کی ترے ابر[1] رو گئے

اس سر زمین عشق سے حاصل ہوا نہ خاک
یاں کتنے شخص تخم تمنا کا بو گئے

میں رہ رواں عشق کا پایا نہ کہیں[2] سراغ
اے مصحفی! گئے ہیں وہ اس رہ میں جو گئے

٦٢٠

نظروں سے جب نہاں وے برو دوش ہوگئے
ہم لاکھ حسرتوں سے ہم آغوش ہوگئے

آیا چمن میں وہ گلِ نازک جو ہم[3] کو یاد
گلہاے باغ جی سے فراموش ہوگئے

گرمِ سخن تھی جن کی زباں ساری ساری رات
سو وے چراغِ صبح سے خاموش ہوگئے

تزئین عاریت کا اسے کب خیال ہے
قطرے عرق کے جس کے در گوش ہوگئے

---

۱ - آبرو گئے : پ ، آب رو گئے : ل۱-۲
۲ - کچھ : پ، بروزن فع
۳ - مجھ : ل ۱

رکھتے تھے وے جو ہوش کا کچھ اپنے اعتماد
صورت کو تیری دیکھ کے بے ہوش ہوگئے
کس کس کو یاد کیجیے ، پردے میں خاک کے
کیا کیا نہ ماہ پارے کہ روپوش ہوگئے
اس مے کدے میں مثلِ خمِ بادہ **مصحفی**
دو دن ہمارے دل کے بھی سرجوش ہوگئے

۶۲۱

دین و ایماں دل و جاں سب تجھے دوں ایسے جی
ایک بوسہ بھی عوض اس کے نہ لوں ایسے جی
مجھ سے کہتے ہو تجھے قتل نہیں کرنے کے
غیر سے پھر یہ اشارہ ہے کہ ہوں ایسے جی
ہر کوئی منھ میں مری جان زباں رکھتا ہے
گالیاں دو مجھے میں کچھ نہ کہوں ایسے جی
مار گیری میں ہوں استاد میں اے افعیِ زلف!
اک ذرا ہاتھ لگاتے ہی یہ فوں ، ایسے جی
آپ ہر دم جو یہ کہتے ہیں کہ تو کیوں ہے کھڑا
دل تمھیں دے کے میں کیا بیٹھ رہوں ایسے جی
ذبح کر ڈالو ابھی تم تو غریبوں کے تئیں
بخش دیوے تمھیں اپنا کوئی خوں ایسے جی
زیست کی قیس نے جس طرح کہ ویرانے میں
مصحفی تو بھی ہے گر اہل جنوں ایسے جی

۶۲۲

اس بت کو نہیں ہے ڈر خدا سے
بگڑی بندے سے گر خدا سے

گو خلق بھی جانے حال میرا
پوشیدہ نہیں مگر[1] خدا سے

ہے تم سے تو آہ آہ کرنا
دینا اس کو اثر خدا سے

ہم نے اسے اپنا سود جانا
پہنچا بھی اگر ضرر خدا سے

دیکھا ہے میں جب سے وہ بتِ شوخ
پھر گئی[2] ہے مری نظر خدا سے

بازیچے میں ہے آدھر وہ مشغول
اور بن رہی ہے ادھر خدا سے

کچھ خوب نہیں یہ خود نمائی
ہاں اے بتِ شوخ ! ڈر خدا سے

ہے بیر خدائی اور خودی میں
اتنی بھی خودی نہ کر خدا سے

یہ سارے خدا شناس ہیں لیک
دیتا نہیں کوئی[3] خبر خدا سے

اے **مصحفی** ! کچھ کمی نہیں واں
جو چاہے سو مانگ ، پر خدا سے

---

۱ - اگر : ل ۲
۲ - ''گئی'' بروزن فع پڑھا جائے ۔
۳ - بروزن فع ۔

۶۲۳

بتاں وہ مہر و محبت وہ چاہ بھول گئے
ہمارے حال پہ کرنی نگاہ بھول گئے

کل ایسی شکل سے آیا وہ بیچ مجلس کے
کہ داد مانگنی سب داد خواہ بھول گئے

ابھی تو تم نے کہا تھا کہ بوسہ دیتا ہوں
پھر اتنے ہی میں مری جان ، واہ بھول گئے

پھرا کریں ہیں شب و روز کیا مگر پیارے
تمھارے کوچے میں کچھ مہر و ماہ بھول گئے

تمھارے دل میں جو خطرہ نہیں محبت کا
مگر ہماری وہ فریاد و آہ بھول گئے

ہمیشہ **مصحفی** ہم راہ راہ جاتے تھے
گئے کل اس کی گلی میں ، تو راہ بھول گئے

۶۲۴

جاویں کیدھر کو اب اس تاب و تعب کے مارے
اے بتاں! ہم تو خدا کے ہیں غضب کے مارے

ابھی چاہیں تو تمھیں بھر لیں میاں کولی میں
چھیڑتے ہم جو نہیں ہیں تو ادب کے مارے

جا کے پوشیدہ ہوے کوہ و بدخشاں کے بیچ
لعل و یاقوت تری سرخیِ لب کے مارے

ایک بوسہ نئے قلیاں ہی کا دے اے گل رو!
دل مرا سوخت ہوا جاہے طلب کے مارے

کون ہوتا ہے بلد[1] گم شدگاں کا تیرے
کوچۂ عشق میں وے پھرتے ہیں کب کے مارے

خاک بھی ان کی جو جلتی ہو تو کچھ دور
مر گئے وے جو ترے عشق کی تپ کے مانہیں

مصحفی ہم میں تو طاقت نہ رہی ، خانہ خراب رے
گریۂ روز کے اور نالۂ شب کے مارے

۶۲۵

ہوسِ گریہ سے ہو دل کوئی دم تا خالی
آ نہ اے اشک! ہے آنکھوں میں تری جا خالی

بس کہ فرقت میں تری سال ہی گذرے ہم کو
ہم نے جو چاند کہ دیکھا سو وہ دیکھا خالی[2]

ہم وے سے نوش ہیں ساقی کہ اگر مستی میں
منہ بھڑا دیویں تو ہو جا خمِ صہبا خالی

اور سامانِ طرب سب ہوا موجود پہ یار
ایک تجھ سے ہے ابھی بزم تمنا خالی

نقد وقت اپنا تو برباد نہیں دیتا میں
گو زر و سیم سے اب ہاتھ ہے میرا خالی

---

۱ - بلد - ع (بہ فتح باولام) شہر ، بلاد جمع ، در فارسی بہ معنی راہ نما و کسے راکہ راہے بشناسد یا کارے را بداند نیز می گویند - (فرہنگ عمید ، ص ۲۷۶)

۲ - خالی - ذی قعدہ - چاند کا گیارھواں مہینہ - یہ نام نورجہاں بیگم نے رکھا تھا - عورتیں اس مہینے کو منحوس سمجھتی ہیں - (نوراللغات ، ج ۲ ص ، ۶۱۹)

دل میں کچھ خوں نہ رہا چشم میں جب اشک آوے
جامِ پُر ہوتے ہی یاں ہوگیا مینا خالی

مصحفی دیکھ کے دل کیوں نہ بھر آوے اُس کو
نظر آتا ہے مجھے قیس سے صحرا خالی

٦٢٦

دن رات دل اضطراب میں ہے
جی ہے سو جدا عذاب میں ہے

سبحان اللہ تیرا چہرہ
یہ نور کب آفتاب میں ہے

کرتے ہو جو تم عتاب اتنا
کچھ لطف بھی اس عتاب میں ہے

اس شاہ سوار کے میں صدقے
جس کے دوجہاں رکاب میں ہے

دل گریۂ گرم و تر کے ہاتھوں
کچھ آتش میں کچھ آب میں ہے

سورج نکلا پہ تیرا مکھڑا
اب تک پیارے نقاب میں ہے

اس دل میں میاں تری محبت
جیسے کہ نمک کباب میں ہے

پاس اپنے تو مصحفی زر نقد
اک دل ہے سو کس حساب میں ہے

٦٢٧

معشوقۂ گل نقاب میں ہے
محبوبہ[1] ابھی حجاب میں ہے

مہندی نہ لگا ، کہ جان میری
ہاتھوں سے ترے عذاب میں ہے

تو ہے وہ بلا کہ ماہ و خورشید
زلفوں کی تری رکاب میں ہے

ہر اک تجھے آپ سا کہے ہے
قضیہ مہ و آفتاب میں ہے

اللہ رے ترے پسینے کی بو
کب ایسی بھبک[2] گلاب میں ہے

اس زلف کا اینٹھنا تو دیکھو
بن چھیڑے ہی پیچ و تاب میں ہے

ق

قہاری کی شان جب سے تیری
عالم کے اوپر عتاب میں ہے

---

۱ ۔ محبوبہ : پ

۲ ۔ مؤلف فرہنگ آصفیہ اور مؤلف نوراللغات کے نزدیک بھبک شعلے کی بھڑک ۔ کسی تیز یا سڑی ہوئی چیز کی بو ، بھکراند وغیرہ کو کہتے ہیں ۔ لیکن مصحفی نے اس شعر میں تیز خوش بو کے معنی لیے ہیں ۔ اس لیے اس شعر سے بھبک کے ایک اور معنیٰ واضح ہوجاتے ہیں جو لغت نگار نظر انداز کر گئے تھے ۔ فائق (تفصیلات کے لیے فرہنگ آصفیہ ج ۱ ص ۳۴۳ اور نوراللغات ج ۱ صفحہ ۷۱۱ ملاحظہ فرمائیے)

دل کوہ کا ہو گیا ہے پانی
دریا سب اضطراب میں ہے
اٹھ مصحفی آفتاب نکلا
اب تک تو دوانے خواب میں ہے

٦٢٨

جب مری خاک پہ ٹک بیٹھ کے یار اٹھتا ہے
اس کے دامن کے پکڑنے کو غبار اٹھتا ہے
ہم کو تکلیف نہ دو شیخ جی عمامے کی
لاویں سر کس کا ، کوئی ہم سے یہ بار اٹھتا ہے
جو کوئی تجھ سے مقمر[1] سے رکھے ہے بازی
نقد دل اپنا وہ ایک آن میں ہار اٹھتا ہے
آ جھمکتا ہے وہیں خونِ دل آنکھوں میں مری
ناگہاں جیسے کبھی ابرِ بہار اٹھتا ہے
پر بجاں[2] آئے ہیں ہم ہاتھ سے ناداری کے
جب ہو دوکان سے بنیے کی ادھار اٹھتا ہے
تاب و طاقت ہے کہاں ہم میں تو اب اٹھنے کی
ہاں مگر دل سے کبھی نالۂ زار اٹھتا ہے

---

۱ - مقمر اردو فارسی لغات میں نہیں ملا مقامر بہ معنی جواری تمام لغات میں ہے ۔ عربی لغت المنجد وغیرہ میں بھی یہ لفظ نہیں ہے ۔ مصحفی عربی میں منتہی ہے ۔ اس لیے یہ فیصلہ کرنا کہ مقمر غلط ہے مشکل ہے ۔ فائق

۲ - بجاں آمدن ۔ کنایتہً خستہ ہونا ۔ عاجز ہونا ۔ تنگ آنا ، بیزار ہونا زندگی سے اور موت پر راضی ہونا ۔
(ترجمہ فرہنگ عمید صفحہ ۲۳۹)

مصحفی کے تئیں کیا جانے ترا کیا ہے خیال
سوتے سوتے تجھے اکثر یہ پکار اٹھتا ہے

۶۲۹

کاہے کو تیرے دام سے آزاد ہو کوئی
کیا[1] یہاں سے اُڑ کر کہیں برباد ہو کوئی

گل بن کے تلے جائیو بلبل تو سمجھ کر
ایسا نہ ہو واں گھات میں صیاد ہو کوئی

گل چاک گریباں ہے تو سنبل ہے پریشاں
اس گلشن ناشاد میں کیا شاد ہو کوئی

بس مرتبۂ عشق ہوا ختم اُنہیں پر
من بعد نہ مجنوں ہو نہ فرہاد ہو کوئی

تم بھیجو گے ہم پاس میاں کاہے کو قاصد
قاصد تو وہ بھیجے کہ[1] جسے یاد ہو کوئی

کیا پوچھو ہو یارانِ عدمِ رفتہ کا احوال
اُن یاروں سے حاشا کہ مجھے یاد ہو کوئی

کر لے ابھی اے دل! تجھے ارمان نہ رہ جائے
سینے میں اگر اور بھی فریاد ہو کوئی

البتہ گرفتاری میں آزاد رہے وہ
مجھ سا ہی اگر مردمِ آزاد ہو کوئی

چھوڑا نہ میاں **مصحفی** تم نے کوئی لونڈا
تم کام میں اپنے غرض استاد ہو کوئی

---

۱ - اڑ کر یہاں سے کیا... ؟ (ادارہ)
۲ - گا : پ

۶۳۰

سخت نازک ہے ترا موے[1] کمر رشتے سے
اس کے واقف ہو میاں کیا کوئی سر رشتے سے

ہووے ان تارِ گریباں کی قسم ہی گل کے (کذا)
باغباں باندھے تو گلدستہ اگر رشتے سے

زخم پیوند رفو گر سے نہ ہو عاشق کا
پیچک زلف سیے اس کو مگر رشتے سے

اب کے کیا جانیے اس بند سے کیوں کر چھوٹیں
بے طرح باندھے ہیں صیاد نے پر رشتے سے

آن سے کیا فائدہ ہے اس کی سر زلف کا ذکر
وے جو واقف ہی نہیں زلف[2] کے سر رشتے سے

اشک کا تار نہ کر صرفِ قبا دوزیِ دل
کفنِ مردہ کو سیتے نہیں تر رشتے سے

روز و شب طول امل کا ہوں گرفتار کہ ہے
دلق درویش کو کام آٹھ پہر رشتے سے

رشتہ داری نہیں کچھ خوب تو کر آپ کو گم
کرکے سوزن کی طرح قطع نظر رشتے سے

اشک مژگاں سے ٹپکتے ہیں مرے پے در پے
مصحفی گرتے ہیں جس طرح گہر رشتے سے

---

۱ - میاں : ع م سرور
۲ - بات : پ ، ل

۶۳۱

جان کر زلف کیا ہم نے حذر رشتے سے
سانپ کے کاٹے کو لگتا ہی ہے ڈر رشتے سے
گہہ کمر کا تو گہے زلف کا کرتے ہو بیاں
بات کہتے ہی نہیں تم کبھی سر رشتے سے
کیا ہی دل چسپ ہے دانتوں کی ترے بتیسی
مانگ رکھے ہیں کہے تو یہ گہر رشتے سے
جی میں ہے کیجے گریباں کے تئیں اتنا چاک
کہ رفو ہو نہ کبھی بارِ دگر رشتے سے
ڈورے کا نہ پہن جامہ کہ میں ڈرتا ہوں
تنِ نازک کو ترے پہنچے ضرر رشتے سے
اس قدر چاک گریباں کے مرے[1] ہے مصروف
کہ نہیں سوزنِ عیسیٰ کو خبر رشتے سے
کیا ستم تو نے کیا مجھ کو کھلا خط بھیجا
کچھ بھی واقف ہے مروت کے تو سر رشتے سے
گر کمر بند بھی ہوتا نہیں تو رسم ہے یوں[2]
باندھ دیتے ہیں ذرا خط کی کمر رشتے سے
مصحفی اشک یہ مژگاں پہ نہیں سرخ و سپید
منعقد[3] ہیں کئی یاقوت و گہر رشتے سے

---

۱ - تئیں : ل ۲
۲ - یہ : ل ۲
۳ - منعقد : گندھے ہوئے، پرے ہوئے

٦٣٢

جگر چھن گئے اس کی پلکوں کے ہلتے
ہم اے کاش! ان انکھڑیوں سے نہ ملتے
مرے داغ دیکھو غضب تھا چمن میں
گر اس رنگ کے بھی کئی پھول کھلتے
جو دامن کشاں تو چمن میں نہ آتا
صبا سے کہیں گل کے غنچے نہ کھلتے
وہ دلی کے کوچے ہیں اب سارے خالی
کھوے سے کھوے تھے جہاں روز چھلتے
غضب تھا اگر نیزہ دارانِ مژگاں
اٹھا گھوڑے یکبارگی تم پہ ہلتے
میاں عید کے دن تو بیجا نہ تھا کچھ
جو تم **مصحفی** سے گلے لگ کے ملتے

٦٣٣

ان گرم نگاہوں سے تری کوہ بھی جل جائے
تو دیکھے بھی یک بار تو پتھر بھی پگھل جائے
آرام ہو آئندہ کو اور نت کا خلل جائے
دل آب ہو سینے سے مرے کاش نکل جائے
کرتا ہے وضو شیخ لبِ حوض پہ بیٹھا
ایسے میں تماشا ہو جو پاؤں اس کا پھسل جائے
جس آگ میں جلتا ہے پڑا لعلِ دل اپنا
پتھر بھی اگر رکھے تو اس آگ میں جل جائے
حسرت تو مجھے یہ ہے کہ با ایں ہمہ خواہش
آغوش میں کھینچوں اسے اور یوں وہ نکل جائے

اک قطرۂ خوں ٹپکے گر آنکھوں سے ہماری
واللہ زمانے کا ابھی رنگ بدل جائے

گہہ سبزے کو دیکھوں ہوں گہے آبِ رواں کو
تا یہ دل غم دیدہ اسی طرح بہل جائے

اک روز تو کر **مصحفی** اپنے کی عیادت
شاید تری پرسش سے یہ بیمار سنبھل جائے

٦٣٤

ٹھکراتے طرفِ دامن ، بندِ قبا کو ملتے
کچھ آج زور سج سے آتے ہو دھج بدلتے

وے دن کدھر گئے اب جو وعدہ گہ میں اکثر
ہم ہوتے منتظر اور تم ووں ہی آ نکلتے

یا پاس سے ہم اُس کے اب آپ بھاگتے ہیں
یا ایک دن وہ تھا جو ٹالے ہوئے نہ ٹلتے

شعلے میں شمع کے گر جلوہ ترا نہ ہوتا
پروانے صدقے ہو ہو اُس پر سے یوں نہ جلتے

آنے کی **مصحفی** کے سن کر خبر شتابی
کل رہ گئے گلی سے ہم اُس کی چلتے چلتے

٦٣٥

انگشتری جو دی ہے مرے یار پھینک دے
میں ہوں اُدھر کھڑا پسِ دیوار پھینک دے

آوے تو[۱] معرکے میں تو صورت کو تیری دیکھ
رستم بھی اپنے ہاتھ سے تلوار پھینک دے

---

۱ - جو : ل ۱

آیا ہوں پھرتے پھرتے پہ ڈر ہے یہی کہ یار
کیا جانے پھر کدھر کو یک بار پھینک دے

کیا ہووے باغباں، جو تو گلشن سے چن کے گل
بلبل کے آشیاں میں بھی دو چار پھینک دے

کس کام کا یہ دل ہے مرے پاس لے میاں
تو سر سے وار کر یہ دلِ زار پھینک دے

ہووے نہ اس کا پائے طلب ریش پھر کبھی
جو راہ سے کسی کے اُٹھا خار پھینک دے

دیکھے جو ایک جلوہ ترا شیخ و برہمن
یہ توڑ ڈالے سبحہ، وہ زنّار پھینک دے

کیا ظلم ہے کہ کرلے ہمیں قید باغباں
اور آشیاں کو آ، سوے گلزار پھینک دے

روے زمیں پہ حسن نہیں ہاں مگر خدا
اب آسماں سے کوئی طرح دار پھینک دے

اک ٹھیکری پہ لکھ کے کوئی حالِ دل مرا
ایسا ہو اس کے گھر میں شبِ تار پھینک دے

کس پاس پہنچوں دل کے تئیں لے کے ہاتھ میں
یہ ہے وہ جنس جس کو خریدار پھینک دے

کیا دور ہے جو اپنے تئیں لولی فلک
تجھ پر سے وار پھیر کے سو بار پھینک دے

ناصح نے تیرا پکڑا گریباں تو **مصحفی**
بھڑوے کی تو آتار کے دستار پھینک دے

۶۳۶

تم رات وعدہ کر کے جو ہم سے چلے گئے
پھر تب سے خواب میں بھی نہ آئے ، بھلے گئے

رکھا قدم زمیں پہ جو اُس سروِ ناز نے
پہلے قدم کے رکھتے ہی واں دل ملے گئے

اب کس ہوس سے باغ میں دھومیں مچائیے
وہ شوق ہی نہیں رہا ، وہ ولولے گئے

آتش میں تیرے عشق کی مانندِ چوب خشک
جب تک کسی نے ہم کو جلایا جلے گئے

وعدہ تھا پشتِ بام پر اس مہ کا نیم زور
ہم نا تمام بھول گئے ، دن ڈھلے گئے

رکھتا تھا **مصحفی** تو بہت شوقِ کوے یار
ہم ساتھ اپنے آپ ہی اُس کو نہ لے گئے

۶۳۷

یہ تو آوازِ ہم صفیر ہی ہے
اس قفس میں کوئی اسیر ہی ہے

ہو چکا دورِ خسرو و فرہاد
اب نہ شیریں نہ جوے شیر ہی ہے

دشت پُر صید ہے تو کیا کیجے
پاس اپنے کہاں نہ تیر ہی ہے

دل تو اُس کو سے کیوں نہیں اُٹھتا
کیا کہیں یاں ترا خمیر ہی ہے

جل گئے ہم تو اپنی خاکستر
دیکھ لو[1] گے تیرا عبیر ہی ہے

تیرے ابرو کے رو بروِ مہِ نو
اپنی آنکھوں میں تو حقیر ہی ہے

گو کہ تو میر سے ہوا بہتر
مصحفی میر پھر بھی میر ہی ہے

٦٣٨

بات سن لے خدا غریبوں کی
اجل آوے مرے رقیبوں کی

مجھ سے تم پھر گئے بہ ایں خوبی
یہ ہے[2] خوبی مرے نصیبوں کی

وہ[3] کہ تشخیص میں مرض کی مرے
عقل حیران ہے طبیبوں کی

ق

غنچۂ گل کی چولی مسکی دیکھ
عقل بھولی جو عندلیبوں کی

ہائے دیکھی نہیں انھوں نے مگر
وضع دلی کے جامہ زیبوں کی

---

۱ - توتو : ل ۲
۲ - بھی : ل ۲
۳ - واہ ؟ : فائق

ق

کہیں کم بختی سے جو جا نکلا
مصحفی کل طرف حبیبوں کی
ان کے مرزائیوں کے ہاتھوں سے
مار اس پر پڑی جریبوں کی

٦٣٩

تسبیح شیخ میں گو ہوویں ہزار دانے
اپنے بھی اشک کے ہیں یاں بے شمار دانے
از بس کہ رنگ پان نے تزئیں کیا ہے اس کو
ہیں دانت سرخ اس کے جیسے انار دانے
جوں خوش نما فلک پر لگتے ہیں عقدِ پرویں
رکھتا ہے موتیوں کے کانوں میں یار دانے
زیر فلک ہے ہم پر وہ اضطراب پیدا
جوں آسیا کے نیچے ہوں بے قرار دانے
ہیں جیسے اشک گل‌گوں اے مصحفی! ہمارے
یاقوت کے رکھیں ہیں کب یہ بہار دانے

٦٤٠

لینے لگے جو چٹکی یک بار بیٹھے بیٹھے
یہ چھیڑ کیا نکالی اے یار! بیٹھے بیٹھے
کل وعدہ گاہ میں جب وہ بے وفا نہ آیا
اکتا کے اٹھ گئے ہم ناچار بیٹھے بیٹھے
جو کچھ پڑھا ہے ہم نے ہم آپ ہی اسی کی
گھر میں کیا کریں ہیں تکرار بیٹھے بیٹھے

ہم نے تو اس کو ہرگز یارو کہا نہ تھا کچھ
کچھ یوں ہی ہو گیا وہ بے زار بیٹھے بیٹھے

تجھ بن تو ہم نے وے بھی با خامشی ادا کیں
یاد آئیاں جو باتیں دو چار بیٹھے بیٹھے

اے مصحفی انھوں میں صنعت نہیں کچھ اتنی
لکھ ڈالے ہم نے کل یہ اشعار بیٹھے بیٹھے

۶۲۱

بیٹھے بیٹھے جو ہم اے یار! ہنسے اور روئے
آ گیا یاد تو اک بار ہنسے اور روئے

شعر تر پڑھنے سے یاروں میں ہمیں کیا حاصل
مگر اتنا ہے کہ دو چار ہنسے اور روئے

شادی و غم کی جو اٹھ جائے جہاں سے رہ و رسم
پھر تو کوئی بھی نہ زنہار ہنسے اور روئے

ناتوانی نے کیا اس کو تو نقش قالیں
کیا ترے چشم کا بیمار ہنسے اور روئے

مصحفی رات میں افسانۂ دل کہتا تھا
سن کے ہمسایے کئی بار ہنسے اور روئے

۶۲۲

خبر کچھ نہیں مجھ کو بسمل کی اپنے
میں صورت ہی تکتا ہوں قاتل کی اپنے

جو گزرے ہے مجھ پر سو حق جانتا ہے
حقیقت کہوں کس سے میں دل کی اپنے

نہ آئینہ میں اس نے پھر عکس دیکھا
نی اپنی ہی صورت مقابل کی اپنے

کوئی لوٹتا ہے کوئی پیٹتا ہے
غرض طرفہ حالت ہے محفل کی اپنے
وو ہیں خفتگان عدم چونک اٹھیں گے
جو جھنکار پہنچی سلاسل کی اپنے
کیا زخمی غمزہ اور کچھ نہ پوچھا
خبر زور لی تم نے گھائل کی اپنے
زمیں بوجھ کیوں کر ہمارا اٹھاوے
فلک کو نہیں تاب محمل کی اپنے
اسے مردم دیدہ کیوں کر نہ سمجھے
سیاہی تو تو دیکھ ٹک تل کی اپنے
میاں مصحفی تجھ سے کیا مانگتا ہے
سدا تو بھلا سن لے سائل کی اپنے

٦۴٣

پوچھا[1] جو ہم نے اس سے کل تیرا نام کیا ہے
کہنے لگا تجھے کیا چل تجھ کو کام کیا ہے
جو ٹھوکروں کے مارے پامال ہو گئے ہیں
کوئی[2] پوچھے ان سے اس کی طرز خرام کیا ہے
مستغرق تصور کیا ہو رہا ہے اے دل!
ٹک سر اٹھا کے تو دیکھ بالائے بام کیا ہے
ہم نامہ دے چکے ہیں قاصد کو اپنے تو کہہ
جانِ بہ لب رسیدہ تیرا پیام کیا ہے

---

۱ - پوچھا جو میں نے اس سے صاحب کا نام ہے ، سرور
۲ - بروزن فع -

اُس نازنیں کی تصویر جو دیکھے ہے کہے ہے
اُس نیم رخ کے آگے ماہِ تمام کیا ہے
کہتا تھا توتو اے دل: میں ہو چکا ہوں تسکیں
پھر اضطراب سا یہ ہر صبح و شام کیا ہے
ہونا تھا **مصحفی** پر جو ہو چکا عزیزو
اب لاش[1] پر پھر اُس کی یہ ازدحام کیا ہے

۶۲۴

گالی سے لب شیریں کو بس تلخ نہ کیجے
جو گڑ دیے مرتا ہو اُسے زہر نہ دیجے
رستے میں جو مل جائے وہ بت ہم کو خدا کار
مسجد کی طرف جانے کا پھر نام نہ لیجے
جاے کہ گل ولالہ ہوں سب چاک گریباں
بیدادی ہے گر اپنے گریبان کو سیجے
کھانا کبھی اس غم کا نہ ہو ہم کو گوارا
اوپر سے جو خوں ناب جگر اُس کے نہ پیجے
آہن مرے گریہ سے ہوا آب ولیکن
اے **مصحفی** یہ سنگ‌دلاں بت نہ پسیجے

۶۲۵

نہا کر جب وہ اپنے سر کے بالوں کے تئیں جھاڑے
بجائے خار و خس موتی ہی رولے جو زمیں جھاڑے
تو اے نورِ نظر جس جا قدم اپنا رکھا چاہے
ہر اک خوش‌چشم واں جاروبِ مژگاں سے زمیں جھاڑے

---

۱ - نقش - پ

نمود سجدہ ہے منظور، خاک ایسی نماز اوپر
نہیں ممکن کہ زاہد جیتے جی گرد جبیں جھاڑے
یہ سب دامن درازاں بھول جائیں رقص کرنے کو
جو ہو کر دست افشاں عاشق اپنی آستیں جھاڑے
نظر آویں پڑے بھٹے سے سر پاؤں میں یاروں کے
ابھی دو دو پٹے کے ہاتھ اگر وہ نازنیں جھاڑے
کیا کر خاکروبی مصحفی ایسے کے تو در کی
کہ جس کے واسطے روح الامیں عرش بریں جھاڑے

٦۴٦

ہر اک نے نگاہوں سے مجھے ڈال دیا ہے
کیا میرے تئیں عشق نے اقبال دیا ہے
ترکیب تو دیکھ اُس کے خوش اسلوب بدن کی
جیسے کہ وہ سانچے سے ابھی ڈھال دیا ہے
میں ہوں وہ گنہہ گار کہ غیرت نے ابھی سے
ہاتھوں میں مرے نامۂ اعمال دیا ہے
ہنستے ہو تو اچھی ہی طرح مجھ پہ ہنسو نا
یوں منہ میں میاں کاہے کو رومال دیا ہے
ہر لحظہ گرفتار ہوں اک تازہ الم میں
یہ عشق کہ جی کو مرے جنجال دیا ہے
سو منتیں میں کیں ہیں جہاں بادِ صبا کی
تب زلف کا تیری کہیں اک بال دیا ہے
ہم بھی گہر اشک کی دولت سے غنی ہیں
گو چرخ نے اوروں کو زر و مال دیا ہے

رہتا ہے فقیروں کی طرح نت وہ پریشاں
اپنا جسے زلفوں نے تری جال دیا ہے
بندے ہیں تمھارے کوئی ہر اک کو خدا نے
یہ حسن یہ نقشہ یہ خط و خال دیا ہے
اے مصحفی اُس شوخ کی باتوں پہ نہ جانا
لاکھوں کو لگا اُس نے یوں ہی ٹال دیا ہے

۶۴۷

رات کے رہنے کا نہ ڈر کیجیے
ایک تو شب یاں بھی سحر کیجیے
لوگ کہیں گے تمھیں ہرجائی ہے
دل میں اک عالم کے نہ گھر کیجیے
دیکھتے ہو میری طرف کیا میاں
اپنی ہی صورت پہ نظر کیجیے
آ ہی لیا بے خبری نے ہمیں
کون ہے یاں کس کو خبر کیجیے
غیر کو جا دیتے ہو گھر میں اگر
میرے تئیں شہر بدر کیجیے
دیکھ نگاہیں تری کہتی ہے خلق
ایسی نگاہوں سے حذر کیجیے
پھر نہیں ملنا ترا مشکل یہاں
جان کا گر اپنی ضرر کیجیے
سنگ دل اے آہ! ہزاروں ہیں یاں
دل میں کسی کے تو اثر کیجیے

منزل ہستی میں بہت ہم رہے
مصحفی اب یاں سے سفر کیجیے

٦۴۸

دل سینے میں بے تاب ہے دل‌دار کدھر ہے
کوئی[1] مجھ کو بتا دو وہ مرا یار کدھر ہے

ہم کب کے چمن زار میں بے ہوش پڑے ہیں
معلوم نہیں گل کدھر اور خار کدھر ہے

اس گل کا پتا گر نہیں دیتے ہو تو یارو
اتنا تو بتا دو درِ گلزار کدھر ہے

دل چھیننے[2] والے کوئی گھر بیٹھ رہے ہیں
پوچھیں ہیں یہی رستہ[3] بازار کدھر ہے

دیکھا مجھے کل اس نے تو غیروں سے یہ بولا
لاؤ بھی شتابی مری تلوار کدھر ہے

یاں ہو رہا ہے سینہ مرا آگو ہی چھلنی
ڈھونڈے ہے کہاں تیر کو سوفار کدھر ہے

احوال نپٹ تنگ ہے بیمار کا تیرے
اس وقت تو اے آئنہ رخسار! کدھر ہے

شیریں سخناں سب ہی[4] شکر بیچیں ہیں لیکن
انصاف کرو جوشِ خریدار کدھر ہے

---

۱ - بروزن فع -

۲ - بیچنے : ل ۲۷

۳ - رستہ اور بازار دونوں فارسی لفظ ہیں ترکیب درست ہے - ذائق
(دیکھیے فرہنگ عمید)

۴ - سے : پ

برسوں نہ ملے اُس سے تو اُس شوخ نے ہم کو
پوچھا نہ کبھی مصحفیِ زار کدھر ہے

۶۴۹

کس طرح شامِ فراق اپنی سحر ہوتی ہے
دیکھیے آج کی شب کیوں کہ بسر ہوتی ہے
چشمِ بیمار کا کوئی اُس کے سبب مت پوچھو
خوبرو کے تئیں البتہ نظر ہوتی ہے
اُس کے کوچے میں کیے ہم نے بہت سے نالے
پر نہ پوچھا کبھی یہ دھوم کدھر ہوتی ہے
شیخ جی چھیڑو نہ بدمستوں کو، گھر کو جاؤ
بات یاں ورنہ ابھی نوعِ دگر ہوتی ہے
درمیاں سب کے ہے اور کچھ نہیں ہوتی معلوم
ہائے یارو کہیں ایسی بھی کمر ہوتی ہے
ایسا آسان نہیں معنیِ رنگیں کا تلاش
ایک اک بیت بصد خونِ جگر ہوتی ہے
شبِ ہجراں میں تری شمع نمط عاشق کی
آستیں دیدۂ نم ناک سے[1] تر ہوتی ہے
تو نے جو کچھ کہ کہا یار کہوں گا میں تمام
مصحفی اُس سے ملاقات اگر ہوتی ہے

۶۵۰

نہ چھو پیارے کہ تیری زلف کا ہر تار نازک ہے
تو کافر بل نہ دے اُس کو کہ یہ زنّار نازک ہے

---

۱ - ک : سرور

نہ ہو کیوں کر کوئی شاکی تری باریک مژگاں سے
چبھے ہے اس قدر ہی جس قدر یہ خار نازک ہے
گل و نسرین و سنبل ہیں سبھی نازک تر از نازک
نہ تنہا اس چمن کی نرگسِ بیمار نازک ہے
ترے چہرے کے ہنگامِ تماشا دل دھڑکتا ہے
نگاہیں سخت ہیں بے باک اور رخسار نازک ہے
نہیں تم ذبح کرسکتے ہو ہم کو یہ تو بتلاؤ
تمھارے ہاتھ ہی نازک ہیں یا تلوار نازک ہے
نزاکت عاشق و معشوق کی یکساں نہیں ہوتی
مری گفتار نازک ہے، تری رفتار نازک ہے
نہیں تشبیہ دے سکتے ہم اس کو رشتۂ جاں سے
ز بس اے مصحفی موے میانِ یار نازک ہے

٦٥١

ناتوانی سے تلاشِ سوختن میں مر گئے
شمع تک پہنچے نہ پروانے لگن میں مر گئے
ہر سخن اوپر تو کیوں کھینچے ہے اب تلوار کو
ہم تو میری جان تیرے اک سخن میں مر گئے
وقت خوش ان ہم صفیروں کا کہ ہنگامِ بہار
بے غمِ دام و قفس صحنِ چمن میں مر گئے
وہ جو جاں بر کف لیے پھرتے تھے کتنے تشنہ لب
آخر آخر حسرتِ چاہِ ذقن میں مر گئے
مصحفی عشقِ بتاں کا پوچھ مت کچھ ماجرا
ہم سے کتنے یار اس دیوانے پن میں مر گئے

٦٥٢

نہ باہر ہی اُسے آرام ہے ہرگز نہ گھر ٹھہرے
وہ طفلِ شوخ کیا معنی جو ٹک اک جائے پر ٹھہرے

صفائی میں ہیں تیرے لعلِ لب کے مشتری حیراں
کہے قیمت تو کوئی شب کہ جب اُس پر نظر ٹھہرے

جواب نامۂ عاشق کبھی حاصل نہ ہو اُس سے
اگر عمرِ ابد تک پاس اُس کے نامہ بر ٹھہرے

کہوں کیا اشک اپنے کی خوش آبی اور غلطانی
نہ دل، نے چشم، نے مژگاں کے اوپر یہ گہر ٹھہرے

میں مفلس ہو رہا ہوں دل کی بے تابی کے ہاتھوں سے
یہی بسمل ہے اب اکسیر گر ٹک آنچ پر ٹھہرے

زبس اے **مصحفی** تھا ہیچ عرصہ زندگانی کا
جہاں میں آن کر ہم یک دو ساعت جوں شرر ٹھہرے

٦٥٣

راہ میں جاتے دو چار اک تازہ آفت ہو گئی
پوچھتے کیا ہو کہ ہم پر کل قیامت ہو گئی

پیچھے پھر پھر دیکھتا جاتا ہوں اور بھاگوں ہوں میں
اپنے سایے سے بھی اب تو مجھ کو وحشت ہو گئی

ہائے روزِ حجِ اکبر بھی رہے غش ہی کے بیچ
ہم نہ چیتے[1] اور کعبے کی زیارت ہو گئی

۱- چیتنا : ھ - ہوشیار ہونا - متنبہ ہونا - ہوش میں آنا -
(نور اللغات ، جلد ۲ ، صفحہ ۵۲۵)

نوچ ڈالا اپنا چہرہ ہم نے ناخن سے تمام
منہ چھپاتے ہی ترے یاں اور ہی صورت ہو گئی

کیا رہا تھا مجھ میں پیارے تیرے ہنگام وداع
اک ذرا سی جان تھی سو وہ بھی رخصت ہو گئی

سر اٹھاؤں کیوں کہ زانو سے کہ اٹھتا ہی نہیں
کیا کروں زانو سے اس سر کو محبت ہو گئی

جب تلک بیٹھا تھا تو تھے اہل مجلس ہوش میں
تو ادھر اٹھ کر گیا یاں غش کی حالت ہو گئی

غیر کرتے ہی رہے ہیں تم سے ہر دم بات چیت
ہم بھی گر بولے تو ایسی کیا قیامت ہو گئی

گر دم آخر یہ حسرت جان دی میں نے تو کیا
ایک دم کی یہ بھی اے یارو ! اذیت ہو گئی

اس کو ہم اپنی طرف سے پھر نہیں کرتے ہیں ترک
جس سے ٹک اک بار بھی صاحب سلامت ہو گئی

شب جو داڑھیں[1] مار روئے ہم تو نقصاں کیا ہوا
بارے اس رونے سے دل کو تو فراغت ہو گئی

یوں رہے بیمار ہی نت لیک بعد از سال و ماہ
جوں ہی ٹک دیکھا تجھے اور ہم کو فرصت ہو گئی

۱۔ اصل متن میں ''داڑھیں مار روے'' ہے ۔ لیکن محاورہ موجودہ ''دہاڑیں مار کر رونا'' ہے ۔ کتابت کا اختلاف نہیں ہے بلکہ وزن بھی مختلف ہے 'دھاڑیں' 'فعلن' اور 'دہاڑیں' فعولن ۔ لیکن بہ جاے 'دھاڑیں' متن میں 'داڑھیں' سہو کاتب معلوم ہوتا ہے ۔ فائق

اک نگاہ لطف کو ہم نت ترستے ہی رہے
غیر سے سو بار آنکھوں میں اشارت ہو گئی

جانِ من تو تو توانا ہے تجھے کیا اس کا غم
گو یہ جانِ ناتواں بے تاب و طاقت ہو گئی

فصلِ گل سو بار آئی ہم نہ چھوٹے قید سے
ہم کو اس کنجِ قفس میں رہتے مدت ہو گئی

ہائے کعبہ سے پھرا اب تک نہ ہرگز **مصحفی**
اس کو واں کیا جانیے کس سے محبت ہو گئی

٦۵۲

لیتے ہی بوسہ ہو گئے بیزار کس لیے
تم کو کیا تھا اور بھلا یار کس لیے

فصلِ بہار آئی، گئی، اب قفس کے بیچ
پھڑکیں ہیں طائرانِ گرفتار کس لیے

زخمِ نخست ہی میں مرا ہو چکا ہے کام
اب دم بہ دم لگاتے ہو تلوار کس لیے

پیارے جو تم کو شوق نہیں تاک جھانک کا
پھر وا، رہیں ہیں رخنۂ دیوار کس لیے

آئینہ لے کے دیکھو ٹک اپنے جمال کو
صحبت کا شب کی کرتے ہو انکار کس لیے

کیا ایسی سخت جانی ہے، مر جاتے کیوں نہیں
تیرے مریض کھینچیں ہیں آزار کس لیے

نے سہر و نے وفا نہ محبت کا تجھ میں نام
کر تجھ سے دوستی، کوئی ہو خوار کس لیے

گزری سو گزری اپنے اوپر اس کے غم کے بیچ
کیجے کسی سے درد دل اظہار کس لیے
سو بار دھولیں کھا چکے مسجد میں شیخ جی
پھر باندھ باندھ آتے ہو دستار کس لیے
اس نے تو اپنے مکھڑے اوپر ڈال لی نقاب
پھر اب کھڑے ہیں طالبِ دیدار کس لیے
اے مصحفی ! جو یار تجھے پوچھتا نہیں
جاتا ہے دوڑ دوڑ تو ہر بار کس لیے

٦۵۵

خیال صید جو وہ عنبریں کمند کرے
تو حلقے حلقے میں لاکھوں ہی دل کو بند کرے
نفس بھی کھینچتے اب جی مرا دھڑکتا ہے
مباد ، آتشِ دل شعلہ پھر بلند کرے
ہے صرفہ تجھ کو اب اس میں کہ اے ملامت گو
تو ہم کو کچھ نہ کہے[1] وعظ و پند بند کرے
حدیثِ شکوہ میاں منہ پر آخر آتی ہے
کہاں تلک کوئی اپنی زباں کو بند کرے
تو آ کے بیٹھے دمِ نزع جس کی بالیں پر
وہ مر بھی جائے تو آنکھیں[2] نہ اپنی بند کرے
بغل میں جس کی کہ دل جیسا پکا پھوڑا ہو
پھر آہ آہ نہ کیوں کر وہ درد مند کرے

۱- ترک وعظ و پند کرے : پ
۲- آنکھیں کبھی نہ بند کرے : پ

ہمیں تو چاہ نہیں مصحفی کچھ اس دل کی
ہے نذر اُس کی یہ دل اس کو جو پسند کرے

٦۵٦

وہ جس دم ہاتھ اپنا قبضۂ خنجر پہ رکھتا ہے
تکلف بر طرف ، منت ہمارے سر پہ رکھتا ہے

ہوا تو دیدہ و دانستہ اے دل! زخمیِ مژگاں
کوئی بھی پاؤں نوک نیزہ یا نشتر پہ رکھتا ہے

تہِ ہر استخوانِ زار یوں سلگے ہے دل اپنا
کہ جیسے خار و خس لا کر کوئی اخگر پہ رکھتا ہے

اگر غیروں سے خلوت میں نہیں مشغول وہ پیارا
تو پھر کس واسطے دربان اپنے در پہ رکھتا ہے

بہ صد بے طاقتی ہوتا ہے مانا نقشِ قالیں سے
قدم بیمار تیرا جس گھڑی بستر پہ رکھتا ہے

بسانِ آئنہ صورت پرستی کام ہے کتنا
ولیکن صاحب معنی نظر جوہر پہ رکھتا ہے

یہ حالِ مصحفی ہے تجھ بن اب گریے کی شدت سے
کہ دن میں سیکڑوں رومال چشمِ تر پہ رکھتا ہے

٦۵۷

کیوں کہ مژگاں کو تری تیزیِ نشتر پہنچے
جس کی خوں ریزی کو تلوار نہ خنجر پہنچے

عشق کی منزلِ اول بھی بڑی منزل تھی
واں تلک پہنچے تو ہم یار پہ مر کر پہنچے

دیکھنا کم یہ کبھی کیجیو مت اے ساقی !
بزمِ عشاق ہے مے سب کو برابر پہنچے

اعتدال اس قد رعنا کا بیاں کیا کیجے
جس کی خوبی کو نہ سرو اور نہ صنوبر پہنچے

گردش چشم کبھی مشفق من ایدھر بھی
بارے اس دور میں اک ہم کو بھی ساغر پہنچے

جس گلی میں کہ فرشتے کے بھی پر جلتے ہیں
کب یہ ممکن ہے کہ واں اڑ کے کبوتر پہنچے

مصحفی میں ہوں زخود رفتہ تو وہ بے پروا
خبر احوال کی میرے اسے کیوں کر پہنچے

٦٥٨

جس گلی میں نہ صبا اور نہ کبوتر پہنچے
مشتِ خاک اپنی کی طاقت ہے کہ اڑ کر پہنچے

یار ہم بادہ نہ ہو اپنا تو کر کے اسے یاد
روئیے اتنا کہ خوں تا لبِ ساغر پہنچے

آ گیا ہاتھ میں گر اب کے گریباں اپنا
چاک وہ دیجے کہ تا دامنِ محشر پہنچے

میں تڑپنے لگوں جب کھا کے ترا تیر اے کاش
تو شتابی سے لیے ہاتھ میں خنجر پہنچے

سینہ بے طرح میں کوٹوں ہوں غمِ دوری سے
مجھ کو یہ ڈر ہے کہیں صدمہ نہ دل پر پہنچے

اس کی مژگاں نے کیا دل کا مرے کام تمام
کیا جیے جس کے رگ جاں پہ نشتر پہنچے

مصحفی اتنا میں رویا کہ شب ہجراں میں
اشک آنکھوں سے گریباں تئیں بہ کر پہنچے

٦۵۹

ہر آن میں گالی دے ہر اک بات میں جھنجلاے
اک یار ملا ہم کو سو اس وضع کا اے واے

کیا وجہ بتاؤں تمھیں اس زردیِ رخ کی
رنگ اس کا یہی ہو جو کوئی خون جگر کھاے

گر آبِ رواں سرو قدِ یار کو دیکھے
جوں دیدۂ آئینہ بنے محوِ سرا پاے

کام اس سے پڑا مجھ کو جو تصویر کی مانند
میری ہی سنے گا ہے نہ کچھ اپنی ہی فرماے

تلواریں ہی آتی ہیں نظر چاروں طرف سے
جا کر صف مژگاں میں یہ دل کیوں کہ نہ گھبراے

اے مصحفی جب چو[1] ہی پڑا اشک کی مانند
فریاد مرے دل سے یہی نکلی کہ دل ہاے

٦٦٠

بوند اشک کی اک تازہ نت[2] آن نکلتی ہے
ان آنکھوں سے موتی کی اب کان[3] نکلتی ہے

از بسکہ کبھی اُس نے یاں تیر لگائے ہیں
دل ڈھونڈوں تو سینے سے پیکان نکلتی ہے

تو نزع میں آ جس کو دیدار دکھاوے ہے
پھر آنکھوں سے جان اُس کی آسان نکلتی ہے

---

۱ - چونا (ہ) ٹپکنا
۲ - جو : ل ۱ - ۲
۳ - کہاں : ل ۱ - ۲

کیا بیٹھنا ، کیا اٹھنا ، کیا بولنا ،کیا ہنسنا
ہر آن میں کافر کی اک آن نکلتی ہے
جب گھر سے وہ نکلے ہے بن ٹھن کے کبھی باہر
اس وقت تو پھر اور ہی کچھ شان نکلتی ہے
اے مصحفی ہجراں بھی اک طرفہ اذیّت ہے
نے یار ہی ملتا ہے نے جان نکلتی

٦٦١

جلوہ گر یار کا قامت ہے، خدا خیر کرے
حق میں عاشق کے قیامت ہے، خدا خیر کرے
دل مرا اور ترا آج جو مل بیٹھا ہے
شیشہ و سنگ کی صحبت ہے، خدا خیر کرے
صاف بگڑا ہوا آتا ہے مرا آئینہ رو
آج کچھ اور ہی صورت ہے خدا خیر کرے
عشق میں اس کے جو بدنام مجھے کرتے ہیں
یہ بری طرح کی تہمت ہے، خدا خیر کرے
نہیں منھ موڑتی زنہار وہ تیغ ابرو
مصحفی سر پہ بد آفت ہے، خدا خیر کرے

٦٦٢

گر جدا ٹک بھی یار ہوتا ہے
دل بہت بے قرار ہوتا ہے
تلخ و شیریں سے کچھ جہاں کے نہ پوچھ
ہم کو سب کچھ گوار ہوتا ہے

دل کو پاؤں تلے کھندلنا[1] واہ
کیوں جی ایسا ہی پیار ہوتا ہے

عشق سے ہجر میں گلہ کیا ہے
مے کا آخر خمار ہوتا ہے

کاش ہو خاک اس گلی کی ، یہ دل
جس میں تیرا گذار ہوتا ہے

لیجو اے نا خدا کہ یہ دل بھی
اب کے کھیوے[2] میں پار ہوتا ہے

ق

مصحفی اب وہ آن نکلے گا
اس کا نت یاں گذار ہوتا ہے

ٹھہر تو ، ٹک تو دم لے دیوانے
اتنا کیوں بے قرار ہوتا ہے

۶۶۳

گل کترے نہ بلبل مری فریاد کے آگے
سر سبز ہو شاگرد کب استاد کے آگے

دیر اے ملک الموت کہ اس کوہ کنی کا
ہے کام بہت سا ابھی فرہاد کے آگے

گلشن سے اڑا کر کے صبا ، میرے پر و بال
مر جاؤں تو ، لے جائیو صیاد کے آگے

نخچیر سے تا صید حرم فرق نہ سمجھے
آ جائے جو کچھ اس ستم ایجاد کے آگے

---

۱ - کھندلنا (ہ) پیروں سے روندنا
۲ - کھینا (ہ) پار ہونا

گو یار نے تلخ اس کو کہا لیک تو قاصد
یہ حرف نہ کہیو دلِ ناشاد کے آگے

تقصیر اگر کی ہے توِ اس شوخ کی ، یارو
کیوں مجھ کو لیے جاتے ہو جلاد کے آگے

نے ذکر ہے ، نے شغل ہے ، نے یادِ خدا ہے
سب بھول گئے ہم تو تیری یاد کے آگے

بد مصحفی کو شیخ جی پیچھو ہی کہو تھے
اب بولتے تم کیوں نہیں داماد کے آگے

٦٦۴

ہے تجھ پہ تو زور ہی آن ، صدقے
صدقے ترے میری جان صدقے

کیا[1] چیز جو کیجے جان صدقے
تجھ پر سے کروں جہان صدقے

مژگاں پہ تری ، خدنگ قرباں
ابرو پہ تری ، کمان صدقے

وہ ماہ ہے تو کہ جس کے اوپر
ہوتا ہے نت آسمان صدقے

رخسار ترے وہ گل ہیں جن پر
کیجے گل و ارغوان صدقے

اے مصحفی تو نے ریختے میں
پائی ہے عجب زبان ، صدقے

---

۱ - نسخہ پٹنہ میں نہیں

٦٦٥

فراغت میں ، بتاں کی صورت دل خواہ یاد آوے
پڑے جب کچھ مصیبت تب ہمیں اللہ یاد آوے

بیاباں در بیاباں ہر طرف آوارہ پھرتے ہیں
نہیں بھولے ہوے ایسے کہ ہم کو راہ یاد آوے

حقیقت درد مند ایسے کی سن کر کیا کوئی خوش ہو
کہ جس کو بات کہتے ہر سخن پر آہ یاد آوے

سنا کئیں[1] ذکر یوسف کا تو میرے دل میں تو گذرا
سخن جیسے بہ تقریب سخن ناگاہ یاد آوے

نہ ہسنا بولنا ، نے اس طرف ہی کا نظر کرنا
بھلا کس بات پر ہم کو تمھاری چاہ یاد آوے

ہم اٹھ کر خواب سے تیری گلی کا قصد کرتے ہیں
گدا کو صبح دم جوں بارگاہ شاہ یاد آوے

اسی کے نور سے تھا کلبۂ احزاں مرا روشن
شب غم کیوں نہ مجھ کو ہر گھڑی وہ ماہ یاد آوے

نت اس کی بزم میں اے **مصحفی** ہے ذکر غیروں کا
یہ کیا معنی جو گاہے بندۂ درگاہ یاد آوے

٦٦٦

ناچار ہو دین و دل اس شوخ کو دے گذرے
جو ہم پہ پڑی آ کر اس عشق میں کھے گذرے

ہم جن کے سرِ رہ میں اک عمر سے بیٹھے ہیں
افسوس کہ اک دن بھی ایدھر سے نہ وے گذرے

۱- 'کہیں' کو 'کئیں' باندھا ہے - 'کئیں' بروزن فاع پڑھا جاے - فائق

دی اُس نے اگر ہم کو دشنام بہانے دل
ہم مثل غرض منداں ووں ہی اسے لے[1] گذرے

ہر وقت جواب ہم کو تم گالیاں دیتے ہو
نہیں[2] ہم بھی میاں صاحب ایسے تو گئے گذرے

رفتار پہ خوباں کی اے **مصحفی** مت جانا
پامال کیا عالم جس راہ سے یے گذرے

٦٦٧

ہے ماہ کہ آفتاب کیا ہے
دیکھو تو تہِ نقاب کیا ہے

میں نے تجھے تو نے مجھ کو دیکھا
اب مجھ سے تجھے حجاب کیا ہے

آئے ہو تو کوئی دم تو بیٹھو
اے قبلہ، یہ اضطراب کیا ہے

اس بن ہمیں جاگتے ہی گذری
جانا بھی نہ یہ کہ خواب کیا ہے

مجھ کو بھی گنے وہ عاشقوں میں
اس بات کا سو حساب کیا ہے

سیپارۂ دل کو دیکھ اس نے
پوچھا بھی نہ یہ کتاب کیا ہے

اس مے کدۂ جہاں میں یارو
مجھ سا بھی کوئی خراب کیا ہے

۱- دے : پ -
۲- ’نئیں‘ پڑھا جاے - بروزن فع - فائق

قسمت میں ہماری **مصحفی** ہائے
کیا جانے ثواب عذاب کیا ہے

٦٦٨

آئے ہو تو یہ حجاب کیا ہے
منہ کھول بھی دو نقاب کیا ہے
سینے میں ٹھہرتا ہی نہیں دل
یارب اسے اضطراب کیا ہے
کل تیغ نکال مجھ سے بولا
تو دیکھ تو اس کی آب کیا ہے
معلوم نہیں کہ اپنا دیواں
ہے مرثیہ یا کتاب کیا ہے
جو مر گئے مارے لطف ہی کے
پھر ان پہ میاں عتاب کیا ہے
اوروں سے تو ہے یہ بے حجابی
مجھ سے ہی تجھے حجاب کیا ہے
اے **مصحفی** اٹھ یہ دھوپ آئی
اتنا بھی دوانے خواب کیا ہے

٦٦٩

مانی ان ابرووں کی تصویر کھینچتا ہے
خورشید پر دو دستی شمشیر کھینچتا ہے
دل زلف کی طرف کو کیوں کر کھنچا نہ جاوے
کوئی اس طرف سے اس کی زنجیر کھینچتا ہے
رہنے دے تاکہ دل کو ہو اک ذرا تسلی
پہلو سے میرے ظالم کیوں تیر کھینچتا ہے

۵۳۵

ہے یہ بھی بس کہ گا ہے یہ دل بتاں کے غم میں
دو چار نالے ہو کر دل‌گیر کھینچتا ہے
کل مصحفی کہاں اور تیمارداری اس کی
تا صبح اپنے در پر تا خیر کھینچتا ہے

۶۷۰

خط آیا وہ ادا نہ وے اطوار رہ گئے
عشاق تھے ہزار سو دو چار رہ گئے
صحبت پہ گل کی شور نہ کر اتنا عندلیب
اپنے بھی پاس کتنے طرح دار رہ گئے
ناگہ جو اس کے چہرے سے پردہ الٹ گیا
جانے سے راہ مردمِ بازار رہ گئے
تیری گلی وہ جا ہے، جہاں آ کے رات کو
اکثر لباسِ فقر میں سردار رہ گئے
دستِ جنوں سے چاک فقط جیب ہی نہیں
دستار کے بھی دیکھو تو دس تار رہ گئے
سودا ہمارا یار سے[1] نظروں میں ہوگیا
منہ دیکھتے ہی کتنے خریدار رہ گئے
ہم گذرے اس گلی میں تو بیمِ رقیب سے
آہستہ ٹک گلی میں ہی کھنکار رہ گئے
قاتل سے آرزو تھی کئی زخم کی ہمیں
پر ہم تو کھا کے ایک ہی تلوار رہ گئے

۱۔ کی : پ ۔

صیاد نے خبر ہی نہ لی ، زیرِ دام ہی
آخر تڑپ تڑپ کے گرفتار رہ گئے

بلبل کا کچھ نشاں نہ رہا باغ میں مگر
دو چار آشیاں کے خس و خار رہ گئے

بخشا سبھوں کو لب نے ترے شربتِ صفا
یاروں میں اپنے ایک ہمیں یار رہ گئے

اوروں کو حکمِ دخل ہوا تیری بزم میں
ہم سر پٹکتے ہی پسِ دیوار رہ گئے

من بعد کیا ہے فائدہ جینے کا **مصحفی**
نے وہ جہاں کی وضع نہ وہ یار رہ گئے

۶۷۱

قد ، قیام ، اور خرام آفت ہے
واں جو کچھ ہے ، تمام آفت ہے

دل دکھا ہی کرے ہے سینے میں
یاں یہی صبح و شام آفت ہے

ہے غضب اک تو قد کا خم کرنا
تس پہ طرزِ سلام آفت ہے

دل کو سمجھائیے کہاں تک ہائے
اشتیاقِ مدام آفت ہے

نہ پیو کوئی[1] زیادہ بادۂ عشق
اس کا تو اک ہی جام آفت ہے

کہیے کیا آفتاب تو اس کو
کوئی بالائے بام آفت ہے

۱- بروزن فع -

آفتِ عشق ہے وہ دنیا میں
مصحفی جس کا نام آفت ہے

٦٧٢

جا کر کہے یہ صرف مرے یار سے کوئی
سر دے دے مارے ہے در و دیوار سے کوئی

پہنچے خبر بہار کی اس کو بھی اے صبا !
ہووے جو طائرانِ گرفتار سے کوئی

تیکھے تو ہو، یہ[1] سچ کہو اس وقت کیا کرو
تم کو گلے لگا لے اگر پیار سے کوئی

یارو ، خدا کے واسطے جینے بھی دو کہیں
جاؤ ، نہ بولو مجھ سے دل افگار سے کوئی

دیکھیں تو ہم بھی تم کو ، لگاؤ نہ مہرباں
بس ڈر گیا اس آپ کی تلوار سے کوئی

میں تم سے پوچھتا ہوں بھلا اس کا کیا علاج
پھر جائے وعدہ کر کے جو اقرار سے کوئی

دامن تمام ہو گیا افشاں ، کہاں تلک
پونچھے لہو کو دیدۂ خوں‌بار سے کوئی

کیوں نام لیں کسی کا پہ یہ تو کہیں گے ہم
کیا ہو جو بولے ہم سے گنہگار سے کوئی

شمع و شراب و شاہد و ساقی ہے روبرو
کیا چاہے اور طالعِ بیدار سے کوئی

---

۱ - پہ ؟ (فائق)

پیچھے گلہ نہ کیجیو پیارے ، تو منھ پہ کہہ
بوسہ لیا ہو گر ترے رخسار سے کوئی

تلوار جب چلے ہے تو پھر وہ کرے ہے قتل
جیتا اگر بچے تری رفتار سے کوئی

کیوں تو نے اس کو کر دیا آزردہ مصحفی
ناداں بگاڑتا ہے طرح‌دار سے کوئی ؟

٦٧٣

جب تو بھی تکے میری طرح راہ کسی کی
معلوم ہو تب تجھ کو میاں چاہ کسی کی

جوں چاہیے، صحبت کی ہوس دل سے نہ نکلی
یا رب نہ شب وصل ہو کوتاہ کسی کی

یہ عشق برا ہوتا ہے معلوم کرو گے
گاہے جو اثر کر بھی گئی آہ کسی کی

نامے کو مرے پڑھ کے لگا یار یہ کہنے
قاصد یہ حقیقت تو ہے جاں‌کاہ کسی کی

اے آنکھ ! مری شکل کا حیران رہا ہے
کیا دیکھی نہیں صورتِ دل خواہ کسی کی

جوں آئنہ وہ غم‌زدہ رہ جاتا ہے حیراں
جب اس پہ نظر پڑتی ہے ناگاہ کسی کی

از بس کہ تو پیارا ہے مجھے تیرے سوا یار
سوگند میں کھاتا نہیں واللہ کسی کی

اے مصحفی ! تربت کا مری نام نہ لینا
گر پوچھے ، تو کہیو کہ ہے درگاہ کسی کی

٦٧٤

وے جو ہم لوگوں سے کرتے تھے محبت مر گئے
جی کے دشمن رہ گئے ، اہلِ مروت مر گئے

جوں ہی کی اس خونیِ عالم نے آ کر اک نگاہ
وے جو جی اٹھے تھے ، پھر روزِ قیامت مر گئے

جان کو ہم اپنی کیا روئیں کہ اس کوچے کے بیچ
ہم سے کتنے کھینچ کر رنج و اذیت مر گئے

نعش پر زاہد کی خایا جائے ہے بہرِ نماز
ایسے بھڑوے کتنے یاں کھلا کے حضرت مر گئے

تو جو جاتا ہے وہیں نت دوڑ دوڑ اے **مصحفی** !
اور کیا دنیا کے سارے خوب صورت مر گئے ؟

٦٧٥

بیٹھ کر وہ جہاں سے اٹھتا ہے
ایک فتنہ وہاں سے اٹھتا ہے

اس کو جا بیٹھنا ، جہاں ہوں وے
کب یہ دل دلبراں سے اٹھتا ہے

نالہ کرتی ہے جس گھڑی بلبل
شعلہ اک آشیاں سے اٹھتا ہے

منھ کو مت کھول ، ورنہ عالم کے
پردہ رازِ نہاں سے اٹھتا ہے

بیٹھتا ہے وہ جنگ‌جو جس جا
لڑ کے آخر وہاں سے اٹھتا ہے

شورِ محشر کہیں ہیں جس کے تئیں
میرے شور و فغاں سے اٹھتا ہے

کشتۂ عشق یوں نہیں ٹلتا
مر کے کوے بتاں سے اٹھتا ہے
جو کہ پتھر سا جم کے بیٹھے ہے
کب ترے آستاں سے اٹھتا ہے
مصحفی مت بہت رقیب کو چھیڑ
وہ کوئی درمیاں سے اٹھتا ہے ؟

۶۷۶

اہلِ دل گر جہاں سے اٹھتا ہے
اک جہاں جسم و جاں سے اٹھتا ہے
چلو اے ہمرہو ! غنیمت ہے
جو قدم اس جہاں سے اٹھتا ہے
جمع رکھتے نہیں ، نہیں معلوم
خرچ اپنا کہاں سے اٹھتا ہے
گر نقاب اس کے منھ سے اٹھی نہیں
شور کیوں کارواں سے اٹھتا ہے
واے بےطاقتی و بےصبری
پردہ جب درمیاں سے اٹھتا ہے
پھر وہیں گر پڑے ہے پروانہ
گر ٹک اک شمع داں سے اٹھتا ہے
قصۂ مصحفی سنا کر یار
عشق اس داستاں سے اٹھتا ہے

۶۷۷

تاب کس کی ہے کہ بے پردہ ترا منھ دیکھے
غش کرےووں ہی اگر تیرا خدا منھ دیکھے

روے ہم سے ہوئی ہے ایسی ہی خجلت حاصل
کیا کسی کا کوئی پھر روزِ جزا منہ دیکھے
کیا ستم ہے کہ تو آئینے کو رو دے ظالم
اور گنہگار سا دل، دور کھڑا منہ دیکھے
نہ رہے آپ میں پھر ماہِ شبِ چاردہم
ٹک دوپٹے سے اگر تیراَ کھلاَ منہ دیکھے

ق

ایک نے اس سے کہا مصحفی مرتا ہے میاں
ہووے کیا اس کا جو تو جا کے ذرا منہ دیکھے
لگا کہنے کہ ہو آئنہ بھی جس سے بیزار
ایسے بدشکل کا اپنی تو بلا منہ دیکھے

۶۷۸

پرواہ تجھے کب ہے میاں جان کسی کی
گو تجھ پہ میاں، جان ہو قربان کسی کی
دل سخت مشوّش ہے مرا، رات سے شاید
دیکھی ہے کہیں زلفِ پریشان کسی کی
معلوم نہیں کیا غرض اب آئی ہے درپیش
ہے کب سے زباں اپنی ثنا خوان کسی کی
سمجھاتے ہیں تجھ کو ہی میاں تیرے طرف دار
تو ہم سے نہ اتنا بھی بگڑ، مان کسی کی
سو بار گئے، کچھ نہ ہوا نامہ بروں سے
اب آپ ہی قاصد ہو مگر جان کسی کی
بسمل تو تڑپتا تو ہے پر دیکھیو زنہار
لوہو میں نہ بھر جا زہِ دامان کسی کی

کیا مجھ کو دہن سے ترے واشد کی توقع
مشکل نہ ہوئی تجھ سے تو آسان کسی کی

گر پھر گیا میں اس سے تو کیا اس کا عجب ہے
تا چند اطاعت کرے انسان کسی کی

گاہے جو قدم رنجہ کیا خاک پہ میری
اس بات سے کچھ گھٹ نہ گئی شان کسی کی

اس چہرے میں کچھ اور ہی صورت کی صفا ہے
کس طرح نہ ہو آرسی حیران کسی کی

ہمدم تو نہ کر میرے اوپر عشق کی تہمت
کچھ عقل بھی ہے، شکل تو پہچان کسی کی

اے مصحفی! یہ شعر و سخن جائے گا سب بھول
گر کھب گئی نظروں میں تری آن کسی کی

٦٧٩

ہیں یہاں داغِ جگر زخم نمایاں کے تلے
جس طرح لالہ کہیں ہو گلِ خنداں کے تلے

آشیاں بندی کی تکلیف نہ دے ہم کو ہوس
گر رہیں گے کہیں دیوارِ گلستاں کے تلے

دیکھ پاوے جو ترے چاہِ ذقن کو یوسف
ہاتھ حیرت سے رکھے اپنا زنخداں کے تلے

ہیں دو عارض ترے وے گل کہ بہ صد شادابی
تازہ رہتے ہیں سدا سایۂ مژگاں کے تلے

یار پہلو پہ مرے ہاتھ سمجھ کر رکھیو
دل سے آتش ہے دبی سینۂ سوزاں کے تلے

ہائے بوسہ نہ لیا ہم نے کبھی اس لب سے
نت رہا یاں لبِ افسوس ہی دنداں کے تلے

ہم سے آوارہ کہاں ، سایۂ دیوار کہاں
یہ بھی بس ہے کہ کبھی بیٹھیں مغیلاں کے تلے

سر بہ سر چشمۂ خورشید ہے یا آبِ حیات
گر نظر سیر کرے زلفِ پریشاں کے تلے

مصحفی اس سے بھی رنگیں غزل اک اور لکھی
رکھ دیا تازہ گلستاں کو گلستاں کے تلے

٦٨٠

دل تڑپتا ہے مرا سینے میں پیکاں کے تلے
نگہِ شرم ہے تو بھی تری مژگاں کے تلے

مر بھی جاؤں جو میں پیارے تو بلا سے تیری
تو نہ رکھیو لبِ نازک کبھی دندان کے تلے

گل بدن[۱] کا نہیں پاجامہ اگر کیجیے غور
سیرِ گلزارِ ارم ہے ترے داماں کے تلے

خندۂ زخمِ جگر گل کی طرح کرتا ہے
چاک سینے کا مرے چاکِ گریباں کے تلے

تجھ سے اک داغ کا اخفا نہ ہوا اے لالہ!
یاں ہیں سو داغ چھپے سینۂ سوزاں کے تلے

سیرِ گلزارِ شہادت ہو مبارک اس کو
رکھ دیا جس نے گلا خنجرِ برّاں کے تلے

---

۱ - کپڑے کی ایک قسم -

رنگ یاقوت کی مانند پڑا جھمکے ہے
رنگ لب کا ترے رنگِ مسی و پان کے تلے

مصحفی رو رو میں اس کُو میں بہائے نالے
نہریں جس طرح بہیں جنتِ رضواں کے تلے

٦٨١

زلفوں کا بکھرنا اک تو بلا ، عارض کی جھلک پھر ویسی ہی
آنکھوں کا مٹکنا ہوش ربا ، ہر ایک پلک پھر ویسی ہی
وہ شوخ جو گذرے مثلِ صبا ، تو بھڑکے نہ کیوں کر آتشِ دل
اک طور کی اس کی جنبشِ پا ، دامن کی جھٹک پھر ویسی ہی
کوئی کیوں نہ گریباں چاک کرے اب دیکھ کے چوب کو آس بت کی
پنڈے کا جھلکنا ہائے خدا ، چولی کی مسک پھر ویسی ہی
دل کیوں نہ کرے سینے میں تپش، جب یار کی ہو یہ راہ و روش
رفتار میں اک البیلی ادا ، اور قد کی لچک پھر ویسی ہی
ہم کیوں نہ کفِ افسوس ملیں ، جب وے ہی ترا پابوس کریں
دامن سے زیادہ بندِ قبا ، زلفوں کی لٹک پھر ویسی ہی
وہ ماہ چھپایا تو نے کہاں ، ہے جس سے جگر پر داغ مرے
صورت تو دکھا دے مجھ کو ذرا جلدی سے فلک پھر ویسی ہی
اے مصحفی میرے حال پر اب کیوں کر نہ کوئی افسوس کرے
بے ساختہ دل بےتاب ہوا ، آنسو کی ڈھلک پھر ویسی ہی

٦٨٢

جسے تصویر دکھلائی ہے تیری
اسے کیا وضع خوش آئی ہے تیری

نہ کر اس سے دلا چھپ چھپ کے باتیں
کہ ان باتوں میں رسوائی ہے تیری

ہمارا غنچۂ دل کھل گیا ہے
صبا جب بوے خوش لائی ہے تیری

جو صید آیا سرِ تیر اس کے بولا
تجھے شاید اجل لائی ہے تیری

حنا کے ساتھ دل[1] خوں ہو گیا ہے
یہ کس نے مٹھی بندھوائی ہے تیری

نہیں نظروں تلے ہرگز ٹھہرتے
جو صورت دل میں ٹھہرائی ہے تیری

کوئی کیوں کر جیے گا دیکھ تجھ کو
بلاے جاں یہ زیبائی ہے تیری

ق

کہا میں رات اس سے ، ایک بوسہ
جو چھپ کر دے تو دانائی ہے تیری

خفا ہو کر لگا مجھ سے یہ کہنے
اے کم بختی کیوں آئی ہے تیری

نہ لے اے **مصحفی** ! تو صبر کا نام
کہاں اتنی توانائی ہے تیری

٦٨٣

باغ میں جا کے وہ جب بندِ قبا کھولے ہے
ہو کے محظوظ گل و'اے وقت توخوش' بولے ہے

سر پہ میرے ہی لگاتا ہے فلک آخرکار
تیغِ بیداد کو جب ہاتھ میں لے تولے ہے

---

۱ - ہی : پ

کیوں کہ بچیے کہ نہنگِ فلک مردم خوار
کھول کر منھ کبھی اِس کو کبھی اُس کو لے ہے
جب کہ آغوش میں لیتی ہے تجھے میری نگاہ
پہلے سو بار میاں صدقے ترے ہو لے ہے
گھول گھول اس کی جدائی میں پیا زہر میں لیک
کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ تو کیا گھولے ہے
جان و دل دونوں ہیں حاضر ، یہ پسند اس کی ہے
مصحفی بول نہ ، لینے دے اسے ، جو لے ہے

۶۸۴

غزل سرائی میں گر ، وا کروں زباں اپنی
تو جاوے مرغِ چمن بھول داستاں اپنی
یہ دل تو چیز ہے کیا بلکہ تم اگر چاہو
تو میری جان ، تصدق ہے تم پہ جاں اپنی
ستارے شب کو نکلتے نہیں ، جو سچ پوچھو
ہمیں دکھاتا ہے آنکھیں یہ آسماں اپنی
یہ باتیں خوب نہیں ، منھ پہ گالیاں دینی
زباں سنبھالے ہی ٹک رکھیو ، مہرباں اپنی
برنگِ آئنہ اس رنگ‌باز[۱] عالم میں
ہمیشہ تختہ ہی رہتی ہے کچھ دکاں اپنی
بشرط اس کو اگر معرکے میں رکھ دیجے
کھنچے نہ ہاتھ سے رستم کے بھی کماں اپنی

---

۱ ۔ زنگبار ؟ ۔ فائق

میں جب کہ گھر سے نکل بیٹھتا ہوں ٹک باہر
تو لے چلے ہے وہی کہنہ داستاں اپنی
خدا کے واسطے اے **مصحفی**! کہیں چپ رہ
بہت بھی بک نہ، طبیعت ہے ناتواں اپنی

٦٨٥

چھاتی[1] پہ لٹکتی نہیں زنجیر طلا کی
چاندی کے ورق پر ہے یہ تحریر طلا کی
افشانِ طلا سے یہ تمھارا خمِ ابرو
آتا ہے نظر جیسے کہ شمشیر طلا کی
جو چمپئی حسن اس کے کو دیکھے ہے، کہے ہے
بت خانے سے آئی ہے یہ تصویر طلا کی
جنت کی طمع کیوں نہ کرے[2] شیخ کہ واں ہے
چاندی کے محل یا کہ ہے تعمیر طلا کی
ضعفِ جگر و دل ہو جسے غم سے بتاں کے
ہووے نہ طلا کھائے سے تاثیر طلا کی
جاتی ہے تپِ دل کوئی کافور ملے سے
احباب عبث کرتے ہیں تدبیر طلا کی
وہ سوختہ ہوں میں کہ مری خاک کو لے کر
گر طرح کریں تو ہے وہ اکسیر طلا کی
جب آئنہ دیکھے ہے تو کندن سا ترا رنگ
آئینے کو کر دیوے ہے تصویر طلا کی

---

۱ - سینے: سرور -
۲ - کروں: پ

ہم خانہ بدوشوں کو طلا گر نہیں ملتا
کوتاہیِ قسمت ہے نہ تقصیر طلا کی
تسخیر کوئی پہنچے ہے اس کو نہ عزیمت
اے مصحفی ! جو ہوتی ہے تسخیر طلا کی

۶۸۶

بزم سے اٹھے جو ہم ، بے کل گئے
نے کے چٹکی رات وے دل مل گئے
آہ بھی منھ سے نہ نکلی ، گرچہ یاں
عاشقوں کے سر پہ آرے چل گئے
خاک پر میری وہ آیا لے کے تیغ
جب لحد میں استخواں بھی گل گئے
دختر رز ! تو تو کس گنتی میں ہے
یاں پریزادوں کے جوبن ڈھل گئے
تھے جو انگارے سے گل اس باغ میں
دیکھ اس رنگِ کفک کو جل گئے
معرکے میں عشق کے اے مصحفی !
سامنے سے میرے رستم ٹل گئے

۶۸۷

جس دم کہ آنکھ میری اس شوخ سے لڑی ہے
کافر نگاہ اس کی بجلی سی آ پڑی ہے
آ گتے ہیں گل چمن سے آلودۂ شہادت
کس کی لہو بھری لاش اس خاک میں گڑی ہے
کشتہ ہوں کس نگہ کا جو بہرِ پاسبانی
لوحِ مزار اب تک سر پر مرے کھڑی ہے

لختِ جگر سے ازبس پایا ہے رنگ اس نے
مدِّ نگاہ اپنے پھولوں کی سی چھڑی ہے
بیمار کا تمہارے کل دم الٹ گیا تھا
کہتے ہیں آج اس پر پھر اب وہی گھڑی ہے
تیری نزاکتوں کو پہنچے ہے کب وہ لڑکے
بوٹے سے قد سے تیرے گو شاخِ گل بڑی ہے
اے **مصحفی** وہ اتنا خوش رو نہیں ہے اس پر
کیا جانے آنکھ تیری کس وضع سے پڑی ہے

٦٨٨

اے دل تو نہ بھڑ اس سے کہ تیغ اس کی ہے کٹّی
باندھے گا بھلا کون ترے زخم کی پٹّی
رنگیں نہیں ناخن ترے پاؤں کی حنا سے
پابوس کو آئی ہیں ترے بیربہٹّی
اس کوچے سے ظالم تو مجھے لے تو چلا ہے
اے عشق! کہیں خوار نہ کیجو مری مٹّی
لے جاتے ہو دل مجھ سے تو پھر مانگو ہو جان کو
یہ زور لگائی ہے غرض آپ نے چٹّی[1]
اس سینۂ صد چاک میں داغوں کا تماشا
آ دیکھ کہ ہے یہ بھی چراغاں کی ٹٹّی
اے پیر زن ایسی تری کیا عقل گئی ہے
یوسف کی بہا میں بھی کوئی دیوے ہے اٹّی[2]

---

۱ - چٹّی : تاوان -
۲ - اٹّی : (ہ) سوت کی لچھی -

لازم ہے مجھے مصحفی وصف اپنے سخن کا
کہتا نہیں ہرگز کوئی چھاچھ اپنی کو کھٹی

۶۸۹

رہے جو قبضۂ شمشیرِ کیں پہ ہاتھ دھرے
مرے سلام کو کب وہ جبیں پہ ہاتھ دھرے
کبھی جو آئے نظر سینکنے کو ہم کم بخت
تو اس نے ضد سے رخِ آتشیں پہ ہاتھ دھرے
خدا کے واسطے ہمدم ہمیں نہ چھیڑ اِس وقت
کہ بیٹھے ہیں دلِ اندوہ‌گیں پہ ہاتھ دھرے
نہ دی خبر مجھے اس نے بھی زلف کی گرچہ
میں بارہا قدمِ شانہ بیں پہ ہاتھ دھرے
یہ کس کا غم ہے کہ[1] اس انجمن میں چھوٹے بڑے
ملول بیٹھے ہیں سارے، جبیں پہ ہاتھ دھرے
پڑا میں تپ میں جلوں یاں، ہزار حیف وہاں[2]
طبیب اُس کے تنِ نازنیں پہ ہاتھ دھرے
چل اس طرح کہ نہ اے مصحفی! لگے ٹھوکر
پڑے ہیں وے جو سرہانے زمیں پہ ہاتھ دھرے

۶۹۰

خنجر تلے اے دل! نہ تڑپ اتنا بھی، دم لے
کیا کرتا ہے، قاتل کا کہیں ہاتھ تو تھم لے

---

۱ - جو: پ
۲- کہ واں : پ

کب چشمِ خماریں کا ترے وصف ادا ہو
لکھے نہ اگر ہاتھ میں نرگس[1] کی قلم[2] لے

ان ماتمیوں کی بھی تجھے خیر و خبر ہے
کوچے سے ترے جو گئے نالوں کے علم لے

جو اشک کہ گرتا ہے مری آنکھوں سے، مجھ کو
کہتا ہے یہی تو بھی یوں ہی راہ عدم لے

ہاتھوں کی کلائی پہ تری رحم ہے مجھ کو
چن چن کے گل اس باغ سے دامن میں تو کم لے

کعبے سے نکالا جو ہمیں اب کے تو ہم بھی
بت خانے میں جا بیٹھیں گے کوئی[3] تازہ الم لے

چاہا ہو اگر تیرے سوا ہم نے کسی کو
تو جیسی کہ چاہے تو میاں ہم سے قسم لے

کس طرح میں دیکھوں کہ مرے سروِ رواں کی
پابوسی کرے رنگِ حنا، زلف، قدم لے

اے ناخنِ غم! کیا ہے تجھے اتنی شتابی
مرہم کا یہ پھاہا تو مرے داغ پہ جم لے

---

۱ - نرگس - مونث -

۲ - قلم، اب بالاتفاق مذکر ہے، بیش تر مؤنث بھی کہتے تھے -
مصرع 'ظفر': تو دل کچھ اور کہتا ہے قلم کچھ اور کہتی ہے -
(نور اللغات، جلد ۳، صفحہ ۶۵۷)

۳ - بروزنِ فع -

اوروں نے متاعِ[1] طرب و عیش اٹھائے
ہم غم‌زدہ دنیا سے گئے درد و الم لے
کیا مصحفیِ خستہ کے دل پر تو مٹا ہے
زلفوں کی کمندوں میں کوئی صیدِ حرم لے

۶۹۱

دکھا کر منہ کو چھپ جایا نہ کیجے
ہمیں اس وضع ترسایا نہ کیجے
مجھے کیا بلکہ مشّاطہ کو، اپنے
حنائی ہاتھ دکھلایا نہ کیجے
جو آیا کیجیے بندے کے آگے
تو میری جان شرمایا نہ کیجے
تمھیں کہتا ہوں، اے دامن درازو
مری آتش کو بھڑکایا نہ کیجے
پکارے گو کوئی، یوں گھر سے باہر
کھلے بالوں نکل آیا نہ کیجے
تمھاری زلف بل کھاوے تو کھاوے
ولیکن آپ بل کھایا نہ کیجے
خطا پاؤ گے اک دن مصحفی تم
بہت اس کوچے میں جایا نہ کیجے

۱- متاع: تذکیر و تانیث مختلف فیہ، ترجیح تانیث کو ہے۔
نسیم دہلوی:
کی گہر ریزی ہمارے آبلوں نے ٹوٹ کر
تھا متاعِ عمر جو وقفِ بیاباں ہو گیا
(نور اللغات، جلد ۴، صفحہ ۲۸۱)

۶۹۲

کیا کروں میں جو گلستاں میں بہار آئی ہے
یاں تو آنکھوں میں مری جانِ نزار آئی ہے
مر گیا ہوں تو مری روح بھی تجھ کو قاتل
تیرے دروازے پہ جا جا کے پکار آئی ہے
اک ذرا رہ کہ مری آنکھوں میں جوں قطرۂ اشک
جاں ترے قدموں پہ ہونے کو نثار آئی ہے
تیغ کو سان پہ رکھا ہے مرے قاتل نے
آج شاید اجلِ تازہ شکار آئی ہے
ہے بہت رنگِ حنا آج جو تغییر مگر
بازی ہاتھوں سے ترے رات وہ ہار آئی ہے
مصحفی ضد سے وہ ٹھکرا کے چلا ہے اس[1] کو
راہ میں اس کی اگر میری مزار[2] آئی ہے

۶۹۳

محبت میں صادق یہ اغیار ٹھہرے
ہم اک بات کہہ کر گنہگار ٹھہرے

۱- شاید : پ
۲- نور اللغات اور فرہنگ آصفیہ کے مؤلفین کے نزدیک 'مزار' مذکر ہے ۔ لیکن مؤلف فرہنگ آصفیہ نے مزید لکھا ہے :
''اب سے سو برس پہلے میر تقی نے مزار کو مؤنث باندھا تھا ۔ اب مذکر بولتے ہیں'' :
کیا ظلم ہے اس خوبیِ عالم کی گلی میں
جب ہم گئے دو چار نئی دیکھیں مزاریں (میر تقی)
(فرہنگ آصفیہ ، جلد ۴ ، صفحہ ۳۶۳)

نہ ٹھہرا مرے دل میں پیکاں تو تیرا
غنیمت ہے یہ بھی جو سوفار ٹھہرے
میں بیچا دل اپنا تمھارے ہی ہاتھوں
کہ اس جنس کے تم خریدار ٹھہرے
گلی سے تری کوئی بچ کر نہ آیا
چٹیلے گئے وہ جو دو چار ٹھہرے
دل آنسو سے ہے سیل کی[1] رہگزر میں
عجب ہے گر[2] اس گھر کی دیوار ٹھہرے
ستم یہ بڑا ہے کہ یہ بے وفا بھی
ستم کر کے ہم پر ، وفادار ٹھہرے
ہوئے کامیاب اس سے بے درد یارب
ہم ان حسرتوں کے سزاوار ٹھہرے
برسنے کا ساون کے خطرہ نہیں کچھ
جھڑی تیری اے چشم خوں بار ٹھہرے
صفِ جنگ سے ٹل گئے سب ، فلک کے
جو میداں میں ٹھہرے تو ٹک یار ٹھہرے
گلی سے تری ہم تو اٹھ کر چلے تھے
ہوا ضعف مانع سو ناچار ٹھہرے
ٹھہر جائے یہ جانِ بر لب رسیدہ
جو وعدے پہ اپنے وہ عیّار ٹھہرے
تو اک وار میں ہانپ جاتا ہے پیارے
ترے ہاتھ میں کیوں کہ تلوار ٹھہرے

---

۱ - اس : پ
۲ - کہ : پ

سدا ہم سے بے ہوشیاں ہی ہوئیں یاں
ہم اے مصحفی کیوں کہ ہشیار ٹھہرے

٦٩٤

برقِ رخسارِ یار پھر چمکی
اس چمن کی بہار پھر چمکی
تو نے پھر اس کو سان پر رکھا
تیرے خنجر کی دھار پھر چمکی
میرے گریے سے آب و تاب آیا
صورتِ روزگار پھر چمکی
خونِ عاشق سے وہ زہِ دامن
دمِ شمشیر وار پھر چمکی
دیکھیو پاؤں رکھ دیا کس نے
آج کیوں نوکِ خار پھر چمکی
وہ جو اک ٹیس سی ہے دل میں مرے
رہ کے بے اختیار پھر چمکی
مصحفی کی جو تو نے دُر ریزی
شاعری تیری یار پھر چمکی

٦٩۵

کبھی جو ہجر میں ہم بے قرار ہوتے تھے
تو جا کے اس کی گلی کے نثار ہوتے تھے
لگا رہا تھا نشانے پہ کل وہ تیر اُدھر
اِدھر وہ میرے کلیجے کے پار ہوتے تھے
گئے وہ دن کہ بہ تحریک نالۂ بلبل
ہم اُس چمن میں مہیائے کار ہوتے تھے

خوشی کے مارے میں گل کھا کے رہ میں جا بیٹھا
کہ کل وہ سیرِ چمن کو سوار ہوتے تھے

میں دیکھتا تھا کھڑا اک طرف ، جو راہ میں رات
تمھارے غیر کے قول و قرار ہوتے تھے

عرق کی بوندیں نہ گرتی تھیں اس کے مکھڑے سے
ستارے بدر کے اوپر نثار ہوتے تھے

نہ پوچھو ہم سے میاں مصحفی کہاں تھے تم
خراب پھرتے تھے گلیوں میں خوار ہوتے تھے

٦٩٦

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے
کون سے شہر میں ہوتا ہے؟ کدھر ہوتا ہے؟

اس کے کوچے میں ہے نت صورتِ بیداد نئی
قتل ہر خستہ بہ اندازِ دگر ہوتا ہے

نہیں معلوم کہ ماتم ہے فلک پر کس کا
روز کیوں چاک گریبانِ سحر ہوتا ہے

ووہیں اپنی بھی ہے باریک تر از مو گردن
تیغ کے ساتھ یہاں[2] ذکرِ کمر ہوتا ہے

کر کے میں یاد دل اپنے کو بہت روتا ہوں
جب کسی شخص کا دنیا سے سفر ہوتا ہے

۱- گل کھانا : معشوق کے چھلے وغیرہ کو آگ میں تپا کر بدن پر عشق جتانے کو داغ دیتے، اور اس کو گل کھانا کہتے ہیں۔ (نور اللغات ، جلد ۴ ، صفحہ ٦٦)

۲- جہاں : پ

اس کی مژگاں کا کوئی نام نہ لو ، کیا حاصل
میرا ان باتوں سے سوراخ جگر ہوتا ہے
مصحفی ہم تو ترے ملنے کو آئے کئی بار
اے دوانے تو کسی وقت بھی گھر ہوتا ہے؟

۶۹۷

کبھو پلکیں جی میں ڈبا گئے ، کبھی انکھڑیوں کو لڑا گئے
غرض اس طرح ہی وہ خوب‌رو مجھے چاہ اپنی جتا[۱] گئے
سحر[۲] آکے مجھ کو وے ناز سے چڑھی بھوں جو اپنی دکھا گئے
کہوں کیا کہ غصّے کی شکل سے مرے دل کو کیسے وہ بھا گئے
ہے قدم قدم پہ نشانِ خوں ، سرِ خار سارے ہیں لالہ گوں
کوئی مجھ سے پوچھے تو یوں کہوں ، کئی یاں سے آبلہ پا گئے
سرِ راہ باتیں وہ کرتے تھے ، کسو ساتھ آنکھیں ملا ملا
میں اچان چک[۳] جوں ہی آ گیا ، مجھے دیکھ آنکھیں چرا گئے
رہے نقشِ پا کی طرح سے ہم چمنِ جہاں میں ہزار حیف
جو مثالِ باد وزیدہ[۴] تھے وے برنگِ موجِ ہوا گئے
کھلے بندوں در پہ وہ بیٹھے تھے جوں ہی سامنے سے میں آ گیا
نہ بن آیا کچھ تو دوپٹے میں ووں ہی گات اپنی چھپا گئے

۱- دکھا : پ
۲- صبح : پ
۳ - اچانک چک : (ہ) اچانک - اگلی زبان ہے - اب اچانک بولتے ہیں - (نوراللغات جلد اول صفحہ ۲۷۷)
۴- باد وزیدہ (ف) چلی ہوئی ہوا -

نہ چلے جنازے کے ساتھ وے مرے دو قدم بھی تو ناز سے
یوں ہی کہنے سننے سے خاق کے[1] ، ذرا ہاتھ آ کے لگا گئے
ٹک اسی بہانے سے دیکھیں ہم بھلا اس میں کیا ہے بھلا برا
اگر آ کے کوٹھے پہ دھوپ میں کبھو سر کے بال سکھا گئے
گئے چھوڑ وادیِ عشق میں مجھے ہمرہاں سبھی **مصحفی**
میں اکیلا روتا ہی رہ گیا کہ نہ ساتھ اپنے بلا گئے

٦٩٨

غرض ان بے وفاؤں سے وفاداری تو مشکل ہے
نہ کیجے آپ بھی گر اپنی غمخواری تو مشکل ہے
بہ تنگ آئے ہیں ہم تھوڑی سی رنجش میں معاذ اللہ
گر آئے درمیاں میں ان[1] کی بے زاری تو مشکل ہے
تپِ غم کا علاج اے دل جو کچھ ہو تجھ سے کرنا وہ
وگرنہ ہو گئی مزمن[4] یہ بیماری تو مشکل ہے
ہجوم جلوۂ خوباں کے ہم پامال ہیں ، ہم سے
اب ایسے وقت میں دل کی خبرداری تو مشکل ہے

۱- کو : پ ، ل ۱-۲
۲- تمھیں : پ
۳- اور : پ
۴- مزمن (ع) : صفت مذکر ، مونث کے لیے مزمنہ ، پرانا ، کہنہ جیسے تپِ مزمن ۔
(نور اللغات ، جلد ۴ ، صفحہ ۴۳٦)
مصحفی نے مزمن ، یعنی پرانی بیماری کا صحیح استعمال کیا ہے ۔
(فائق)

مرمت قصرِ تن کی کر کہ ہے ناموسِ جاں اس میں
جو ناگہہ ڈھے گئی یہ چار دیواری تو مشکل ہے
بہت ناصح نے ضبطِ گریہ و زاری کو فرمایا
کروں کیا آہ ، ضبطِ گریہ و زاری تو مشکل ہے
مداوا دیدۂ خوں‌بار کا اپنے بھی کچھ کیجے
اگر یوں ہی رہے ناسور سے جاری تو مشکل ہے
لگا بیٹھے ہو تم جی جان تک دادِ[1] محبت میں
یہ بازی بھی جو تم نے مصحفی ہاری تو مشکل ہے

٦٩٩

تیرے سوا کسو کی تمنا نہ چاہیے
تو چاہیے گر ہمیں تو میاں کیا نہ چاہیے
خوگر نہیں ہوے ہو تماشے کے تم ابھی
ہر لحظہ تم کو آئنہ دیکھا نہ چاہیے
مجلس میں اپنی میری نگاہوں کو دیکھ کر
کہتا ہے اس کے سامنے بیٹھا نہ چاہیے
ہر گوشہ دیکھتے ہو کہ نرگس ہے دیدہ باز
بندِ قبا کو باغ میں کھولا نہ چاہیے
دل بن رہا ہے غم سے ترے جیسے آبلہ
کیا فائدہ ہے بس اسے چھیڑا نہ چاہیے
اسبابِ زندگی جو میسر ہو تو دلا
سب چاہیے ہے زیست[2] کو کیا کیا نہ چاہیے

۱- داؤ - ؟
۲- عیش : پ

ساعد کی نازکی پہ یہ تیری ہے مجھ کو رحم
ہاتھوں میں تیرے پھولوں کا دستانہ چاہیے
غافل نہ آسماں کے تلے خواب گاہ کر
زیرِ پلِ شکستہ تو سویا نہ چاہیے
کہتی ہے شرمِ عشق یہی نت مجھے کہ یار
گلیوں میں داڑھیں[1] مار کے رویا نہ چاہیے
آنے میں تو بہار کے کہتے ہیں دیر ہے
ہم کو بھی غش سے ہوش میں آیا نہ چاہیے
جس تازہ گل میں ہووے نہ تیرے بدن کی بو
انصاف تو یہ ہے اسے سونگھا نہ چاہیے
پیچھے پڑے ہو تم جو بلا کی طرح، تمھیں
اتنا خیالِ عاشقِ رسوا نہ چاہیے
غصے میں منہ تھتھائے وہ بیٹھا ہے **مصحفی**
اب اس سے ایسے وقت میں بولا نہ چاہیے

۷۰۰

وحشت اگر یہی ہے تو صحرا کو جائیں گے
صحرا کے وحشیوں سے دل اپنا لگائیں گے
صورت سے تو ہماری خفا ہے، تو لے چلے
پھر آکے تجھ کو اپنی نہ صورت دکھائیں گے
ان خوش قدوں کے ہاتھ سے جاؤں کہاں نکل
یہ چال ہے تو مجھ پہ قیامت یہ لائیں گے

۱- دیوانِ اول مصحفی میں ہر جگہ اس لفظ کا یہی املا ہے۔ غالباً قدیم املا یہی ہو۔ موجودہ املا 'دھاڑیں' ہے۔ (فائق)

مانگی ہزار بار دعا پر نہ کچھ ہوا
ناچار اب دعا ہی سے ہم ہاتھ اٹھائیں گے

محرابِ تیغِ یار ہوئی جلوہ گر تو ہم
سجدے میں سب سے آگے سر اپنا جھکائیں گے

آنکھیں برنگِ آئنہ اس دم تو خشک ہیں
گر تر ہوئیں تو ان سے ہی دریا بہائیں گے

ق

کل ایک نے کہا کہ میاں مصحفی یہ بات
کہتے تھے اب کے اس کی جو مجلس میں آئیں گے

پھونکیں گے اس کے کان میں کچھ اور ہی فسوں
اور اس بہانے زلف کا بوسہ اڑائیں گے

کہنے لگا وہ شوخ کہ کچھ ان دنوں کے بیچ
وے بے ادب ہوئے ہیں بہت مار کھائیں گے

۷۰۱

چمن کے بیچ ہے اب تو بہارِ عبّاسی
نگہ سے کیجیے بوس و کنارِ عبّاسی

اگا ہے خاک سے شاید بہ طالعِ عاشق
کہ رنگِ زر سے ہے مانا عذارِ عبّاسی

سپید و سرخ نظر آتے ہیں گل اس کے مجھے
ہیں پھول سیم و طلا کے نثارِ عبّاسی

گلابی رنگ کی اس کے میں کیا کروں تعریف
ہے میری آنکھوں میں اب تک خمارِ عبّاسی

چمن ہے تختۂ نقاش کی سراسر شکل
ولے ہوا ہوں میں اس میں دوچارِ عبّاسی

بنا ہے ان سے زبس تختۂ چمن گل دام
ہوا ہے مرغِ دل اپنا شکارِ عبّاسی
گنے وہ کیوں کہ بھلا داغ میرے سینے کے
نہ کی ہو باغ میں جس نے شمارِ عبّاسی
بہار لالۂ خونیں کی خوش نہیں آتی
ہوا ہے جب سے مرا دل فگارِ عبّاسی
فقط نہ اُس نے کیا شیخ مصحفی کا خوں
ہے سیّدوں کی بھی قاتل بہارِ عبّاسی

۷۰۲

دردمندِ دوست بے آہ و فغاں کیوں کر رہے
عشق ہے یہ تو چھپائے سے نہاں کیوں کر رہے
جوشِ گل سے ساکنانِ باغ پر ہے عرصہ تنگ
دیکھیے بلبل کا اُس میں آشیاں کیوں کر رہے
یوں بھی ہوتی ہے اسے تو ہائے بے چینی زیاد
ایک ہی کروٹ یہ جسمِ ناتواں کیوں کر رہے
کیا بلا درپیش آئی ان کو ایسی ، کیا ہوا
پیچھے اس منزل میں میرے ہمرہاں کیوں کر رہے
وصل کی شب ہے ، نہیں تدبیر بن آتی کچھ آہ
کیا کروں گردش سے اس شب آسماں کیوں کر رہے
اک نگہ میں صبر و طاقت کا ہوا خانہ خراب
دل مرے کہنے میں اب اے دوستاں! کیوں کر رہے
میں تو زنداں میں پھنسا اے جانِ عاشق ! یہ کہو
بارے تم کرنے سے سیرِ گلستاں کیوں کر رہے

جب کترنی[1] سی چلے اس کی زباں ہر بات میں
منھ میں مجھ کم بخت کے یارو زباں کیوں کر رہے
خلق نے میری طرف سے اُس کو کچھ[2] کا کچھ کہا
پاس میرے رات کو وہ بدگماں کیوں کر رہے
عشق کا گھوڑا نپٹ منھ زور ہے اے **مصحفی**
ہاتھ میں میرے بھلا اس کی عناں کیوں کر رہے

۷۰۳

مگر کہ جذب کی طاقت گئی گریباں سے
کہ اشک گزرے ہیں مانندِ چاک داماں سے
زمینِ جادہ جو ہے رشکِ کہکشاں یا رب
گیا ہے گریہ کناں کونَ اس بیاباں سے
ادائے شکر کروں کیا میں تیرے تیروں کا
کہ چاکِ دل کو مرے سی دیا ہے پیکاں سے
نظر تو کیجیو، کن شوخیوں سے رنگِ کفک
کرے ہے جلوہ گری اس کے طرفِ داماں سے
خبر تو لیجو کوئی خستہ مر گیا تو نہ ہو
کہ آج آتی ہے آوازِ نوحہ زنداں سے
یہ کیا سلوک کیا تو نے مجھ سے دستِ جنوں
کہ سی دیا مرا دامن مرے گریباں سے
سراغِ قافلۂ اشک کیجیے کیوں کر
گیا ہے دور نکل وہ دیارِ حرماں سے

---

۱ - کترنی : (ہ) قینچی -
۲ - کچھ کچھ ہی کہا : پ

زبس میں آنکھوں پہ دھر دھر کے ہاتھ روتا ہوں
ہیں آستینوں کے حلقے ہنوز طوفاں سے
نمک کو چھڑکے ہے وہ زخم پر مرے کم کم
مزہ ہو جب کہ نمک گر پڑے نمک‌داں سے
ذرا تو دیکھیو اس طفلِ نازنیں کی بہار
بغل میں پھول لیے آئے ہے گلستاں سے
ہوا نہ گریے سے کم سوزِ سینہ میرا لیک[1]
یہ آگ اور بھی بھڑکی ہوائے باراں سے
بغیر قیس کے یاں تک یہ دشت سونا ہے
کہ وحشت آتی ہے اک سایۂ مغیلاں سے
یہ کس کے شوق میں اے مصحفی! تو روتا[2] رہے
لہو چوے ہے جو یوں تیری چشمِ گریاں سے

۷۰۴

گڑے ہیں کشتۂ الفت جہاں زمیں کے تلے
بنے ہیں خوں سے وہاں گلستاں زمیں کے تلے
ذرا تو گورِ غریباں میں رکھ سمجھ کے قدم
کہ ہر قدم پہ ہے یاں آستاں زمیں کے تلے
اس آسماں سے دل اپنا بہ تنگ آیا ہے
بناویں گے کوئی اور آسماں زمیں کے تلے
زمیں کے پردے نہ ہوں کس طرح سے چادرِ نور
ہوے ہیں چاند کے ٹکڑے نہاں زمیں کے تلے

---

۱ - ہوا نہ گریہ سے کم سوز سینہ بلکہ مرا : ل ۱ - ۲
۲ - رویا : ل ۱

گیا میں لے کے جو داغِ فراقِ سیم[1] براں
جلا کریں گے مرے استخواں زمیں کے تلے
مسافرانِ عدم کی خبر نہ پوچھو کچھ
کہ گم ہوئے ہیں بہت کارواں زمیں کے تلے
جو دیکھا کھول کے میں مصحفی کی تربت کو
گڑے ہوئے تھے کئی استخواں زمیں کے تلے

۷۰۵

اگر بتوں کی تمنا سے دل مرا پھر جائے
تو ووں ہی شعر و سخن کا مرے مزا پھر جائے
قبول ہوتی ہے زاری، نہ ہے دعا میں اثر
میں ہوں وہ بندہ کہ جس بندے سے خدا پھر جائے
جو دیکھتا ہے مرا حال زار کہتا ہے
خدا کرے کہ کہیں اس سے دل ترا[2] پھر جائے
بھلا رکھے کوئی بیگانے سے توقع کیا
جب آشنا ہی سے بے ہیچ آشنا پھر جائے
عجب نہیں جو تری خو کے ڈر سے اے ظالم!
زباں پر آ کے مری، حرفِ مدعا پھر جائے
بغیرِ خشت نہ ہو ہم کو تاجِ زر روزی
ہمارے سر پہ اگر سایۂ ہما پھر جائے
کیا ہے بند خدا نے درِ اجابت کو
کہ تا پٹک کے سر اپنا مری دعا پھر جائے

---

۱ - سیم تناں : ل ۲
۲ - مرا : پ

اگر میں رونے پہ آؤں بہ رنگِ ابرِ بہار
ابھی زمانے کی اے دوستو! ہوا پھر جائے

پڑا ہے اس طرح اس زلفِ تابدار میں پیچ
کہ جس طرح کوئی نٹ کھاتے ہی کلا[1] پھر جائے

ہمارے دل کو مشبک[2] ہی پھر تو دیکھے خلق
گو اس طرف[3] تری مژگاں کا رخ ذرا پھر جائے

بکو ہو شیخ جی تم آج کتنا بے ہودہ
مجھے یہ ڈر ہے کہیں سر نہ آپ کا پھر جائے

تری ہی راہ میں بنواویں گے مزار اپنی
ہماری خاک پہ شاید قدم ترا پھر جائے

خدا خدا بھی کہا میں تو کچھ نہیں ہوتا
ہزار حیف کہ بندے سے یوں خدا پھر جائے

پکارتا ہے تجھے **مصحفی** جواب تو دے
کھڑا رہے یہ ترے آستاں پہ، یا پھر جائے

۷۰۶

قفس میں مرغِ گرفتار کیوں پھڑکتا ہے
خبر تو لو کوئی، کیا اس کا دل دھڑکتا ہے

---

۱ - کلا: (س) مؤنث - نٹ کی وہ حرکت جس میں سر نیچا کرکے ٹانگیں اوپر کر لیتا ہے - کلا بازی کھانا، اب اردو میں قلا بازی کھانا - (دیکھیے نوراللغات، ج ۳، صفحہ ۷۹۲)

۲ - مشبک: (ع) جالی دار - وہ چیز جس میں بہت سے سوراخ ہوں (نوراللغات، ج۴، ص۳۸۴)

۳ - طرح: پ

نہ گل کی[1] آگ یہ دامن جھٹک[2] صبا ورنہ
اس آگ سے ابھی شعلہ کوئی بھڑکتا ہے

کہو نا ابر کو دل کھول کر ذرا برسے
یہ میری خاک پہ پانی سا کیا چھڑکتا ہے

کدھر چلا ہے، کھڑا رہ ذرا تماشا دیکھ
ابھی تو خاک پہ بسمل ترا پھڑکتا ہے

میں اس کی نظروں میں اتنا ہوا ہوں خوار و ذلیل
کہ بات بات پہ[3] میرے تئیں جھڑکتا ہے

ملوں میں مصحفی اس خانہ جنگ سے کیوں کر
کہ اس کے ملنے سے اپنا تو جی دھڑکتا ہے

۷۰۷

واں کب سے ذقن اس نے زلفوں میں چھپا لی ہے
جی دیتے ہیں ہم ناحق، یہ چاہ نرالی ہے

پھولوں کی چھڑی جس کے ہاتھوں سے نہ اٹھتی تھی
اب نام خدا اس نے تلوار سنبھالی ہے

مجلس میں کوئی اس کی کیا جاوے کہ اب واں تو
ہر حرف میں جھڑکی ہے، ہر بات میں گالی ہے

---

۱ - میری : پ

۲ - چھٹکنا (ھ) لازم نمبر ۱ بکھرنا، پراگندہ ہونا، پھیلنا، منتشر ہونا۔ (نور اللغات، ج ۳، صفحہ ۵۵۹) - جھٹکنا (ھ) نمبر ۱ جھاڑنا، کپڑے وغیرہ کو زور سے جنبش دینا (ناسخ) :

ہمارے ہاتھ سے دامن جھٹک کر تو گیا جس دم
گریباں آرہا بس ایک ہی جھٹکے میں دامن پر

(نوراللغات، ج ۲، صفحہ ۳۶۳)

۳ - میں : ل۱-۲

۷۵۸

وہ حسن و صفا اے بت! تجھ میں ہے کہ صانع نے
تصویر تری گویا اب سانچے میں ڈھالی ہے

تیغِ خمِ ابرو کا دیتا ہے نشاں سب کو
سینے میں مرے یارو جو زخم ہلالی ہے

ہر گام پر اک ٹھوکر لگتی ہے مرے دل کو
اِن روزوں نئی اس نے کچھ چال نکالی ہے

کب پیک کا رنگ ایسا ہوتا ہے خبر تو لے
دامن پہ ترے ظالم لوہو کی سی لالی ہے

کس طرح کوئی جھانکے دیوارِ فلک میں تو
رخنہ ہے نہ روزن ہے ، غرفہ ہے ، نہ جالی ہے

نت لختِ جگر کا ہے از بس کہ ہجوم ان پر
ہر مدِ نگہ میری پھولوں کی سی ڈالی ہے

کیا جانے گیا ہوں میں آغوش میں کس گل کی
آغوش مری مجھ سے اس رات کو خالی ہے

کرتا ہوں رقم کس کی وصفِ کمرِ نازک
اے مصحفی! جو میرا ہر شعر خیالی ہے

۷۵۹

زلف اگر دل کو پھنسا رکھتی ہے
آنکھ پردوں میں چھپا رکھتی ہے

ساتھ فہمیدگی گر ہووے تو پھر
بت پرستی بھی مزا رکھتی ہے

چھچھا[1] رنگ مرے خوں کا سا
تیرے پاؤں کی حنا رکھتی ہے

آرسی ہوتی ہے سنمکھ تیرے
کچھ بھی آنکھوں میں حیا رکھتی ہے

کر دیا اس نے تو مجھ کو مدہوش
کس کی بو بادِ صبا رکھتی ہے

خاکِ دہلی کی ذرا سیر تو کر
کہ عجب آب و ہوا رکھتی ہے

ہائے تیکھی نگہ اس کافر کی
کیا کہوں میں جو ادا رکھتی ہے

تیری تصویر کو لے کر شیریں
اپنی چھاتی سے لگا رکھتی ہے

بارے اس باغ میں کیا دیکھا ہے
نرگس آنکھوں کو جو وا رکھتی ہے

جب تلک آوے ہے تو پھر کے، یہ چال
خاک میں مجھ کو ملا رکھتی ہے

آرسی سے نہ کرو کج نظری
اس کا تم سے وہ گلا رکھتی ہے

آہ میری ہے اثر سے ہم دوش
طالعِ زلفِ رسا رکھتی ہے

---

۱ - چھچھا : (ہ) صفت - نہایت شوخ اور سرخ رنگ -
(نوراللغات ج ۲ ، صفحہ ۵۶۱)

۵۸۰

کیا ہے تقصیر، جو مجھ کو[1] تجھ سے
گردشِ چرخ جدا رکھتی ہے
جھک پڑے ہے، تری پابوسی کو
زلف بھی شوق بلا رکھتی ہے

ق

گوشت اور پوست بھی گل جاتا ہے
جسم کے بیچ یہ کیا رکھتی ہے
مصحفی نام ہے جس چیز کا چاہ
آدمی کو تو کھپا رکھتی ہے

۷۰۹

فندق کہیں بندھی ہے، کہیں ہے حنا لگی
بے طرح ہاتھ یار کے طرزِ جفا لگی
نازک ہے میرا شیشۂ دل اس قدر کہ بس[2]
مثلِ حباب پھوٹ گیا گر ہوا لگی
جوں سایہ لگ چلا میں تو وہ مجھ کو دیکھ کر
بولا یہ میرے پیچھے کہاں کی بلا لگی
کیوں نیچی نظریں کرلیں، میاں یہ تو تُو بتا
آئینہ دیکھتے ہی تجھے کیا حیا لگی
پھرتا ہے تو تو گلیوں کے اندر خراب و خوار
اے مصحفی! یہ کس کی تجھے بد دعا لگی

---

۱ - ہم کو : پ، ل ۱-۲
۲ - وہ : پ، ل ۱-۲

رباعیات

۱

جو اشک ان آنکھوں سے جدا ہوتا ہے
مژگاں تلک آیا کہ فنا ہوتا ہے
نظروں سے گرے نہ کوئی[۱] کسی کی یارب
نظروں سے گرا بہت برا ہوتا ہے

۲

درد و غمِ یار جی[۲] کا جی ہی میں رہا
اس گل سے یہ خار جی کا جی ہی میں رہا
روے تو بہت سے ہم ولیکن افسوس
نکلا نہ غبار جی کا جی ہی میں رہا

۳

جو اچھے ہیں رکھتے ہیں سبھی منھ پہ نقاب
آنکھوں میں ہر اک بشر کی ہوتا ہے حجاب
اے خانہ خراب! لیکن انصاف تو کر
اتنا بھی کوئی کسی کو کرتا ہے خراب

---

۱ ۔ بروزن فع

۲ ۔ اصل متن میں ''یار کا جی'' ''یار جی کا'' تصحیح قیاسی ہے ۔ (فائق)

۴

کر کر کے اس در پہ آہ و نالے کتنے
مر مر گئے ہم سے مرنے والے کتنے
اچھی طرح اس نے منھ دکھایا کس کو
ترسا ترسا کے مار ڈالے کتنے

۵

دل شغل میں نالے کے تو کیوں رہتا ہے
اور اشک ہو آنکھوں سے تو کیوں بہتا ہے
اپنا تو جی آیا ترے ہاتھوں سے بہ تنگ
اے خانہ خراب ! کہہ لے کیا کہتا ہے

٦

اے کاش نہ ہم ایسی محبت کرتے
اور کرتے تو کچھ تو صبر و طاقت کرتے
گر ہے یہی بے کلی تو اک دن یا رب
مر جاویں گے عصمت[1] عصمت کرتے

۷

ہے جی میں مقیم کنج عزلت ہوویں
اور رو رو کے داغ اپنے دل کے دھوویں
کیا فائدہ نت کی ہرزہ گردی سے بھلا
دنیا تو گئی ہے دین کو پھر کیوں کھوویں

---

۱ - عصمت : مصحفی کی محبوبہ ؟ (فائق)

۸

ہے حیف تو یہ کہ باجمال چوں حور
"عصمت" اور ہووے مائل فسق و فجور
یہ وہ ہے مثل کہ **مصحفی** کہتے ہیں
بر عکس نہند نامِ زنگی کافور

۹

ٹوٹا ہے پڑا ایک طرف پیمانہ
لوٹے ہے کوئی ایک طرف مستانہ
نہ ذکر ہے یاں نماز نہ روزے کا
مسجد نہ ہوئی ، ہوا یہ قہوہ خانہ

۱۰

تپ سے ہوئی بندگانِ عالی کو شفا
ہے دل میں سرور یاں ہر اک کے پیدا
ہاں وقت ہے خو‌ّرمی کا اور عہدِ طرب
بھر بادۂ ناب سے تو ساقی مینا

۱۱

وہ شوخ ابھی تو مجھ سے رم کرتا ہے
جوں چاہیے اختلاط کم کرتا ہے
اتنا تو ستم نہیں نہ ملنا اس کا
غیروں سے ملے ہے یہ ستم کرتا ہے

۱۲

جس دم وہ بقصدِ دل ربائی آوے
کچھ کام نہ زہد و پارسائی آوے

گو دین سے اپنے ایک عالم پھر جاے
وہ بت نہ پھرے اگر خدائی آوے

۱۳

اے دل! تو رہے گا کبھو شرابی کب تک
جوں غنچہ بغل بیچ گلابی کب تک
اب ہو ہے بناے عمر کوئی دم میں خراب
اے خانہ خراب! یہ خرابی کب تک

۱۴

مارے تپِ غم کے میں گلا جاتا ہوں
اس داغِ جگر سے سب جلا جاتا ہوں
موقوف بہ خس نہیں ہے جلنا میرا
جوں شمع کھڑا ہوں اور جلا جاتا ہوں

۱۵

افسوس کہ دل کی بے قراری نہ گئی
فریاد و فغان و آہ و زاری نہ گئی
وہ کون سا روز ہے کہ تجھ بن جوں شمع
روتے ہوے مجھ کو رات ساری نہ گئی

۱۶

ہر چند کہ وہ ہو کے خفا جاتا ہے
آس بِن کوئی عاشق سے رہا جاتا ہے
دل بستگی ہے دل کو ز بس اس سے کہاں
وہ جھڑکے ہے، یہ ساتھ لگا جاتا ہے

۱۷

کیا درک کرے مدرکۂ انسانی
جوں آئنہ لازم ہو جسے حیرانی
سب دیکھا بہ چشمِ دل پہ با ایں ہمہ دید
سوجھا نہ وہ وائے غفلت و نادانی

۱۸

اے عشق کہیں آگ لگا دے مجھ کو
میں ہیزمِ خشک ہوں جلا دے مجھ کو
لے جل کے میں خاک ہی ہوا آپھی آپ
اب دیر نہ کر اس میں اڑا دے مجھ کو

۱۹

اس سال کہ پھر عیدِ سعید آئی ہے
تیرے لیے پیغامِ خوشی لائی ہے
کر 'میر نعیم خاں' تو عیش و عشرت
جب تک کہ ترا جلوسِ امرائی ہے

۲۰

میں دردِ[۱] دل اپنا جوں ہی اظہار کیا
پھر نام دوا کا نہ طبیبوں نے لیا
عیسیٰ کی بھی کر چکا میں کتنی منت
اس نے بھی مجھے جوابِ شافی نہ دیا

۱- میں نے جو مرض اپنا یہ اظہار کیا : سرور

۲۱

وہ سیرِ نظارۂ در و بام کہاں
وہ وعدۂ صبح ، وہ گرمیِ شام کہاں
وہ زیرِ لب خندہ و دشنام کہاں
دل کس سے لگائیے ، وہ دل آرام کہاں

۲۲

دنیا پر و پوچ محض مفہوم ہوئی
خاطر یہاں آکے سخت مغموم ہوئی
بندے سے نہ کیجے اب خدا کا شکوہ
بس آپ کی کائنات معلوم ہوئی

۲۳

جو دم ہے سو دید اس جہاں کا کیجے
اندیشہ نہ کچھ سود و زیاں کا کیجے
کچھ واں بھی کیا تھا فکر یاں آنے کا
پس یاں بھی نہ کچھ فکر وہاں کا کیجے

۲۴

گو آٹھ پہر سامنے نظروں کے رہو
یوں کوئی کسی حسین کو تک تو سکو
کیا آنکھ میں اس کی رہے ہے آنکھ گڑو
اس آرسی کا تو دھویا دیدہ دیکھو

۲۵

نے شکوۂ دورِ آسانی کیجے
نے ذکرِ شہانِ پاستانی کیجے

اے **مصحفی** ! اب تو اس زمانے کے بیچ
جس طرح سے ہووے زندگانی کیجے

۲۶

نوروز عجب سالِ سعید آیا ہے
نوروز نہیں یہ روزِ عید آیا ہے
بادام سے کر شگوں تو اول یعنی
با دام کے رنگ پہ پدید آیا ہے

۲۷

ہے برجِ حمل آئنہ دارِ نوروز
خورشید شرف میں ہے دو چارِ نوروز
لے آئنہ تو بھی ہاتھ میں تاکہ تجھے
آنکھوں سے نظر آئے بہارِ نوروز

۲۸

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے
ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت
اے وائےِ کیا کیا یہ خدایا تو نے

۲۹

یارب تری بزم رشکِ گلزار رہے
اور بختِ جواں سدا ترا یار رہے
ہے **مصحفیِ** غریب کی نت یہ دعا
جب تک کہ جہاں رہے جہاندار رہے

۳۰

اس طرح سے رو کہ دل کو تسکیں ہووے
گو دامن و آستیں نہ تزئیں ہووے
اے دیدہ! لہو کی تہ نہ آنسو میں ملا
ہیرے کا عیب ہے جو رنگیں ہووے

مسدس

۱

اے کہ ہم بزمیِ اغیار خوش آئی ہے تجھے
کیا کسی نے کوئی ترکیب دکھائی ہے تجھے
صلح غیروں سے، مرے ساتھ لڑائی ہے تجھے
وضع کس شوخِ طرح دار کی بھائی ہے تجھے
ان دنوں تجھ کو مشوّش میں بہت پاتا ہوں
بکھرے بالوں کو ترے دیکھ کے گھبراتا ہوں

۲

کیا کسی سے تجھے ناورد[۱] ہے، کیوں خیر تو ہے
پھول سا چہرہ ترا زرد ہے، کیوں خیر تو ہے
اور دمِ گرم ترا سرد ہے، کیوں خیر تو ہے
سچ تو بتلا تجھے کیا درد ہے، کیوں خیر تو ہے
اشک آنکھوں سے تری ہیں یہ رواں کس کے لیے
اپنا منہ دیکھ تو روتا ہے میاں کس کے لیے

---

۱ - یعنی جنگ و جدل ـ

۳

بعضے کہتے ہیں کہ آسیبِ پری ہے تجھ کو
بعضے کہتے ہیں پریشاں نظری ہے تجھ کو
بعضے کہتے ہیں کہ دردِ جگری ہے تجھ کو
بعضے کہتے ہیں ز خود بے خبری ہے تجھ کو
تہمتِ چند میاں تجھ کو لگا چاہتے ہیں
تیری آنکھیں، تری پلکوں کا برا چاہتے ہیں

۴

اشک آنکھوں سے تری نت جگری نکلے ہے
ساتھ اُس اشک کے پھر خون زری نکلے ہے
گھر سے تو بال کھلے جیسے پری نکلے ہے
وضع سے اک تری شوریدہ سری نکلے ہے
میں نہ مانوں گا ہوا ہے تو کسی پر عاشق
آرسی ہاتھ میں لے، ہے نا اسی پر عاشق؟

۵

رنگ چہرے کا ترے زرد ہے اے غیرتِ ماہ!
مجھ کو بتلا تو ترا کون ہے ایسا دل خواہ
کر گئی دل میں اثر تیرے یہ کس بُت کی چاہ
حسرت آگیں نظر آتی ہے مجھے تیری نگاہ
کوفت دل کی ترے چہرے سے عیاں ہوتی ہے
چاہ بھی چیز ہے ایسی کہ نہاں ہوتی ہے؟

۶

پر تعجب ہے یہ مجھ کو کہ بہ ایں کاہشِ غم
نہیں رتبے سے گرا حسن کا تیرے عالم

اک کھلے بالوں سے تو نکلے ہے وضعِ ماتم
ورنہ آنسو ترے عارض پہ ہیں گل پر شبنم
جس سے دونی نظر آتی ہے نزاکت کی بہار
گل نے پائی ہے کہاں ایسی لطافت کی بہار

۷

پھول گل کھاتے ہیں اب تک تری رعنائی پر
آنکھیں تاروں کی پڑیں ہیں تری زیبائی پر
وہی عالم ہے ترے حسن کی سرسائی[1] پر
تو نے باندھی ہے کمر کس لیے رسوائی پر
نام چاہت کا جو ہر دم تو لیا کرتا ہے
اور دن رات یہی ذکر کیا کرتا ہے

۸

وہی چشمک ہے وہی جھانولی[2] ویسی ہی نگاہ
وہی منہ پھیر کے چلنا وہی ہر بات پہ واہ
وہی انداز قدم کا وہی رنگینیِ راہ
وہی دامن کی درازی ، وہی ٹھوکر کا نباہ
دیکھ سب زیر و زبر جس کو ہوے جاتے ہیں
مردے بھی اٹھتے ہیں اور زندے موے جاتے ہیں

۱- سرسائی : (ہ - مونث) ۱- نمی ، تری ۲- نفاست ، برتری...
(جامع اللغات ، جلد ۳ ، صفحہ ۳۵۵)
۲- جھانولی : مؤنث - معشوق کی ناز بھری گردشِ چشم -
(نوراللغات ، جلد ۲ ، صفحہ ۳۶۰)

۹

آستینوں کی تری مُہریاں ویسی ہی تنگ
وہی چولی کی مسک اور وہی پنڈے کا رنگ
وہی تن شیشہ سا نازک وہی دل سختی میں سنگ
وہی مکھڑے کی صفا جیسے کہ تصویرِ فرنگ
اس پہ بھی قدر کو اپنی تو نہ جانے تو نہ جان
عاشقی خوب نہیں تجھ کو کہا میری جان

۱۰

گو تو ظاہر میں زباں پر نہیں لاتا یہ راز
پر کہے دیتے ہیں سب مجھ کو ترے یہ انداز
کون اس کام میں ایسا ہوا تیرا انباز[1]
جس کے اغوا سے تو شاہد سے ہوا شاہد باز
آنکھ تیری بھی لگی حسن و نمک پر پڑنے
تو بھی لچوں[2] سے لگا تیغ پکڑ کر لڑنے

۱۱

خانہ جنگی کی اگر وضع خوش آئی تجھ کو
روے خوش پر نہیں زیبندہ لڑائی تجھ کو
ورنہ دوکھے گی ، کھڑی ہو کے خدائی تجھکو
کوئی دینے کا نہیں اس میں بھلائی تجھ کو
شہر کے لوگ برا تجھ کو کہیں گے سارے
ماں کہنے کو مرے ، بہرِ خدا باز آ رے

---

۱ - انداز : پ - دم ساز : ل ۲
۲ - لنجوں : پ ، ل ۱-۲

۱۲

حق میں تیرے نہیں یہ خیرہ سری ہرگز خوب
کیوں کہ ہے جان مری تو ابھی آپھی محبوب
عشق بازی کا یہ ہرگز نہیں ہوتا اسلوب
نیک و بد جانتے ہیں اس کے تئیں سب محبوب
کون کہتا ہے نظر باندھنی کیجے موقوف
اک ذرا تیغ و سپر باندھنی کیجے موقوف

۱۳

اور بھی لوگ ہیں دنیا میں میاں حسن پرست
حوصلہ تم نے کہاں سے یہ نکالا یک دست
ہاتھ میں تیغ لیے پھرتے ہو جیسے بد مست
مجھ کو یہ ڈر ہے کہیں آپ پہ آوے نہ شکست
کیوں کہ دلّی ہے، یہاں سیکڑوں خوں ہوتے ہیں
خانہ جنگوں کے علم جلد نگوں ہوتے ہیں

۱۴

عاشقی شیوۂ خوبانِ خوش اندام نہیں
عاشقی سے کوئی معشوق تو بد نام نہیں
تو دلآرام ہے کیا اور دلآرام نہیں
مصحفی کے تئیں پر اس سے بھی کچھ کام نہیں
یہ سخن محض بھلائی کو تری کہتا ہے
اور جو اس میں بھی برا مانے تو چپ رہتا ہے

مخمس

۱

پروانے اور شمع میں چاہت نہیں رہی
بلبل سے گل کی گرمیِ صحبت نہیں رہی
مجنوں کے ساتھ لیلیٰ کی سنگت نہیں رہی
دنیا میں دل کو دل سے محبت نہیں رہی
ہرگز کہیں دو شخص میں الفت نہیں رہی

۲

سینے سے بہہ گیا ہے یہ دل آب ہو کے سب
دیکھوں تو میں جگر میں بھی باقی رہی ہے کب
جثہ[۱] تھا جب تلک میں اٹھاتا تھا یہ تعب
اے دیدہ ! زار زار نہ رو اس قدر کہ اب
مجھ کو بھی گریہ کرنے کی طاقت نہیں رہی

۳

بعد از ہزار سعی کہ ہمت دلیل ہو
بالفرض ملنے کی بھی گر اس سے سبیل ہو
جاؤں نہ میں فرشتہ مرا گر کفیل ہو
مجلس میں اس کی جا کے کوئی کیا ذلیل ہو
ہرگز موافق اپنے وہ صحبت نہیں رہی

۴

صفحے سے دل کے حرفِ طمع کو اٹھائیے
اہلِ دول سے ملنے کو ہرگز نہ جائیے

---

۱ ۔ اصل متن میں ''جسہ'' غلط ''جثہ صحیح ۔ (ع) مذکر ۔ بدن ، جسم (نوراللغات ، ج ۲ ، صفحہ ۲۱۱) (فائق)

بہتر تو یوں ہے حالِ بد اپنا چھپائیے
کیا جا کے اب کسی کے تئیں منھ دکھائیے
وقتے کہ وہ زمانے کی صورت نہیں رہی

۵

مشہور ہے جہاں میں تو زور آور اس قدر
ہاتھوں سے تیرے سیکڑوں ظالم گئے ہیں مر
کیا فائدہ جو ہووے مری جان کا ضرر
اے غم! فشارِ دل میں نہ اتنی بھی سعی کر
جانے بھی دے کچھ اس میں تو حالت نہیں رہی

۶

لائی قضا شکنجِ اسیری میں جب ہمیں
مشقِ تپش میں اُن نے رکھا روز و شب ہمیں
گو ذبح ہوویں وہ حس و حرکت ہے کب ہمیں
پھڑکے ہیں زیرِ دام ہم اتنے کہ اب ہمیں
خنجر تلے تڑپنے کی حسرت نہیں رہی

۷

اُس شرمگیں کی بزم میں گر اب کے آئیے
اپنی بھی شرم کو نہ تو اس کو دکھائیے
دیکھے بھی وہ تو آپ نہ سر کو اُٹھائیے
کیا فائدہ ہے اُس سے گر آنکھیں ملائیے
آنکھوں میں اُس کی کچھ بھی مروت نہیں رہی

۸

واں گر کے ریزہ ریزہ ہو پھوٹی ہے آرسی
ہیبت نے اُس کی سنگ سے کوٹی ہے آرسی

خادم کا ہاتھ کانپا ہے ُچھوٹی ہے آرسی
آتے ہی اُس کے سامنے ٹوٹی ہے آرسی
ہر گز نظر سے اُس کی سلامت نہیں رہی

۹

ظاہر کی دوستی ہی رہی گو ہمارے ساتھ
اور نت ہم اُس کے ساتھ پھریں وہ ہمارے ساتھ
پر یہ نہیں کہ گرمِ وفا ہو ہمارے ساتھ
اتنا رمیدہ خو ہے کہ اُس کو ہمارے ساتھ
الفت تو اک طرف کہ خصومت نہیں رہی

۱۰

بازی نہ کھائیو کہیں ان سے تو رو سیاہ
آتے ہیں پیش بے ادبانہ یہ کج کلاہ
ہر چند ہوویں چہرے میں مانندِ مہر و ماہ
اے **مصحفی**! نہ کیجے سوئے کودکاں نگاہ
اس کام میں بزرگوں کی حرمت نہیں رہی

مخمس بر غزلِ آصفی

۱

جب سے ہوا ہے مجھ سے وہ پیماں شکن جدا
آتش میں تن جلے ہے جدا اور من جدا
ہووے کسی طرح سے یہ رنج و محن جدا
صورت گراں ہلاکم ازاں سیم تن جدا
سازید صورتے کہ نہ باشد ز من جدا

ہرگز غمِ معاش سے رکھتا نہیں میں درد
فکرِ معاد نے نہ کیا رنگِ چہرہ زرد
جورِ بتاں سے بھی نہیں بھرتا میں آہِ سرد
دارم ز لالہزارِ جہاں داغہا کہ کرد
یعقوب را ز یوسفِ گل پیرہن جدا

۲

ہے بس کہ میری جان مجھے تجھ سے اتحاد
تیرے سوا کسی کی نہیں دل میں میرے یاد
جب تک کہ میں ہوں اور ہے تُو، ہے یہی مراد
دور از رُخت مباد مرا دیدہ بلکہ باد
مردم ز دیدہ ، دیدہ ز[1] سر ، سر ز تن جدا

۳

جس وقت تیرے چہرے پہ کرتا ہوں میں نظر
ہوتا ہے اشتباہ مجھے دل میں بیش تر
بہرِ خدا تو میرے تئیں اس سے دے خبر
خال است زیرِ چشم سیاہت ز مشک تر
یا نافہ شد ز نافِ غزالِ ختن جدا

۴

کی زندگی میں تجھ سے وفا میں نے گل بدن
ایسی کہ گل سے کر نہ سکی بلبلِ چمن
مرنے کے بعد بھی جو مرا خاک ہوگا تن
پیوند بگسلد ز سگت استخوانِ من
روزے کہ بند بند شود از کفن جدا

---

۱ - 'ز' کی جگہ 'زاں سر' - پ

۵

ہردم تراست بر ہمہ یاران ترحمے
گاہے بہ خویش و گہہ بہ عزیزاں ترحمے
گاہے بہ **مصحفیِ** غزل خواں ترحمے
داری بحالِ زار غریباں ترحمے
جز آصفی کہ ہر تو شد از وطن جدا

(مثنوی) در بیانِ ھجو پسر حجام

ز بس آئینہ رو ہے طفلِ حجام
نہیں بن دیکھے اُس کے جی[1] کو آرام
وہ گرچہ عاشقوں کا ہے کلیجا
پہ سر سہلانے کے کھاتا ہے بھیجا
اُسے ہر اک نے بالا دست پایا
تبھی تو اُس کے آگے سر نوایا
نہیں آئینہ ہی با چشم نم ناک
ہے شانے کا بھی دل اُس ہاتھ سے چاک
جو دیکھے انگلیاں وہ گوری گوری
بنے خورشید پانی کی کٹوری
ہے اُس کے ہاتھ سے ہر ایک مفتوں
بہ رنگِ شیشۂ حجام ، دل خوں
نہرنی لے کے جب وہ پاس آوے
مہِ نو بدر ناخن سے بنواوے
حجامت اُس سے بنواوے جو شائق
کرے یک بارگی ترک علائق

۱- دل - ر ، ل ۲

نہیں محتاج کسبت کا وہ لڑکا
ہے اُس کے پاس سب ساماں مہیا

بہ شکلِ استرا ہیں تیغِ ابرو
نہیں کچھ فرق اس میں یک سرِ مو

بہ چشم و دیدۂ باریک بیناں
کٹوری چشم ہے اور شانہ مژگاں

حقِ عاشق میں بہرِ قطعِ اعراض
کرے ہے انگلیوں سے کارِ مقراض

کفِ دست اُس کا تسمہ سنگ ہے دل
نہ کہیے کیوں کر اُس کو تیغِ قاتل

مپرس از سرمۂ دنبالہ دارش
کہ ناخن گیر شد ہنگامِ کارش

وہ جس کے رو برو ناگاہ آیا
اُسے حیرت نے آئینہ دکھایا

اگر آوے بہ قصدِ موے چینی
کرے بینی تلک باریک بینی

نہ کھینچے خامۂ مو اُس کی تمثال
کہ ہے وہ عاشقوں کی ناک کا بال

ہے اُس کے ہاتھ میں روزی کی مفتاح
خطِ خوباں کو دیتا ہے وہ اصلاح

نہیں ملتا وہ ہرگز صبح تا شام
کرے ہے گرم جوشی روز حمام

کرے جب خوش وہ کر کے مشت مالی
نہ ہو عاشق کا کیوں کر کیسہ خالی

وہ ہے دنداں شکن باللہ[1] مشہور
نہیں چوں دیگراں محتاجِ زنبور

کچھ اس میں غیر جلادی نہیں ہے
کہ اُس کا کام فصّادی نہیں ہے

ملا جب آئنے کو ایسا نائی
بنائی چار ابرو کی صفائی

سنے ہے مصحفی اب تو بھی فی الحال
منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال

(مثنوی) در بیان ھجوِ چارپائی

یہ جو ہم پاس چارپائی ہے
گور ہے یا کنواں یا کھائی ہے

پٹی پائے تمام ناہموار
اور بانوں کی جھول جیسے کہ غار

کج و واکج ہے بس کہ وہ یکسر
نقشِ گردوں کو رشک ہے اُس پر

کیوں نہ دل داغِ غم سے ہووے بتنگ
کہ درندے ہوے ہیں مثلِ پلنگ

ڈھانچ ہے بس کہ اُس کا اول جلول
کہیں مل بیٹھتی نہیں ہے چول

پائے ہیں کہنگی سے زرد و سیاہ
سیرووں کا بھی حال پھر ہے تباہ

۱- آپھی - پ

بس کہ ہے ڈھلملی و پوچ و لچر
چول کو روز چاہیے پچّڑ

اُس کی کستا ہوں جس دم ادوائن
اک ذرا اُس گھڑی تو جائے ہے تن

لیک جس وقت اُس پہ پاؤں دھرا
جیسے کوئی کنویں میں آن گرا

بافت[1] کی اُس کی کیا کروں تعریف
تھا وہ بافندہ[2] بس کہ ذاتِ شریف

چھید رکھے ہزار، بانوں میں
گرہیں ہیں بے شمار بانوں میں

گر گدیلے کا اُس پہ ہو بستر
تو بھی چبھتی ہیں پھانس[3] جوں نشتر

آ کے جب رات اُس پہ سوتا ہوں
کر کے ضامن کو یاد روتا ہوں

یہ وہی ناتواں پلنگڑی ہے
جس کو کہتے ہیں لولی لنگڑی ہے

نہ چھپر کھٹ سے اُس کی نسل ملے
نہ کھٹولے کی قسم کوئی کہے

بس کہ ہے تنگ گیر اُس کا ناؤں
اُس پہ بیٹھے پڑے ہیں کاٹھ[4] میں پاؤں

۱- بافت: بُنائی۔
۲- بافندہ: بننے والا۔
۳- پھانسیں (؟)
۴- کاٹ: ل۔ کاٹھ: (ہ۔مذکر) ۱- لکڑی ۲- وہ کندہ جس کو چھید کر مجرموں کے پاؤں میں ڈال دیتے ہیں۔ (نوراللغات، جلد ۳، صفحہ ٦٨٢)

نیچے اونچے جو اُس کے ہیں پائے
ہیں معطل زمیں پہ پروائے[۱]

بس کہ دل اُس سے خوش نہیں ہوتا
مارے غصے کے میں نہیں سوتا

جب کہیں آدھی رات جاتی ہے
اونگھ کے مارے نیند آتی ہے

کیوں کہ اُس پر کوئی دوگانا ہو
گر رہے مجھ سا جو یگانا ہو

طول میں میرے قد سے بھی کم تر
عرض میں میرے تن سے بھی لاغر

ایسی جب تنگ چارپائی ہو
پس مسافر کی کیا سمائی ہو

اب بھی جانے تو گھر کو خالی کر
مصحفی اس سے بوریا بہتر

(مثنوی) در صفتِ اجوائن

کیا کروں وصف تیرے اجوائن
تو ہے آرامِ جان و راحتِ تن

باؤ گولے کا تو نے سر توڑا
ریخ نے تیرے ہاتھوں، گھر چھوڑا

۶- پروایا : (اصل میں 'پر پایہ' ہے) مذکر - چارپائی کے پاؤں کے نیچے رکھنے کا لکڑی کا ٹکڑا - پروائے جمع -
(نوراللغات، جلد ۱، صفحہ ۸۵)

اشتہا تجھ سے صاف ہوتی ہے
موت سر کو پکڑ کے روتی ہے

بھوک لگتی ہے تجھ سے صبح و شام
تب تو ہے نان‌خواہ تیرا نام

سوءِ ہضمی کو دیوے ہے تو شفا
امتلا[1] تجھ سے ہے اسیرِ بلا

تجھ سے فوراً ڈکار آتی ہے
گلِ جاں پر بہار آتی ہے

تیسرے درجے ہے تری تیزی
سونٹھ حدت کو تیری کب پہنچی

گاہ کھولے تو سدہ امعا[2] کا
گہ کرے بلغمِ لزج[3] کو فنا

بلغمی صفرا جس کو ہوتا ہے
تیرا اک دانہ اُس کو کھوتا ہے

ہاتھ پاؤں میں جس کے ہو گٹھیا
ہے ترا تیل اُس کا عقدہ کشا

۱۔ امتلا : معدے کا غذا سے بھرا ہونا ۔
(نوراللغات ، جلد ۱ ، صفحہ ۳۰۴)
ب امعا : جمع معا ، آنتیں ۔
(عربی لغات فیروزی ، طبع ۱۹۱۸ع ، صفحہ ۳۰)
۳۔ لزج : چیپ دار شے ۔
(عربی لغات فیروزی ، صفحہ ۲۰۷)

تیری گرمی میں کچھ نہیں ہے قصور
تجھ سے سردی کا دردِ سر ہو دور
بس کہ تو آس کے نفخ[۱] کی ہے دوا
دردِ اورام[۲] تجھ سے پاوے شفا
وقت حاجت ترے عرق کا قطور[۳]
کرتا ہے دردِ گوشِ ربھی دور
ہڑ کے پانی نے کی بہت تیزی
پر نہ پہنچا وہ گرد کو تیری
نت تو لذت ہر اک نمک کی چکھے
عرقِ گھکوار[۴] میں بھی تو ہی رہے
کوئی تجھ سے نہ پاوے بچلونا
باندھ لاوے کوئی ترا دونا

۱۔ نفخ : اپھار ، پیٹ کا پھولنا ۔
(نوراللغات ، جلد ۴ ، صفحہ ٦٨۴)

۲۔ اورام : (ع) ، جمع ورم ۔
(فرہنگ عمید ، صفحہ ۲۰٦)

۳۔ قطور : بالفتح ، آں چہ در بینی و گوش و جز آں چکانند ۔
(شمس اللغات ، جلد ۲ ، صفحہ ۱۳۳)
وہ پتلی دوا جو کان اور کان (ناک) میں ٹپکائیں ۔ بہ ضم اول غلط ہے ۔ (لغات کشوری ، صفحہ ۳٦۷ ، طبع ۱۹۵۱ع)

۴۔ اصل متن میں 'گھی کوار' ۔ گھی کوار یا گھکوار (ھ ۔ مذکر) ایک قسم کا پودا ۔
(نوراللغات ، جلد ۴ ، صفحہ ۱۳۰)

تو نہ چورن میں ہو اگر داخل
پھر وہ چورن بنے تو کیا حاصل
وے جو اجرا کو کوٹ چھانتے ہیں
جزو اعظم تجھی کو جانتے ہیں
قدر فلفل کی تیرے آگے نہیں
حق نے دی ہے وہ تیزی تیرے تئیں
تیرے دو دانے جو کوئی کھاوے
ووں ہی عمرِ دوبارہ وہ پاوے
درد دکھ میں جو ہووے تو درکار
جھاڑ اور پھونک کر تجھے اک بار
بعضے پانی کے ساتھ کھاتے ہیں
بعضے سوکھی ہی پھانک جاتے ہیں
الغرض خشک و تر ہے تو نافع
ہیضۂ محتبس[1] کی بھی دافع
تجھ کو کب پہنچے زنگی ہڑ[2] پھوندی
پیپلا مور[3] ہے تری لونڈی

۱- بند ہیضہ -

۲- زنگی ہڑ : سیاہ ہڑ ، جسے چھوٹی ہڑ بھی کہتے ہیں -

۳- اصل متن میں پیپلا مور ہے - مؤلف فرہنگ آصفیہ لکھتے ہیں :
پیپلا موڑ - ہ - اسم مؤنث (صحیح پیپلا مول) پیپل دوا کی جڑ -
بیخ دار فلفل -

(فرہنگ آصفیہ ، جلد ۱ ، صفحہ ۵۶۴)

بس کہ گرمی ہے تیری برسرکار
ترپھلے[1] کا بھی سرد ہے بازار
گر تری منفعت کو پائے کوئی
نہ مربے کو ہڑ کے کھائے کوئی
جہاں تیرے عرق کی قیمت ہے
عرق بادیاں[2] فضیحت ہے
بس کہ تو ہے محللِ بلغم
تجھ سے گھٹتا ہے نت دلِ بلغم
منفعت تجھ میں ہیں نہفتہ ہزار
ریگِ صحرا ہے جن کا ہو نہ شمار
نخلِ صحت کو تن میں بوتے ہیں
تیرے دو دانے دکھ کو کھوتے ہیں
تو غریبوں کے کام آتی ہے
رخِ صحت انہیں دکھاتی ہے
کوئی کھا جائے گر دو لقمہ زیاد
اس کو کردے ہے معدے میں تواماد[3]

۱- ترپھلا : ہڑ ، بہیڑہ ، آنولہ -
(فرہنگ آصفیہ ، جلد ۱ ، صفحہ ٦٠١)

۲- بادیان : ف - اسم مؤنث - سونف -
(فرہنگ آصفیہ ، جلد ۱ ، صفحہ ۳۴۷)

۳- آمد : ع - (بہ فتح ہمزہ و میم) غایت و نہایت و آخر چیزے -
(فرہنگ عمید ، صفحہ ۱۸۳)

شمس اللغات ، جلد ۱ ، صفحہ ۱۰۴ میں ہے : بہ فتحتین غایت و نہایت عمر ، و بہ معنی خشم گرفتن - و بالمد وکسر و میم بسیار خیر یا بسیار شر ، وکشتیِ پُر ، و شہریست نزدیک یمن -

تیرے دانے کو مرغ اگر کھاوے
سنگ‌دانہ ہو آب بہہ جاوے
قسم تیری جو ہے خراسانی
اور ہے اُس میں بھی تن آسانی
چوٹ کو اُس سے سینک جو دیوے
پوٹلی اُس کی درد چن لیوے
گر سٹھوری[1] میں ہو نہ دخل ترا
نہ زچہ کو ہو اُس سے نفع ذرا
اور جو کہتے ہیں تو نہ ہو مخلوط
عقل ہووے نہ فربہ و مضبوط
بس کہ تو ہے عزیز دیں داراں
از برائے شفائے بیماراں
وے جو قرآں کریں ہیں اکثر ختم
رمضاں میں کریں ہیں تجھ پر ختم
بعد ازاں ہاتھوں ہاتھ پیر و جواں
تجھ کو لے جاتے ہیں تبرک جاں
چاٹے کوئی تری جو پتی ذرا
باغ کے باغ پھر تو کر دے ہوا[2]

۱- سٹھورا : (ہ) مذکر- پنجیری جو زچہ کو کھلاتے ہیں - اس میں سونٹھ ہوتی ہے ، اس وجہ سے یہ نام ہوا -
(نوراللغات ، جلد ۳ ، صفحہ ۲۱۲)

۲- اصل متن میں 'ہوا' ہے - 'ہرا' سے معنی واضح ہو جاتے ہیں -
(فائق)